MAUR-104,(N)

Prem Chand (Tafseeli Mutala)

MAUR-104,(N) پریم چند تفصیلی مطالعہ

MAUR-104,(N)

فہرست

بلاک:1 پریم چند سوانح، شخصیت اور عہد

اکائی:1 پریم چند کا عہد: سماجی و سیاسی بیداری کا آغاز

اکائی:2 پریم چند: سوانح، شخصیت اور حالات زندگی

اکائی:3 پریم چند کے عہد کی قومی اور اصلاحی تحریکیں

اکائی:4 پریم چند پر مختلف تحریکوں کے اثرات

بلاک:2 پریم چند کی ناول نگاری

اکائی:5 پریم چند بحیثیت ناول نگار

اکائی:6 نرملا کا تنقیدی مطالعہ

اکائی:7 گئودان کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

بلاک:3 پریم چند کی افسانہ نگاری

اکائی:8 پریم چند بحیثیت افسانہ نگار اور ان کی افسانہ نگاری کے مختلف ادوار

اکائی:9 اردو افسانے پر پریم چند کے اثرات

اکائی:10 افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی''، ''عیدگاہ'' اور ''کفن'' کا تنقیدی مطالعہ

اکائی:11 پریم چند کی زبان و اسلوب

بلاک:4 غیر افسانوی تحریریں

اکائی:12 پریم چند کی ڈرامہ نگاری

اکائی:13 پریم چند کی صحافت نگاری

اکائی:14 پریم چند کے مضامین

اکائی:15 پریم چند کے خطوط اور داریے

اکائی:16 دیگر افسانہ نگاروں پر پریم چند کے اثرات

اکائی:01 پریم چند کا عہد: سماجی وسیاسی بیداری کا آغاز

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 پریم چند کا عہد اور ماحول

1.4 پریم چند کے عہد کا سماجی پس منظر

1.5 پریم چند کے عہد کا سیاسی پس منظر

1.6 آپ نے کیا سیکھا

1.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1.8 سوالات کے جوابات

1.9 فرہنگ

1.10 کتب برائے مطالعہ

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- پریم چند کے عہد و ماحول سے واقف ہوں گے۔
- پریم چند کے عہد میں ہونے والی سماجی تبدیلی سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔
- پریم چند کے عہد میں ہونے والی سیاسی بیداری کا جائزہ لے سکیں گے۔
- پریم چند کے عہد میں ہونے والی سماجی تبدیلیوں کا سبب کیا تھا، کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔
- پریم چند کا اپنے عہد کی تبدیلیوں سے کیا سروکار رہا اس کے بارے میں آگاہی حاصل ہوگی۔
- پریم چند کے عہد کا مجموعی طور پر جائزہ لے سکیں گے۔

1.2 تمہید

دنیا کا ہر ادیب و فنکار اپنے عہد و ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کے حالات و واقعات سے اپنی تخلیقات کا تانا بانا تیار کرتا ہے۔ اسی لیے کسی ادیب یا فنکار کی شخصیت اور اس کے فن پارے کا جائزہ لینے کے لیے اس کے عہد کے تاریخی پس منظر کا جاننا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر پریم چند جو بیک وقت عظیم فنکار ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار بھی تھے ان کی عظمت و شہرت کے پیچھے کارفرما عوامل و محرکات کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے عہد اور ماحول کے سماجی و سیاسی پس منظر کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ جس میں ان کے فکری ارتقاء کی منزلوں کا اندازہ بھی ہوگا۔

پریم چند نے اپنی کہانیوں کا مواد براہِ رات اپنے عہد کی زندگی سے ہی لیا ہے۔ ان کے فن کے ہر گوشے پر زندگی کے حقائق کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی و سیاسی زندگی کا قافلہ جس سمت گامزن تھا اور جن منزلوں پر وہ ٹھہرا اس کے ثبوت ہمیں پریم چند کی تخلیقات میں واضح نظر آتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان معاشرت اور فکر و شعور کے اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اس اکائی میں ہم پریم چند کے عہد میں ہونے والی سماجی اور سیاسی بیداری کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

1.3 پریم چند کا عہد اور ماحول

پریم چند نے جس عہد میں قلم اٹھایا اس وقت ہندوستان میں برطانوی حکومت کے تقریباً پچاس سال مکمل ہو چکے تھے۔ سارا ہندوستان اس کی غلامی میں تھا ملکی نظم و ضبط کے ہر شعبہ پر اس کی آہنی گرفت مستحکم ہوگئی تھی۔ اس عرصے میں سب سے زیادہ توجہ حکومت نے جس پر صرف کیا وہ فوج کی نئی تشکیل و توسیع تھی۔ انگریزی حکومت کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں انگلستان کے سامراجی مفاد کا زیادہ سے زیادہ تحفظ قائم ہو۔ غدر کے واقعات نے انگریزوں کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستانی فوجیوں کو وفادار اور قابل اعتماد سمجھنا ہندوستان میں اپنے وجود کے لیے مستقل خطرہ مول لینا ہے اس لیے فوج میں انگریزوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا یہاں تک کہ ان کی مجموعی تعداد ہندوستانی غلاموں کی فوج کی ایک تہائی کے قریب تھی۔ اس کے سبب برطانوی اقتدار نے ہندوستان کے پورے دیہی معاشی نظام کو درہم برہم کر دیا۔ کسان اپنی زندگی کے مفلوک الحال صورتِ حال سے ہی مطمئن تھے لیکن برطانوی اقتدار نے اس نظام کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ صدیوں پرانی دیہی معیشت تباہ ہوگئی مال گزاری وصول کرنے والے عہدے دار زمیندار اور سامراجی حکومت کے وفادار تعلق دار بن گئے کم از کم عملی طور پر وہ زمین کے مالک تھے انہیں زمین کی پیداوری یا کاشت کاری سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ نذرانہ یا رشوت لے کر موروثی کاشتکاروں کو زمین سے بے دخل کر دینا ان کا روز کا معمول تھا۔ بیوپاریوں اور ساہوکاروں کا طبقہ کاشت کاروں کو لوٹنے کھسوٹنے اور ان کی پرسکون سماجی اور معاشی زندگی کو تباہ کرنے کا ایک اور باعث ہوا۔ وہ غریب کسانوں کو ایسی شرح پر سود دیتا کہ وہ ساری زندگی کی کوشش کے بعد بھی اسے ادا نہ کر پائے۔ ساہوکار ہر سال ان کی فصلیں قرق کر لیتا یہاں تک ایک دن ان کی زمین پر قبضہ کر کے انہیں کاشتکار سے مزدور بنا دیتا تھا۔ چوں کہ انگریزی حکومت کا ایک اہم مقصد ہندوستان کو اپنی مصنوعات کی منڈی بنانا اور اس طرح اس نسبت سے ان کھیت مزدوروں میں بھی اضافہ ہوا جن کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں تھی۔ کسانوں کو ہمدردی اور حصولِ انصاف کے لیے بھی کثیر رقم خرچ کرنا پڑتی۔ جن علاقوں میں رعیت داری طریقہ رائج تھا وہاں بھی کاشتکاروں کی لوٹ کھسوت اور ان کی معاش و ابتری دوسرے علاقوں سے کم نہیں تھی۔ ہندوستانی

کاشتکاروں کی زندگی کا معیار دن بہ دن پستی کی طرف جا رہا تھا۔ فصلیں خراب ہونے لگیں اور اکثر ہر دو چار سال بعد ہولناک قحط کا سایہ بھی منڈراتا رہا۔ زمینیں کم تھیں اور اس پر انسانوں کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

جیسا کہ ذکر آیا ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان کو اپنی مصنوعات کی منڈی بنانا چاہتے تھے اور اس طرح وہ اپنے ملک کی تجارت اور صنعت کو ترقی دینا چاہتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو کسی بھی صورت میں پنپنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ دیسی صنعتوں کی تباہی سے گزر اوقات کرنے والی آبادی کا ایک بڑا حصہ بیکار ہو گیا تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جب قومی تحریکیں آگے بڑھیں ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا تو سامراجی حکومت کی استحصال پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی لیکن اس کے باوجود ان کے مظالم میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی حالت بدتر ہوتی گئی۔ اس زمانے میں ان کے ساتھ جو وحشیانہ اور جابرانہ سلوک کیا گیا وہ بہت ہی دردناک تھا۔

ایک طرف جاگیردارانہ لوٹ اور سامراجی استحصال ہندوستانی عوام کو فاقہ زدہ بنا رہے تھے۔ دوسری طرف ان کے اپنے سماجی حالات فرسودہ رسم و رواج اور مذہبی عقائد کی گرفت نے ان کی معاشی خوشحالی کے راستے مسدود کر رکھے تھے۔ توہم پرستی اور مذہبی رسوم کے بہانے جاہل اور کمزور طبقوں کا معاشی استحصال اور یہ استحصال صرف ہندوستانی عوام پر ہی نہیں تھا بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔

ہزاروں سال سے ہندو سماج میں اونچی ذات کے لوگ نچلے طبقوں پر حکومت کرتے آئے ہیں۔ معاشرتی و معاشی اعتبار سے ان کی زندگی غلاموں سے بھی بدتر رہی ہے۔ وہ ان سماجی و سیاسی حقوق اور سہولتوں سے محروم تھے جو سماج کی دوسری ذاتوں کو حاصل تھیں۔ مثلاً مقدس مذہبی کتابوں کو نچلے طبقوں کو چھونے کی اجازت نہیں تھی۔

ہندوستانی عوام بالخصوص دیہاتوں میں رہنے والے کاشتکار اسی مذہب پرستی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کا توکل اور ظلم و جبر کو خاموشی سے سہنے کی عادت ان کی موہوم مذہب پرستی کا اثر تھا کہ وہ اپنی اس بدحالی پر بھی شکوہ نہ کرتے تھے۔ ان غریبوں سے ہمدردی، دیہاتوں کی بے کسی و بے بسی کا احساس، ان کی زبوں حالی کو بہتر بنانے کی خواہش اور آزادی کی دنیا میں سانس لینے کی تمنا وغیرہ ایسے حقائق ہیں جنھوں نے پریم چند کو واقعیت پسند اور حقیقت نگار بنا دیا۔ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا سیکھا اور تلخیوں کی لذت کا احساس اپنے اندر پیدا کیا اور اپنی کہانیوں میں انہیں مسائل پوری قوت کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیا۔

1.4 پریم چند کے عہد کا سماجی پس منظر

پریم چند کے سماجی مطالعات میں ان کے دور کے سماجی پس منظر سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستانی معاشرہ گاؤں کی اکائیوں پر مشتمل تھا۔ پورے ملک میں لاکھوں گاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ جن کی معاشیات کھیتی/ زراعت کے پیشے پر منحصر تھی۔ ان گاؤں میں انسانی ضرورت کی تمام چیزیں پیدا کی جاتیں اور ان کے باہمی تبادلے پر معاشی نظام قائم تھا۔ دوسرا نظام ان کی گاؤں پنچایت تھی، جو گاؤں کے معاملات میں خودمختار ہوتی۔ وہی عدالت حفاظت اور لگان کی وصولی کا ذریعہ بھی تھی۔ راجا یا حکمراں طبقہ گاؤں سے صرف ہر سال غلے کی ایک مقررہ مقدار اس کو پنچایت کے ذریعہ حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ زمینوں پر ملکیت کا دعویٰ کسی بھی حکمراں

نے نہیں کیا۔

اسی طرح صنعت وحرفت میں دست کاری کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ چیزوں کی پیداوار اور استعمال میں گاؤں نہ صرف آزاد تھے بلکہ شہروں کو بھی اپنی چیزیں بھیجتے تھے۔ یہ نظامِ معاشرت ہندو راجاؤں کے دور میں تھا، جسے معمولی تبدیلیوں اور اصلاحوں کے بعد مسلم حکمرانوں نے بھی قبول کرلیا۔ انتظامی معاملات میں مسلم بادشاہوں نے ہندوستانی زندگی سے مختلف یا کوئی الگ تحریک یا مہم نہیں شروع کی۔ پہلی بار ایک نئی تنظیم کا آغاز انگریزی حکومت نے کیا۔ اس کے معاشی وسیاسی وجوہات تھے۔ کیوں کہ انگریزوں نے یہاں تاجر کی حیثیت سے قدم رکھا تھا۔ صنعتی انقلاب نے انھیں ایسی معاشی ضرورت سے روشناس کر دیا تھا کہ انھیں یا تو اپنی تجارت کے لیے نئے بازار تلاش کرنے تھے یا اپنے ہی ملک میں معاشی بدحالی کا شکار ہوکر زندہ درگور ہو جانا تھا۔ اسی طرح کے بازار کی تلاش میں انھوں نے ہندوستان کو اپنی آماج گاہ بنایا۔ جہاں حالات کی ستم ظریفی نے ہندوستانیوں کے آپسی اختلافات میں حکومت وسیاست بھی سپرد کر دی۔ چنانچہ انھوں نے پوری تنظیم میں اپنے تجارتی مفاد کو پیش پیش رکھا۔ اور برطانیہ کے ہی اصولوں پر زمین کا بندوبست کیا۔

ہندوستان کو زراعتی ملک بنائے رکھنے کی بنا پر انگریزوں کو اپنے قدم مضبوتی سے جمانے کے مواقع زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوئے۔ زراعتی مال کی خریداری میں ہمت افزائی نے ملک کی بڑی تعداد کو دیہاتوں میں ہی محدود رکھا لیکن معاشی بدحالی کی بنا پر زندگی ناگوار ہوگئی۔ ہندوستانی عوام غربت اور مفلوک الحالی کا شکار ہوگئی۔ تعلیم کی روشنی سے بے بہرہ عوام میں ضعیف الاعتقادی نے فروغ پایا جس کے سبب رسم ورواج مذہبی اصول کے سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔ قسمت پسندوں نے اس معاشی بدحالی کے دور میں قناعت اور راضی بہ رضا رہنے کو خدا کی مرضی سمجھ بیٹھے۔ حاکموں کی بڑائی کو مذہبی کتابوں کے جواز سے روشناس کیا۔ ہندوسان کی سماجی زندگی میں عورت کو ہمیشہ سے ہی حقارت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس نئے نظام نے بھی عورت کے لیے کسی طرح کی سہولیات پیدا نہیں کی۔ انگریزون نے ہندوستان کی پوری عملی زندگی کو اپنے تجارت کی میزان پر تولا۔ اصلاحی کوششوں میں بھی یہی رویہ رکھا۔ لیکن کچھ نئے خیالات کی روشنی اور کچھ حالات کی تبدیلی نے ہندوستانیوں کو اصلاح کی جانب متوجہ کیا۔ پہلے ہندوسماج نے اس سماجی بیداری کی رو کو پہچاننے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے راجہ رام موہن رائے نے برہموسماج کی بنیاد ڈالی جو بعد میں ہندوستانی سیاست کو جدید رجحانات سے روشناس کرنے کا ذریعہ بھی بنا۔ انھوں نے عورت کے حقوق اور کم عمری کی شادی کی مخالفت کو اپنا اولین فریضہ سمجھا۔ ان کی بدولت 'ستی' کی رسم کو ختم کیا گیا۔ راجہ رام موہن رائے کے بعد برہموسماج کی رہنمائی رویندر ناتھ ٹیگور کے سپرد ہوئی۔ ان کا ذاتی رجحان انگریزی تہذیب وتمدن کی طرف تھا۔ انھوں نے انتہائی مخالفت کے باوجود ۱۸۳۲ء میں برہمو میرج ایکٹ پاس کرایا۔ جس کے سبب دو مختلف قوموں میں شادی کو قانونی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس دور کے ہندوستان میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں خصوصیت سے بڑھیں۔ انھوں نے لوگوں کے تبدیلِ مذہب کے علاوہ سماجی کاموں میں بھی حصہ لیا، خصوصاً قحط بنگال کے موقع پر عوام میں روپے اور سامان تقسیم کیے۔

دوسری اہم اصلاحی جماعت پرارتھنا سماج تھی جو بہت دنوں سے پرم ہنس کے نام سے خفیہ طور پر مہاراشٹر کے علاقوں میں جاری تھی۔ اس جماعت کی رکنیت میں ایک دلچسپ شرط یہ تھی یہ اس کے ممبروں کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانا پڑتا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں کیشب چندسین نے اس کی دوبارہ تنظیم کی اور چھوٹی چھوٹی قوموں کے خاتمے، بیوہ کی شادی، تعلیم نسواں اور بچوں کی شادی سے متعلق مقاصد کو اپنا لائحہ عمل بنایا۔

تیسری اور اہم ترین اصلاحی جماعت آریہ سماج تھی، جس کی ابتدا دیانند سرسوتی نے ۱۸۵۷ء میں کی۔ اس اصلاحی جماعت کا

ہندوستانی سماج اور زندگی پر گہرا اثر پڑا۔اس کے بنیادی مقاصد میں سماجی ضروریات پر زور دیا گیا اور ہندوستان کے قدیم ویدوں کو بنیاد بنا کر ہندو سماج کی دوبارہ تنظیم کی کوشش کی گئی اور نئے نقطۂ نظر کے ساتھ قدیم خیالات کا جائزہ لیا گیا۔اس طرح ۵۱۔۱۸۴۹ء کے درمیان بنگال اور مہاراشٹر میں اصلاحی تحریکات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ایشور چندودیا ساگر نے شاستروں سے بیوہ کی شادی کے دلائل پیش کیے۔اور ۱۸۵۶ء میں اس کا قانون بھی بنوادیا۔۱۸۸۷ء سے بھارت سماج سدھار سوسائٹی نے کام شروع کیا۔

مسلم قوم میں اصلاحی تحریکیں ہندو قوم کی بہ نسبت دیر سے شروع ہوئیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ابتدا ہاں کہ فوجی سپاہیوں سے ہوئی لیکن مسلم علماء کی شرکت کی بنا پر اسے مذہبی شدت حاصل ہوگئی جس سے انگریزی حکومت نے غدر کی سازش کا ذمہ مسلمانوں کو ہی ٹھہراتے تھے۔اس نے مسلمانوں میں ایک طرح کی دہشت پھیلا دی۔اس کے ردعمل میں مسلم علماء نے انگریزی تعلیم و معاشرت کو کفر و شرک گردانا۔اس کا ردِّعمل بھی ہوا۔اونچے اور متوسط طبقوں میں بعض لوگوں نے انفرادی و ذاتی حیثیت سے انگریزوں کے سامنے سر جھکا دیا۔لیکن اجتماعی طور پر مسلمانوں کو نئی روشنی کی طرف متوجہ کرانے کا سہرا نواب عبداللطیف کے سر ہے،جنھوں نے ۱۸۶۳ء میں کلکتہ میں،محمڈن لٹریری سوسائٹی، قائم کی تا کہ اونچے اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کو انگریزی زبان و ادب کے مطالعہ کے لیے راغب کیا جائے۔انھوں نے عوام کو متوجہ کرنے کے خیال سے اپنی تائید میں علماء کے فتوے بھی حاصل کیے۔یہ تحریک اپنے محدود مقاصد کی بنا پر عواپ میں بہت مقبول نہیں ہوئی۔لیکن اسے سرسید کی اس ہمہ گیر علمی، مذہبی، ثقافتی، تہذیبی اور سماجی تحریک کا پیش خیمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جسے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نشاۃ ثانیہ کی حیثیت حاصل ہے۔

سرسید نے شروعات میں سماجی اصلاحات اور حقوق کی حفاظت کی کوششوں میں ہندو اور مسلم دونوں ہی کے لیے خدمتیں انجام دیں لیکن بعد میں ان کا رجحان مسلمانون کی طرف مرکوز ہوگیا۔جس کے تاریخی و سیاسی اسباب تھے۔سرسید کے اصلاحات کی نوعیت شروع میں مذہبی رہی۔انھوں نے مختلف کتابیں لکھ کر انگریزوں یا عیسائیوں کے بعض خیالات کی تردید کی، ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے دل سے ان کی نفرت ختم کرنے یا کم کرنے کے لیے مختلف طرح کے دلائل پیش کیے اور اس میں ایک طرح کی انتہا پسندی کے شکار ہوگئے۔سرسید کے ان خیالات کو وسعت اس وقت حاصل ہوئی جب انھوں نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، جس کے مقاصد میں مشترکہ قومی مفادات شامل تھے۔اس کے بعد ہی انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے قیام کے لیے درخواست دی، جس میں ناکام ہونے پر انھوں نے ۱۸۷۰ء میں کمیٹی خواستگان تعلیم مسلمانان، قائم کی اراعلیٰ معیار پر مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوششیں شروع کیں۔اسی سلسلے میں انھوں نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، قائم کیا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے نام سے مقبول ہوئی۔یہ ادارہ مسلمانوں کے مرکزی دارالعلوم کی حیثیت حاصل کر گیا۔مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے رواج سے ان کی سماجی زندگی میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں اور مغرب کے اثر نے ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں فکر و عمل کی نئی راہیں کھول دیں۔

انیسویں صدی کے ہندوستان کی سماجی تحریکا تجزیہ کرنے پر کئی پہلوؤں کا انکشاف ہوتا ہے۔اس دور میں تقریباً تمام تحریکیں مذہبی اصلاحات کے جذبے سے متاثر تھیں۔اس میں رسومات اور اوہام پرستی کی مخالفت کسی بغاوت یا انقلاب کے پیش نظر نہیں تھی بلکہ مروجہ مراسم کی افراط و تفریط سے عاجز ہو کر اصلاح کی کوشش کی جارہی تھی۔اس اصلاح پسندی میں ہمیشہ کی طرح زندگی کو بہتر بنانے کے خواب تھے۔ اس میں کچھ ایسے پہلوؤں کو بھی جگہ دی گئی جو مختلف اقوام و ملت میں یکساں ہوتے ہیں۔اس سلسلہ میں وسعت نظر کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھیں قدیم ہندوستانی تاریخ کی وراثت کے پہلو بہ پہلو غیر ہندوستانی اقوام کے بعض اقدام سے بھی خوشہ چینی کرنا پڑی۔

ملکی تحریکات میں سماجی تبدیلی کا خیال بالکل مختلف انداز میں ۱۹۱۹ء میں سامنے آیا، جب مہاتما گاندھی نے اس کی رہ نمائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی۔ انھوں نے غیر ممالک کپڑوں کو بائیکاٹ کر کے ہندوستانی کھادی کی طرف توجہ دلائی اور کانگریس کے کام کرنے والوں کے لیے کھدّر کا چرخہ چلانا لازمی قرار دیا۔ ان کے پہلے کی تمام تحریکوں میں عوامی سرگرمی کی کوئی مثال نہیں ملتی لیکن گاندھی جی نے عوام کے جذبۂ عمل کو متحرک کر دیا کہ وہ اپنے استحصال کرنے والے طبقے خصوصاً زمینداروں اور تعلقہ داروں کے خلاف مستعد ہو گئے۔ اسی زمانے میں دیہاتوں کی معاشی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی بھی رونما ہوئی۔ کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کے لیے ساہوکاروں اور تاجروں کی سرگرمیاں بڑھیں۔ عالمی جنگ ار ۱۹۲۹ء کی بین الاقوامی گرانی نے روزانہ کی ضروریات کی چیزوں میں کپڑا، غذا، نمک وغیرہ کی قیمتیں بڑھا دیں جن کی بنا پر غریب عوام مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوئے۔ قرض کی ادائیگی نہ کر پانے کے سبب ان کی جائدادیں آہستہ آہستہ انکے ہاتھ سے نکل گئیں۔ ان مہاجنوں کو انگریزی سرکار کی طرف سے پوری چھوٹ تھی، مال دار طبقہ شہروں میں رہتا تھا اور وہیں سے کارندوں کے ذریعہ زمینداری اور زراعت کا انتظام کرتے تھے۔ یہ کارندے اور پیادے بظاہر اسی طبقہ سے آتے تھے جو کسانوں اور مزدوروں کا تھا، لیکن انھوں نے اپنے ہی طبقے کے لوگوں کا استحصال شروع کر دیا۔ اس ظلم کے خلاف جو آواز اٹھائی گئی اسے سماجی سے زیادہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا لیکن سماجی تحریک کی بصیرت اپنی گذشتہ جدوجہد کو ایک نئی شکل میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئی اور اصلاحات کی خواہش میں اسی عہد میں عوامی کوششوں کا سلسلہ شروع ہوا اس میں شک نہیں کہ اس آزمایش میں عوام کو سخت مظالم سے گزرنا پڑا لیکن یہی ان کی بیداری کا سبب بھی بنا۔

1.5 پریم چند کے عہد کا سیاسی پس منظر

اب تک ہم نے پریم چند کے عہد میں ہونے والے سماجی مسائل، اصلاحی و سماجی تحریکات کا مطالعہ کیا ہے۔ آیئے اب ہم پریم چند کے عہد میں ہونے والی سیاسی بیداری کا مطالعہ کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ہندوستان میں سیاست کو مذہب کے زیرِ سایہ ہی پرورش پانے کا موقع ملا۔ سیاست جب وسیع دائرے میں استعمال ہوتی ہے تو اخلاقی سماجی اقدار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور سیاست کی نفسیاتی توجیہ کے لیے انسانیت پسندی کو لازمی قرار دینا پڑتا ہے۔ پریم چند کو ادیب کی وسیع ذمہ داریوں کا احساس تھا جس کا مطالعہ ہم ان کی مختلف تخلیقات میں کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ادیب کو سماج و معاشرہ کا مصلح نہیں قرار دیا ہے۔ بلکہ ساتھ ہی ادب کو فرد کی ذات کے اظہار و انکشاف تک بھی محدود نہیں کیا ہے۔ پریم چند کا یہ خیال تھا کہ ادب کی بہتری میں سماج کی بہتری پوشیدہ ہے۔ انھوں نے ادب میں سیاست کے عمل کو ضروری قرار دیا تھا۔ اور اس کے اظہار کے لیے معاشرہ کے موجودہ حالات کی ترجمانی پر زور دیا تھا۔ پریم چند کے خیال میں ادیب کا سیاسی سرگرمیوں میں عملی طور پر شامل ہونا نہ صرف اچھا ہے بلکہ اس سے اس کی تخلیق کو تجربے اور خیالات کے عناصر کو پرکھنے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے۔ ادب کو سیاست کے مسائل کی تشریح کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کے ذریعہ صحیح تجزیہ و رہنمائی کی جا سکے تو بہتر صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے۔

پرانے زمانے میں ہندوستان کا سیاسی نظام طبقہ وارانہ تقسیم کی بنیاد پر برہمنوں اور چھتریوں کی نگرانی میں عمل پذیر تھا اور ملک کی دوسری قوموں کو انھیں کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ اس لیے سیاسی و ملکی مسائل کی ذمہ داری کا احساس بھی سماج کے بلند طبقے تک محدود تھا۔ مسلم

بادشاہوں کے زمانے تک صرف امراورؤسا کو ہی سیاسی اور انتظامی معاملات میں دخل دینے کا اختیار تھا، جو بادشاہ کے حکم سے اپنے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ انھوں نے یہاں کے ملکی معاملات میں مقامی رواج اور احکام کی پابندی کی اور عوام کو کسی سیاسی انتشار کا شکار ہونے کی نوبت نہ آئی۔

موجودہ سیاسی نظام انگریزی حکومت کے ساتھ مخصوص ہے۔ انگریزوں ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے اور پھر یہاں قبضہ کر کے اپنے تجارتی مقاصد کی تکمیل کے مطابق نیا سیاسی نظام قائم کیا جو بالکل مختلف نوعیت کا تھا۔ انگریزوں نے یہاں قبضہ کرتے ہی ہندوستانی زندگی وتہذیب سے خود کو الگ رکھ کر اپنی تہذیبی و معاشرتی برتری کا اعلان کیا۔ انگریزوں نے برطانیہ کے ہی سیاسی نظام کو جو سرمایاداری کے اصولوں پر مبنی فروغ دیا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے پس منظر میں عوام کی بے اطمینانی اور پامالی کی پوری داستان ہے جس کے معاشی اور سیاسی اسباب دونوں تھے۔ انگریزوں نے پے در پے مختلف معاہدوں کی وعدہ خلافی کر کے حقوق کے غصب کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ جس کے سبب نوابوں اور رئیسوں کے ساتھ ہی کسانوں کی زمینوں کی ضبطی اور نیلامی بھی شروع ہوگئی۔ انگریزوں نے اپنے سیاسی احکامات کو نافذ کرنے میں ظلم جبر کا اپنا ہتھیار بنایا اور بعض دفعہ انھیں کے سہارے ہندوستانی عوام کے مقدمات کے فیصلے بھی کیے جاتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستانی عوام کی مذہبیت کا بھی مذاق اڑایا اور عیسائی مشنریوں کے قیام وعمل میں مدد کی۔ کیوں کہ یہ مشنریاں انگریزی حکومت کے قیام کو سیاسی اعتبار سے مضبوط بنانے میں مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔ اسی طرح کے بہت سے مختلف اسباب تھے جس نے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات پیدا کیے۔ اس عظیم الشان بغاوت میں گرچہ کامیابی انگریزوں کے حصے میں آئی لیکن پھر بھی وہ خوف زدہ ہوگئے اور اپنا توازن کھو بیٹھے۔ انھوں نے ظلم وجبر کے ذریعہ حالات پر قابو حاصل کیا اور ہندوستانی اقوام کے آپسی اتحاد و بھائی چارے کو کم کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش شروع کر دی۔ ابتدا میں عہدوں اور نوکریوں کی تقسیم میں خوب زیادتی کی گئی اور ایک فرقے کو دوسرے پر ترجیح دے کر آپس میں کشیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح انگریزوں نے اس طرح ہندوستانیوں کو الجھا دیا۔ ساتھ ہی ملک کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور حکومتوں سے صلح کرنا شروع کر دیا۔ یہ تمام حکومتیں انگریزوں کی ماتحت میں تمام انتظامی اختیارات کی حامل بنا دی گئیں۔ جن کی بدولت انگریزوں کے زیرِ اثر ایک طرح کے طاقتور وفاداروں کا حلقہ تیار ہوگیا۔ لیکن ان کوششوں کے باجود ہندوستان میں انگریزوں سے نفرت اور بے اطمینانی کی فضا پھیلتی گئی۔ انھوں اپنی تہذیب وتمدن اور زبان سے متاثر کرنے کی کوشش کی لیکن اسی سے ہندوستانیوں کو ان کی کمزوریوں کا بھی احساس ہوگیا۔ اس دور میں متعدد اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں جنھوں نے سیاسی شعور اور قومی وملی جذبات کو عوام میں فروغ دیا۔

آہستہ آہستہ انگریزوں نے ایک ادارہ کا قیام کیا تا کہ سرکاری افسروں اور ان کے ماتحتوں کے مابین تعاون کی فضا ہموار ہو سکے۔ اسی مناسبت سے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی گئی جس نے بعد میں اپنے انقلابی کارناموں کے سبب ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا۔ کانگریس کی کوششوں کا مرکز انڈین سیکرٹ کونس کا خاتمہ، سرکاری ملازمت میں رعایت، ہندوستانی فوج میں تخفیف اور انتظامی اصلاحات وغیرہ تھے۔ لیکن انگریزوں نے کبھی بھی ان چیزوں کو اہمیت نہ دی۔ اس دور میں کانگریس کے اجلاس میں حکومت برطانیہ کی مدح وثنا زور وشور سے ہوتی۔ چنانچہ عوام کے علاوہ خواص میں انگریزوں کی انصاف پسندی کی تعریفیں کی جاتیں۔ یہ رجحان اس وقت بدلنا شروع ہوا جب کانگریس میں لالہ لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک، پین چند پال وغیرہ شامل ہوئے۔ اس کے بعد

۱۹۲۰ء تک کا دور سیاسی حکومت کی جدوجہد کا دور رہا۔ اس دور میں کانگریس کے دونوں بازوؤں میں آپسی کشمکش بھی جاری رہی اور انگریزوی حکومت نے ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' (تقسیم اور حکومت) کے نظریے کے تحت ہندوستانیوں میں تفریق پیدا کرنے کی مسلسل کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کر دینا تھا۔ یہ صورت حال باقی نہ رہ سکی لیکن فرقہ وارانہ جذبات کو قوت حاصل ہوئی اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ گیا۔ مسلم لیگ اصولاً بعض معاملات میں کانگریس کے دائیں بازو کی ہم خیال تھی۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت، حاکموں سے اشتراک عمل اور ملک کی مختلف ملتوں میں خلوص کا جذبہ پیدا کرنا ان کے مقاصد میں شامل تھے۔ لیکن عملاً یہ کانگریس کی مخالفت تک محدود تھی اور نفرت کے جذبات ابھارنے کا ذریعہ بھی بنی۔ انگریزوں کے شیطانی چالوں کے ردِّعمل کے طور پر ایک انقلابی جماعت نے بھی جنم لیا، جس کا عقیدہ تھا کہ تشدد کے خاتمے کے لیے تشدد ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا طریقۂ کار عام کانگریسیوں سے مختلف تھا۔ انھوں نے اخباروں کے ذریعہ غلامی سے نفرت کے جذبات کو بیدار کیا۔ نوجوانوں کو بھرتی کر کے باغی فوجیوں کے گروہ تیار کیے، بم اور ہتھیاروں کے ذریعہ جنگی تربیت کی اور شب خون اور حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان دنوں کانگریس نے کئی طرح کے سیاسی ہچکولے برداشت کیے۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو اصلاحوں کی تائید کی، پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں سے اشتراک عمل کیا، ترکی کی خلافت کے خاتمہ پر ناراض مسلمانوں کی دل دہی کی اور رولٹ ایکٹ کی مخالف کی۔ اس دور میں کانگریس نے اپنی طاقت بہت بڑھالی جس سے انگریزوں میں عدم اعتمادی بڑھ گئی اور انھوں نے جلیان والا باغ میں لوگوں پر گولیاں چلوا دیں۔ ۱۹۱۸ء میں دائیں بازو کے کانگریسی اس سے الگ ہو گئے۔ انھوں اپنی الگ ایک لبرل پارٹی تیار کی۔ یہاں سے کانگریس کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰۔۱۹۲۷ء تک سوراج کا مطالبہ جاری رکھا۔ اس کی شروعات مہاتما گاندھی کے عدم تعاون کی تحریک سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانی عوام ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر ستیا گرہ کرتے رہے تو ایک سال کے اندر ہی انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ لیکن انھوں چوراچوری کے قتلِ عام سے متاثر ہو کر جلد ہی اس تحریک کو روک دیا۔ کانگریس پر اس کا ردِّ عمل بہت سخت پڑا۔ پنڈت موتی لعل نہرو اور لالہ لاجپت رائے نے جیل سے ہی اس کی مخالفت کی جس سے انگریزوں کو سمجھنے کا موقع ملا کہ اب مہاتما گاندھی کی ہر دل عزیزی ختم ہوگئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے انھیں چھ سال کی سزا دے کر جیل میں بند کر دیا۔ اسی دوران کانگریس کے کچھ رہنماؤں نے 'کونسل میں داخلہ' کی تجویز کی، جن میں پنڈت موتی لعل نہرو اور دیش بندھو چترنجن داس اہم تھے۔ کانگریس کے بعض اراکین نے اس کی مخالفت کی، لیکن جب انھوں نے 'سوراج دَل' کے نام سے الگ جماعت قائم کر لی تو ایسے کانگریسی جو گاندھی جی کے رویے سے مطمئن نہ تھے۔ اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن یہ جماعت بہت دنوں تک باضابطہ عمل نہ کر سکی اور ۱۹۲۵ء میں دیش بندھو کی موت کے بعد اس کا زور گھٹ گیا۔ اس دور میں ایک انگریزی کمیشن ہندوستان کے حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے آیا جو اس خیال کا حامی تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔ لہٰذا اس نے تجویز رکھی کہ وہ صرف ان معاملات پر غور کر سکے گا جو دونوں میں مشترک ہوں۔ چنانچہ ہندوستانیوں نے ایک مشترک تجویز پیش کی، لیکن انگریز اسے قبول نہ کر سکے۔

کانگریس کا دسمبر ۱۹۲۹ء کا اجلاس منعقدہ لاہور، ایک طرح سے ہندوستانی تاریخ میں اہم ترین حیثیت کا مالک ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی نے ملکی تحریک آزادی کو ''مکمل آزادی'' کے نصب العین سے شروع کرنے کا اعلان کیا اور کانگریس نے ایک ریزولیشن کے ذریعہ نہرو رپورٹ کی تجویزوں کو مسترد کر دیا۔ اس سے فرقہ وارانہ مسائل کی سنگینی دوبارہ بڑھ گئی۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی نے سول نافرمانی

کی تحریک شروع کر دی اور نمک قانون کے توڑنے پر بھی زور دیا۔ انگریزوں نے اس تحریک کو دبانے کے لیے تشدد کے حربے استعمال کیے اور متعدد جگہوں پر لاٹھی چارج، گولیوں اور کرفیو کا استعمال کیا گیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو لاہور سازش کے سلسلہ میں سزائے موت کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ مہاتما گاندھی ان کے موقف سے مطمئن نہ تھے، لیکن انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور سزائے موت کو سزائے عمر میں تبدیل کرنے کی سفارش کی لیکن لارڈ اِرون نے اسے نامنظور کر دیا۔ اسی دور میں مہاتما گاندھی وائسرائے کے ساتھ ایک صلح نامہ پر دستخط کیے جو تاریخ میں گاندھی ارون پیک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے مطابق تمام قیدی جیل سے رہا کر دیئے گئے اور مہاتما گاندھی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے ولایت گئے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انگریزوں نے عملی تعاون سے نہ صرف گریز کیا بلکہ لندن کی واپسی میں ہی انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اسی سال حکومت نے اچھوتوں کی الگ قومیت کا اعلان کیا۔ جس کی مخالفت میں مہاتما گاندھی نے جیل سے ہی ۱۴ دن کے برت کا اعلان کر دیا۔ مہاتما گاندھی کو ۸ مئی ۱۹۳۳ء میں رہائی حاصل ہوئی اور حکومت نے چند اصلاحات کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پاس کیا۔ اس ایکٹ نے ہندوستانی جاگیرداروں اور حکومت کے رشتے کو تقویت دی۔ حکومت نے مالیات، فوج اور امور خارجہ کے معاملات کو محفوظ رکھنے کے بعد پریوی کونسل کی رکنیت کی تجویز رکھی جسے ناپسند کر دیا گیا اور ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں قانون میں مزید ترمیم کیے گئے جس سے اس کی اہمیت اور بھی کم ہوگئی۔ لیکن کچھ دن بعد کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے قبول کر لیا اور انتخاب کی سرگرمیوں میں فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوا۔

پریم چند نے اپنے ادب کا مقصد حصولِ آزادی قرار دیا تھا اور ان کی سب سے بڑی تمنا بھی یہی کہ ملکی عوام اپنی تحریک آزادی میں کامیاب ہوں۔ یہی خیالات ابتدا سے ہی ان کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔ پریم چند کو یہ سعادت حاصل ہے کہ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ سوزِ وطن اپنے وطن کی سیاسی تحریک کو آگے بڑھانے اور جذبہ آزادی کو بیدار کرنے کے خوش گوار الزامات میں غیر ملکی حکمرانوں کے ذریعہ ضبط کر لیا گیا اور اس کی تمام کاپیاں نظرِ آتش کرا دی گئیں۔

تحریک آزادی کا بنیادی مسئلہ ہندو مسلم اتحاد تھا، جس کو ختم کرنے لیے غیر ملکی حکومت ہمیشہ کوشش کرتی رہی۔ نوکریوں اور عہدوں میں ہندو مسلم کے لیے الگ الگ جگہیں، ہندو یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، ریلوے اسٹیشنوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کھانے پینے کا الگ الگ انتظام، ہندو پانی، مسلم پانی وغیرہ ایسی چیزیں تھیں جو بنیادی طور پر ہندو مسلم اتحاد ختم کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ ۱۸۵۷ء میں ہندو مسلم اتحاد سے انگریزوں کو جو خطرہ پیش آیا تھا، اس کی روشنی میں بھی وہ اتحاد کی قوت کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ہندوستانی سیاست کی فرقہ وارانہ جماعتیں مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا وغیرہ بھی قومی زندگی کے لیے اپنے طور پر کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے اختلافات نے فرقہ واریت کے رجحان سے تحریک آزادی کی فضا مسموم کر دی تھی۔ اس کے اسباب کی تلاش اور ان کے حل کرنے کی کوشش سیاست کے علاوہ دوسرے حلقوں میں بھی جاری تھی۔ اس دور کے ادب میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر بہت کچھ پیش کیا گیا۔ جس میں پریم چند نے خصوصیت سے مدد کی۔ ان کے متعدد اداریوں میں اس کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

فرقہ واریت کے معاشی اسباب نے تحریک آزادی میں مختلف فرقے کے لوگوں کو سودے بازی پر آمادہ کر دیا تھا۔ ہندو مسلم اور دیگر مذہبی فرقے اپنے مفاد کو مقدم قرار دے کر باہمی اختلاف کے رجحان کو تقویت دے رہے تھے۔ مسلمانوں میں مالی بدحالی زیادہ تھی، کیوں کہ انھوں نے انگریزی تعلیم تمدن سے الگ رکھنے کی کوشش میں سرکاری مراعات کھو دئے تھے۔ انگریزی حکومت کی ملازمت میں ان

کی تعداد بہت کم تھی، اس کے خلاف ردِّعمل ہوا اور جب مسلمانوں میں سرکاری امداد حاصل کرنے کا رجحان بڑھا تو اس میں دوسرے فرقوں سے بلاواسطہ رسہ کشی شروع ہوگئی۔ اس دور کی مسلم سیاست اکثریتی فرقے سے شاکی تھی اور انگریزوں کی مدد سے اپنی گذشتہ مالی پسماندگی دور کرلینا چاہتی تھی۔

تحریک آزادی بھی قومیت کے جس تصور کے زیر اثر شروع ہوئی، وہ مغربی قومیت کے تصور سے مختلف نہ تھی۔ اس میں انسانی حقوق کے تحفظ مساوات اور ترقی کے لیے واضح شعور نہ تھا بلکہ بعض مواقع پر اسے عوام سے زیادہ سرمایہ دار طبقہ کی رہنمائی حاصل ہو جاتی تھی اور اس میں عوامی استحصال کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔ لیکن جب اس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں اجتمائی کیفیت حاصل کر لی تو چھوٹے بڑے شہری اور دیہاتی، تعلیم یافتہ اور جاہل سب نے جوش وخروش سے مجاہدانہ سرگرمیاں شروع کر دیں اور پہلی بار ہندوستان میں سیاسی تھریک عوامی زندگی کا حصہ بن گئی۔ پریم چند نے ہندوستانی قومیت کے تصور کو بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کی سعی کی۔

پریم چند کی تخلیقات میں تحریک آزادی کے سلسلے میں دلی امنگ کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے کانگریس کے سیاسی پلیٹ فارم سے بظاہر الگ رہتے ہوئے اس کی جد وجہد سے ذاتی دلچسپی رکھی۔ اس سلسہ میں بعض اوقات ان کا رویہ شدید بھی ہو جاتا تھا۔ ان کہانیوں میں انھوں نے متعدد جگہوں پر کھل کر کانگریس کے رویے سے اپنے اختلاف رائے کا اظہار کیا۔

اس طرح نمک ستیا گرہ کے سلسلہ میں ان کے خیالات بہت شدید تھے۔ لیکن اختلاف کے باوجود تحریک کی ہمہ گیری اور کامیابی کی دلی خواہش رکھتے تھے۔ تحریک آزادی اور اصلاحی کوششوں کے بیان میں آریہ سماج کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آریہ سماج نے قومی بیداری پیدا کرنے کی مہم میں غیر معمولی رول ادا کیا۔ بلکہ اسے سماجی وثقافتی اصلاحات کے پلیٹ فارم کی حیثیت حاصل تھی۔ پریم چند لکھتے ہیں کہ میں آریہ سماج کو جتنا مذہبی ادارہ سمجھتا ہوں اتنا ہی تہذیبی ادارہ بھی سمجھتا ہوں۔ سماج کی ذہنی وفکری سطح کو آریہ سماج نے جتنا اٹھایا شاید ہی ہندوستان کے کسی ادارہ نے اٹھایا ہو۔

پریم چند کے اہنسا، خدمت اور آدرش کا نصب العین بڑی حد تک گاندھی جی کی فکر ہے۔ انھوں نے خود کو مہاتما گاندھی کا شاگرد بھی کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہی اس وقت کی ملکی سیاست کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ پریم چند نے سیاسیس بیداری کے ابتدائی دور میں ہی اس بات کا اندازہ کرلیا تھا کہ گاندھیائی فکر میں طالسطائی سے گاندھی جی کو ذہنی ہم آہنگی ہے۔ پریم چند خود بھی اس سے متاثر تھے اور طالسطائی کے قلم کا جادو ان پر پہلے سے ہی ۱۹۱۴ء میں چل چکا تھا۔ پریم چند نے اپنی کئی کہانیوں میں ستیہ اور اہنسا کی تبلیغ کی ہے۔

پریم چند نے انسان دوست ادیبوں کی طرح دنیا کے عام انسانوں کے مسائل سے دلچسپی لی اران کے لیے مساوی بنیادوں پر وسائل کی نشان دہی کی۔ پریم چند ہندوستانی کسانوں اور مزدوروں کی خوش حالی کو عالمی خوش حالی سے وابستہ کر کے دیکھتے تھے اور اسی بنا پر انھیں اپنے ہم عصروں میں انفرادی حیثیت حاصل ہے۔

تو یہ وہ سیاسی منظر نامہ تھا جس نے پریم چند کے کہانیوں کے لیے موضوعات فراہم کیے۔ ظاہر ہے وہ زمانہ انتشار کا زمانہ تھا انگریزوں کا ظلم و جبر ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور ہندوستانی عوام اس کا لقمہ بنی ہوئی تھی۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنے، سماجی برائیوں کو ختم کرنے، انسان دوستی کو فروغ دینے، فرقہ واریت کے مسائل کو ختم کرنے کا کام کیا۔

1.6 آپ نے کیا سیکھا

- آپ نے جانا کہ کس طرح انگریزی حکومت ہندوستان کو اپنی مصنوعات کی منڈی بنانا چاہتے تھے اور اس طرح وہ اپنے ملک کی تجارت اور صنعت کو ترقی دینا چاہتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو کسی بھی صورت میں پنپنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ دیسی صنعتوں کی تباہی سے گزر اوقات کرنے والی آبادی کا ایک بڑا حصہ بیکار ہو گیا تھا۔
- بیسویں صدی کے اوائل میں جب قومی تحریکیں آگے بڑھیں ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا تو سامراجی حکومت کی استحصال پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی لیکن اس کے باوجود ان کے مظالم میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی حالت بدتر ہوتی گئی۔ اس زمانے میں ان کے ساتھ جو وحشیانہ اور جابرانہ سلوک کیا گیا وہ بہت ہی دردناک تھا۔
- ایک طرف جاگیردارانہ لوٹ اور سامراجی استحصال ہندوستانی عوام کو فاقہ زدہ بنا رہے تھے۔ دوسری طرف ان کے اپنے سماجی حالات فرسودہ رسم و رواج اور مذہبی عقائد کی گرفت نے ان کی معاشی خوشحالی کے راستے مسدود کر رکھے تھے۔ توہم پرستی اور مذہبی رسوم کے بہانے جاہل اور کمزور طبقوں کا معاشی استحصال اور یہ استحصال صرف ہندوستانی عوام پر ہی نہیں تھا بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔
- آپ نے دیکھا کہ اس دور میں تقریباً تمام تحریکیں مذہبی اصلاحات کے جذبے سے متاثر تھیں۔ اس میں رسومات اور اوہام پرستی کی مخالفت کسی بغاوت یا انقلاب کے پیش نظر نہیں تھی بلکہ مروجہ مراسم کی افراط و تفریط سے عاجز ہو کر اصلاح کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس اصلاح پسندی میں ہمیشہ کی طرح زندگی کو بہتر بنانے کے خواب تھے۔ اس میں کچھ ایسے پہلوؤں کو بھی جگہ دی گئی جو مختلف اقوام و ملت میں یکساں ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وسعت نظر کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھیں قدیم ہندوستانی تاریخ کی وراثت کے پہلو بہ پہلو غیر ہندوستانی اقوام کے بعض اقدام سے بھی خوشہ چینی کرنا پڑی۔

1.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ پریم چند عہد و ماحول کے بارے میں تفصیل سے بتائیے؟
2۔ عہدِ پریم چند کے سماجی پس منظر کا جائزہ لیجئے؟
3۔ عہدِ پریم چند میں فروغ پانی والی سماجی و اصلاحی تحریکات پر روشنی ڈالئے؟
4۔ عہدِ پریم چند میں سیاسی حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے؟
5۔ عہدِ پریم چند میں ہندوستان کے سیاسی انتشار کا جائزہ لیجئے؟

1.8 سوالات کے جوابات

جواب نمبر 1۔ پریم چند نے جس عہد میں قلم اٹھایا اس وقت ہندوستان میں برطانوی حکومت کے تقریباً پچاس سال مکمل ہو چکے تھے۔ سارا ہندوستان اس کی غلامی میں تھا ملکی نظم و ضبط کے ہر شعبہ پر اس کی آہنی گرفت مستحکم ہو گئی تھی۔ اس عرصے میں سب سے زیادہ توجہ حکومت نے جس پر صرف کیا وہ فوج کی نئی تشکیل و توسیع تھی۔ انگریزی حکومت کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں انگلستان کے سامراجی مفاد کا زیادہ سے زیادہ تحفظ قائم ہو۔ غدر کے واقعات نے انگریزوں کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستانی فوجیوں کو وفادار اور قابل اعتماد سمجھنا ہندوستان میں

اپنے وجود کے لیے مستقل خطرہ مول لینا ہے اس لیے فوج میں انگریزوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا یہاں تک کہ ان کی مجموعی تعداد ہندوستانی غلاموں کی فوج کی ایک تہائی کے قریب تھی۔ اس کے سبب برطانوی اقتدار نے ہندوستان کے پورے دیہی معاشی نظام کو درہم برہم کر دیا۔ کسان اپنی زندگی کے مفلوک الحال صورتِ حال سے ہی مطمئن تھے لیکن برطانوی اقتدار نے اس نظام کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ صدیوں پرانی دیہی معیشت تباہ ہوگئی مال گزاری وصول کرنے والے عہدے دار زمیندار اور سامراجی حکومت کے وفادار تعلق دار بن گئے کم از کم عملی طور پر وہ زمین کے مالک تھے انہیں زمین کی پیداوری یا کاشت کاری سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ نذرانہ یا رشوت لے کر موروثی کاشتکاروں کو زمین سے بے دخل کر دینا ان کا روز کا معمول تھا۔ بیوپاریوں اور ساہوکاروں کا طبقہ کاشت کاروں کو لوٹنے کھسوٹنے اور ان کی پرسکون سماجی اور معاشی زندگی کو تباہ کرنے کا ایک اور باعث ہوا۔ وہ غریب کسانوں کو ایسی شرح پر سود دیتا کہ وہ ساری زندگی کی کوشش کے بعد بھی اسے ادا نہ کر پائے۔ ساہوکار ہر سال ان کی فصلیں قرق کر لیتا یہاں تک ایک دن ان کی زمین پر قبضہ کر کے انہیں کاشتکار سے مزدور بنا دیتا تھا۔ چوں کہ انگریزی حکومت کا ایک اہم مقصد ہندوستان کو اپنی مصنوعات کی منڈی بنانا اور اس طرح اس نسبت سے ان کھیت مزدوروں میں بھی اضافہ ہوا جن کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں تھی۔ کسانوں کو ہمدردی اور حصولِ انصاف کے لیے بھی کثیر رقم خرچ کرنا پڑتی۔ جن علاقوں میں رعیت داری طریقہ رائج تھا وہاں بھی کاشتکاروں کی لوٹ کھسوت اور ان کی معاش و ابتری دوسرے علاقوں سے کم نہیں تھی۔ ہندوستانی کاشتکاروں کی زندگی کا معیار دن بہ دن پستی کی طرف جا رہا تھا۔ فصلیں خراب ہونے لگیں اور اکثر ہر دو چار سال بعد ہولناک قحط کا سایہ بھی منڈراتا رہا۔ زمینیں کم تھیں اور اس پر انسانوں کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

جیسا کہ ذکر آیا ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان کو اپنی مصنوعات کی منڈی بنانا چاہتے تھے اور اس طرح وہ اپنے ملک کی تجارت اور صنعت کو ترقی دینا چاہتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو کسی بھی صورت میں پنپنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ دیسی صنعتوں کی تباہی سے گزر اوقات کرنے والی آبادی کا ایک بڑا حصہ بیکار ہو گیا تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جب قومی تحریکیں آگے بڑھیں ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا تو سامراجی حکومت کی استحصال پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی لیکن اس کے باوجود ان کے مظالم میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی حالت بدتر ہوتی گئی۔ اس زمانے میں ان کے ساتھ جو وحشیانہ اور جابرانہ سلوک کیا گیا وہ بہت ہی دردناک تھا۔

ایک طرف جاگیردارانہ لوٹ اور سامراجی استحصال ہندوستانی عوام کو فاقہ زدہ بنا رہے تھے۔ دوسری طرف ان کے اپنے سماجی حالات فرسودہ رسم و رواج اور مذہبی عقائد کی گرفت نے ان کی معاشی خوشحالی کے راستے مسدود کر رکھے تھے۔ توہم پرستی اور مذہبی رسوم کے بہانے جاہل اور کمزور طبقوں کا معاشی استحصال اور یہ استحصال صرف ہندوستانی عوام پر ہی نہیں تھا بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔

ہزاروں سال سے ہندو سماج میں اونچی ذات کے لوگ نچلے طبقوں پر حکومت کرتے آئے ہیں۔ معاشرتی و معاشی اعتبار سے ان کی زندگی غلاموں سے بھی بدتر رہی ہے۔ وہ ان سماجی و سیاسی حقوق اور سہولتوں سے محروم تھے جو سماج کی دوسری ذاتوں کو حاصل تھیں۔ مثلاً مقدس مذہبی کتابوں کو نچلے طبقوں کو چھونے کی اجازت نہیں تھی۔

ہندوستانی عوام بالخصوص دیہاتوں میں رہنے والے کاشتکار اسی مذہب پرستی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کا توکل اور ظلم و جبر کو خاموشی سے سہنے کی عادت ان کی موہوم مذہب پرستی کا اثر تھا کہ وہ اپنی اس بدحالی پر بھی شکوہ نہ کرتے تھے۔ ان غریبوں سے

ہمدردی، دیہاتوں کی بے کسی و بے بسی کا احساس، ان کی زبوں حالی کو بہتر بنانے کی خواہش اور آزادی کی دنیا میں سانس لینے کی تمنا وغیرہ ایسے حقائق ہیں جنھوں نے پریم چند کو واقعیت پسند اور حقیقت نگار بنا دیا۔ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا سیکھا اور تلخیوں کی لذت کا احساس اپنے اندر پیدا کیا اور اپنی کہانیوں میں انہیں مسائل پوری قوت کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیا۔

جواب نمبر 2۔ پریم چند کے سماجی مطالعات میں ان کے دور کے سماجی پس منظر سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستانی معاشرہ گاؤں کی اکائیوں پر مشتمل تھا۔ پورے ملک میں لاکھوں گاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ جن کی معاشیات کھیتی/ زراعت کے پیشے پر منحصر تھی۔ ان گاؤں میں انسانی ضرورت کی تمام چیزیں پیدا کی جاتیں اور ان کے باہمی تبادلے پر معاشی نظام قائم تھا۔ دوسرا نظام ان کی گاؤں پنچایت تھی، جو گاؤں کے معاملات میں خود مختار ہوتی۔ وہی عدالت حفاظت اور لگان کی وصولی کا ذریعہ بھی تھی۔ راجا یا حکمراں طبقہ گاؤں سے صرف ہر سال غلے کی ایک مقررہ مقدار اس کو پنچایت کے ذریعہ حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ زمینوں پر ملکیت کا دعویٰ کسی بھی حکمراں نے نہیں کیا۔

اسی طرح صنعت وحرفت میں دست کاری کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ چیزوں کی پیداوار اور استعمال میں گاؤں نہ صرف آزاد تھے بلکہ شہروں کو بھی اپنی چیزیں بھیجتے تھے۔ یہ نظامِ معاشرت ہندو راجاؤں کے دور میں تھا، جسے معمولی تبدیلیوں اور اصلاحوں کے بعد مسلم حکمرانوں نے بھی قبول کر لیا۔ انتظامی معاملات میں مسلم بادشاہوں نے ہندوستانی زندگی سے مختلف یا کوئی الگ تحریک یا مہم نہیں شروع کی۔ پہلی بار ایک نئی تنظیم کا آغاز انگریزی حکومت نے کیا۔ اس کے معاشی و سیاسی وجوہات تھے۔ کیوں کہ انگریزوں نے یہاں تاجر کی حیثیت سے قدم رکھا تھا۔ صنعتی انقلاب نے انھیں ایسی معاشی ضرورت سے روشناس کر دیا تھا کہ انھیں یا تو اپنی تجارت کے لیے نئے بازار تلاش کرنے تھے یا اپنے ہی ملک میں معاشی بدحالی کا شکار ہو کر زندہ درگور ہو جانا تھا۔ اسی طرح کے بازار کی تلاش میں انھوں نے ہندوستان کو اپنی آماج گاہ بنایا۔ جہاں حالات کی ستم ظریفی نے ہندوستانیوں کے آپسی اختلافات میں حکومت و سیاست بھی سپرد کر دی۔ چنانچہ انھوں نے پوری تنظیم میں اپنے تجارتی مفاد کو پیش پیش رکھا۔ اور برطانیہ کے ہی اصولوں پر زمین کا بندوبست کیا۔

ہندوستان کو زراعتی ملک بنائے رکھنے کی بنا پر انگریزوں کو اپنے قدم مضبوتی سے جمانے کے مواقع زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوئے۔ زراعتی مال کی خریداری میں ہمت افزائی نے ملک کی بڑی تعداد کو دیہاتوں میں ہی محدود رکھا لیکن معاشی بدحالی کی بنا پر زندگی ناگوار ہوگئی۔ ہندوستانی عوام غربت اور مفلوک الحالی کا شکار ہوگئی۔ تعلیم کی روشنی سے بے بہرہ عوام میں ضعیف الاعتقادی نے فروغ پایا جس کے سبب رسم ورواج مذہبی اصول کے سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔ قسمت پسندوں نے اس معاشی بدحالی کے دور میں قناعت اور راضی بہ رضا رہنے کو خدا کی مرضی سمجھ بیٹھے۔ حاکموں کی بڑائی کو مذہبی کتابوں کے جواز سے روشناس کیا۔ ہندوسان کی سماجی زندگی میں عورت کو ہمیشہ سے ہی حقارت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس نئے نظام نے بھی عورت کے لیے کسی طرح کی سہولیات پیدا نہیں کی۔ انگریزون نے ہندوستان کی پوری عملی زندگی کو اپنے تجارت کی میزان پر تولا۔ اصلاحی کوششوں میں بھی یہی رویہ رکھا۔ لیکن کچھ نئے خیالات کی روشنی اور کچھ حالات کی تبدیلی نے ہندوستانیوں کو اصلاح کی جانب متوجہ کیا۔ پہلے ہندوسماج نے اس سماجی بیداری کی رو کو پہچاننے کی کوشش کی۔

جواب نمبر 3۔ سب سے پہلے راجہ رام موہن رائے نے برہموسماج کی بنیاد ڈالی جو بعد میں ہندوستانی سیاست کو جدید رجحانات سے روشناس کرنے کا ذریعہ بھی بنا۔ انھوں نے عورت کے حقوق اور کم عمری کی شادی کی مخالفت کو اپنا اولین فریضہ سمجھا۔ ان کی بدولت 'ستی' کی رسم کو ختم کیا گیا۔ راجہ رام موہن رائے کے بعد برہموسماج کی رہنمائی رویندر ناتھ ٹیگور کے سپرد ہوئی۔ ان کا ذاتی رجحان انگریزی تہذیب و

تمدن کی طرف تھا۔ انھوں نے انتہائی مخالفت کے باوجود ۱۸۳۲ء میں برہمو میرج ایکٹ پاس کرایا۔ جس کے سبب دو مختلف قوموں میں شادی کو قانونی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس دور کے ہندوستان میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں خصوصیت سے بڑھیں۔ انھوں نے لوگوں کے تبدیلِ مذہب کے علاوہ سماجی کاموں میں بھی حصہ لیا، خصوصاً قحط بنگال کے موقع پر عوام میں روپے اور سامان تقسیم کیے۔

دوسری اہم اصلاحی جماعت پرارتھنا سماج تھی جو بہت دنوں سے پرم ہنس کے نام سے خفیہ طور پر مہاراشٹر کے علاقوں میں جاری تھی۔ اس جماعت کی رکنیت میں ایک دلچسپ شرط یہ تھی یہ اس کے ممبروں کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانا پڑتا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں کیشب چندسین نے اس کی دوبارہ تنظیم کی اور چھوٹی چھوٹی قوموں کے خاتمے، بیوہ کی شادی، تعلیم نسواں اور بچوں کی شادی سے متعلق مقاصد کو اپنا لائحہ عمل بنایا۔

تیسری اور اہم ترین اصلاحی جماعت آریہ سماج تھی، جس کی ابتدا دیانند سرسوتی نے ۱۸۵۷ء میں کی۔ اس اصلاحی جماعت کا ہندوستانی سماج اور زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ اس کے بنیادی مقاصد میں سماجی ضروریات پر زور دیا گیا اور ہندوستان کے قدیم ویدوں کو بنیاد بنا کر ہندو سماج کی دوبارہ تنظیم کی کوشش کی گئی اور نئے نقطۂ نظر کے ساتھ قدیم خیالات کا جائزہ لیا گیا۔ اس طرح ۵۱۔۱۸۴۹ء کے درمیان بنگال اور مہاراشٹر میں اصلاحی تحریکات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایشور چندود یاساگر نے شاستروں سے بیوہ کی شادی کے دلائل پیش کیے۔ اور ۱۸۵۶ء میں اس کا قانون بھی بنوادیا۔ ۱۸۸۷ء سے بھارت سماج سدھار سوسائٹی نے کام شروع کیا۔

مسلم قوم میں اصلاحی تحریکیں ہندو قوم کی بہ نسبت دیر سے شروع ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ابتدا ہاں کہ فوجی سپاہیوں سے ہوئی لیکن مسلم علماء کی شرکت کی بنا پر اسے مذہبی شدت حاصل ہوگئی جس سے انگریزی حکومت نے غدر کی سازش کا ذمہ مسلمانوں کو ہی ٹھہراتے تھے۔ اس نے مسلمانوں میں ایک طرح کی دہشت پھیلا دی۔ اس کے ردعمل میں مسلم علماء نے انگریزی تعلیم و معاشرت کو کفر و شرک گردانا۔ اس کا ردِّعمل بھی ہوا۔ اونچے اور متوسط طبقوں میں بعض لوگوں نے انفرادی و ذاتی حیثیت سے انگریزوں کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن اجتماعی طور پر مسلمانوں کو نئی روشنی کی طرف متوجہ کرانے کا سہرا نواب عبداللطیف کے سر ہے، جنھوں نے ۱۸۶۳ء میں کلکتہ میں، محمڈن لٹریری سوسائٹی، قائم کی تاکہ اونچے اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کو انگریزی زبان و ادب کے مطالعہ کے لیے راغب کیا جائے۔ انھوں نے عوام کو متوجہ کرنے کے خیال سے اپنی تائید میں علماء کے فتوے بھی حاصل کیے۔ یہ تحریک اپنے محدود مقاصد کی بنا پر عواپ میں بہت مقبول نہیں ہوئی۔ لیکن اسے سرسید کی اس ہمہ گیر علمی، مذہبی، ثقافتی، تہذیبی اور سماجی تحریک کا پیش خیمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جسے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نشاۃ ثانیہ کی حیثیت حاصل ہے۔

سرسید نے شروعات میں سماجی اصلاحات اور حقوق کی حفاظت کی کوششوں میں ہندو اور مسلم دونوں ہی کے لیے خدمتیں انجام دیں لیکن بعد میں ان کا رجحان مسلمانون کی طرف مرکوز ہوگیا۔ جس کے تاریخی و سیاسی اسباب تھے۔ سرسید کے اصلاحات کی نوعیت شروع میں مذہبی رہی۔ انھوں نے مختلف کتابیں لکھ کر انگریزوں یا عیسائیوں کے بعض خیالات کی تردید کی، ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے دل سے ان کی نفرت ختم کرنے یا کم کرنے کے لیے مختلف طرح کے دلائل پیش کیے اور اس میں ایک طرح کی انتہا پسندی کے شکار ہوگئے۔ سرسید کے ان خیالات کو وسعت اس وقت حاصل ہوئی جب انھوں نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، جس کے مقاصد میں مشترکہ قومی مفادات شامل تھے۔ اس کے بعد ہی انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے قیام کے لیے درخواست دی، جس میں ناکام ہونے پر انھوں نے ۱۸۷۰ء میں کمیٹی خواستگان تعلیم مسلمانان، قائم کی اراعلیٰ معیار پر مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوششیں شروع کیں۔ اسی سلسلے میں

انھوں نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، قائم کیا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے نام سے مقبول ہوئی۔ یہ ادارہ مسلمانوں کے مرکزی دارالعلوم کی حیثیت حاصل کر گیا۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے رواج سے ان کی سماجی زندگی میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں اور مغرب کے اثر نے ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں فکر وعمل کی نئی راہیں کھول دیں۔

4۔ قدیم زمانے میں ہندوستان میں سیاست کو مذہب کے زیرِ سایہ ہی پرورش پانے کا موقع ملا۔ سیاست جب وسیع دائرے میں استعمال ہوتی ہے تو اخلاقی سماجی اقدار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور سیاست کی نفسیاتی توجیہ کے لیے انسانیت پسندی کو لازمی قرار دینا پڑتا ہے۔ پریم چند کو ادیب کی وسیع ذمہ داریوں کا احساس تھا جس کا مطالعہ ہم ان کی مختلف تخلیقات میں کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ادیب کو سماج و معاشرہ کا مصلح نہیں قرار دیا ہے۔ بلکہ ساتھ ہی ادب کو فرد کی ذات کے اظہار و انکشاف تک بھی محدود نہیں کیا ہے۔ پریم چند کا یہ خیال تھا کہ ادب کی بہتری میں سماج کی بہتری پوشیدہ ہے۔ انھوں نے ادب میں سیاست کے عمل کو ضروری قرار دیا تھا۔ اور اس کے اظہار کے لیے معاشرہ کے موجودہ حالات کی ترجمانی پر زور دیا تھا۔ پریم چند کے خیال میں ادیب کا سیاسی سرگرمیوں میں عملی طور پر شامل ہونا نہ صرف اچھا ہے بلکہ اس سے اس کی تخلیق کو تجربے اور خیالات کے عناصر کو پرکھنے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے۔ ادب کو سیاست کے مسائل کی تشریح کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کے ذریعہ صحیح تجزیہ و رہنمائی کی جا سکے تو بہتر صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے۔

پرانے زمانے میں ہندوستان کا سیاسی نظام طبقہ وارانہ تقسیم کی بنیاد پر برہمنوں اور چھتریوں کی نگرانی میں عمل پذیر تھا اور ملک کی دوسری قوموں کو انھیں کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ اس لیے سیاسی و ملکی مسائل کی ذمہ داری کا احساس بھی سماج کے بلند طبقے تک محدود تھا۔ مسلم بادشاہوں کے زمانے تک صرف امرا و رؤسا کو ہی سیاسی اور انتظامی معاملات میں دخل دینے کا اختیار تھا، جو بادشاہ کے حکم سے اپنے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ انھوں نے یہاں کے ملکی معاملات میں مقامی رواج اور احکام کی پابندی کی اور عوام کو کسی سیاسی انتشار کا شکار ہونے کی نوبت نہ آئی۔

موجودہ سیاسی نظام انگریزی حکومت کے ساتھ مخصوص ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے اور پھر یہاں قبضہ کر کے اپنے تجارتی مقاصد کی تکمیل کے مطابق نیا سیاسی نظام قائم کیا جو بالکل مختلف نوعیت کا تھا۔ انگریزوں نے یہاں قبضہ کرتے ہی ہندوستانی زندگی و تہذیب سے خود کو الگ رکھ کر اپنی تہذیبی و معاشرتی برتری کا اعلان کیا۔ انگریزوں نے برطانیہ کے ہی سیاسی نظام کو جو سرمایاداری کے اصولوں پر مبنی فروغ دیا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے پس منظر میں عوام کی بے اطمینانی اور پامالی کی پوری داستان ہے جس کے معاشی اور سیاسی اسباب دونوں تھے۔ انگریزوں نے پے در پے مختلف معاہدوں کی وعدہ خلافی کر کے حقوق کے غصب کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ جس کے سبب نوابوں اور رئیسوں کے ساتھ ہی کسانوں کی زمینوں کی ضبطی اور نیلامی بھی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے اپنے سیاسی احکامات کو نافذ کرنے میں ظلم جبر کا اپنا ہتھیار بنایا اور بعض دفعہ انھیں کے سہارے ہندوستانی عوام کے مقدمات کے فیصلے بھی کیے جاتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستانی عوام کی مذہبیت کا بھی مذاق اڑایا اور عیسائی مشنریوں کے قیام و عمل میں مدد کی۔ کیوں کہ یہ مشنریاں انگریزی حکومت کے قیام کو سیاسی اعتبار سے مضبوط بنانے میں مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔ اسی طرح کے بہت سے مختلف اسباب تھے جس نے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات پیدا کیے۔ اس عظیم الشان بغاوت میں گرچہ کامیابی انگریزوں کے حصے میں آئی لیکن پھر بھی وہ خوف زدہ ہو گئے اور اپنا توازن کھو بیٹھے۔ انھوں نے ظلم و جبر کے ذریعہ حالات پر قابو حاصل کیا اور ہندوستانی اقوام کے آپسی اتحاد

و بھائی چارے کو کم کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش شروع کر دی۔ ابتدا میں عہدوں اور نوکریوں کی تقسیم میں خوب زیادتی کی گئی اور ایک فرقے کو دوسرے پر ترجیح دے کر آپس میں کشیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح انگریزوں نے اس طرح ہندوستانیوں کو الجھا دیا۔ ساتھ ہی ملک کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور حکومتوں سے صلح کرنا شروع کر دیا۔ یہ تمام حکومتیں انگریزوں کی ماتحت میں تمام انتظامی اختیارات کی حامل بنا دی گئیں۔ جن کی بدولت انگریزوں کے زیرِ اثر ایک طرح کے طاقتور وفاداروں کا حلقہ تیار ہو گیا۔ لیکن ان کوششوں کے باجود ہندوستان میں انگریزوں سے نفرت اور بے اطمینانی کی فضا پھیلتی گئی۔ انھوں اپنی تہذیب وتمدن اور زبان سے متاثر کرنے کی کوشش کی لیکن اسی سے ہندوستانیوں کو ان کی کمزوریوں کا بھی احساس ہو گیا۔ اس دور میں متعدد اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں جنھوں نے سیاسی شعور اور قومی وملی جذبات کو عوام میں فروغ دیا۔

آہستہ آہستہ انگریزوں نے ایک ادارہ کا قیام کیا تا کہ سرکاری افسروں اور ان کے ماتحتوں کے مابین تعاون کی فضا ہموار ہو سکے۔ اسی مناسبت سے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی گئی جس نے بعد میں اپنے انقلابی کارناموں کے سبب ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا۔ کانگریس کی کوششوں کا مرکز انڈین سیکرٹ کونس کا خاتمہ، سرکاری ملازمت میں رعایت، ہندوستانی فوج میں تخفیف اور انتظامی اصلاحات وغیرہ تھے۔ لیکن انگریزوں نے کبھی بھی ان چیزوں کو اہمیت نہ دی۔ اس دور میں کانگریس کے اجلاس میں حکومت برطانیہ کی مدح وثنا زور وشور سے ہوتی۔ چنانچہ عوام کے علاوہ خواص میں انگریزوں کی انصاف پسندی کی تعریفیں کی جاتیں۔ یہ رجحان اس وقت بدلنا شروع ہوا جب کانگریس میں لالہ لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک، پین چند پال وغیرہ شامل ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء تک کا دور سیاسی حکومت کی جدوجہد کا دور رہا۔ اس دور میں کانگریس کے دونوں بازوؤں میں آپسی کشمکش بھی جاری رہی اور انگریزوی حکومت نے ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' (تقسیم اور حکومت) کے نظریے کے تحت ہندوستانیوں میں تفریق پیدا کرنے کی مسلسل کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کر دینا تھا۔ یہ صورت حال باقی نہ رہ سکی لیکن فرقہ وارانہ جذبات کو قوت حاصل ہوئی اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ گیا۔ مسلم لیگ اصولاً بعض معاملات میں کانگریس کے دائیں بازو کی ہم خیال تھی۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت، حاکموں سے اشتراک عمل اور ملک کی مختلف ملتوں میں خلوص کا جذبہ پیدا کرنا ان کے مقاصد میں شامل تھے۔ لیکن عملاً یہ کانگریس کی مخالفت تک محدود تھی اور نفرت کے جذبات ابھارنے کا ذریعہ بھی بنی۔ انگریزوں کے شیطانی چالوں کے ردِّعمل کے طور پر ایک انقلابی جماعت نے بھی جنم لیا، جس کا عقیدہ تھا کہ تشدد کے خاتمے کے لیے تشدد ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا طریقۂ کار عام کانگریسیوں سے مختلف تھا۔ انھوں نے اخباروں کے ذریعہ غلامی سے نفرت کے جذبات کو بیدار کیا۔ نوجوانوں کو بھرتی کر کے باغی فوجیوں کے گروہ تیار کیے، بم اور ہتھیاروں کے ذریعہ جنگی تربیت کی اور شب خون اور حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان دنوں کانگریس نے کئی طرح کے سیاسی ہچکولے برداشت کیے۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو اصلاحوں کی تائید کی، پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں سے اشتراک عمل کیا، ترکی کی خلافت کے خاتمہ پر ناراض مسلمانوں کی دل دہی کی اور رولٹ ایکٹ کی مخالف کی۔ اس دور میں کانگریس نے اپنی طاقت بہت بڑھالی جس سے انگریزوں میں عدم اعتمادی بڑھ گئی اور انھوں نے جلیان والا باغ میں لوگوں پر گولیاں چلوا دیں۔ ۱۹۱۸ء میں دائیں بازو کے کانگریسی اس سے الگ ہو گئے۔ انھوں اپنی الگ ایک لبرل پارٹی تیار کی۔ یہاں سے کانگریس کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰۔۱۹۲۷ء تک سوراج کا مطالبہ جاری رکھا۔ اس کی شروعات مہاتما گاندھی کے عدم تعاون کی تحریک سے

ہوئی۔مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانی عوام ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر ستیا گرہ کرتے رہے تو ایک سال کے اندر ہی انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔لیکن انھوں چوراچوری کے قتلِ عام سے متاثر ہوکر جلد ہی اس تحریک کو روک دیا۔کانگریس پر اس کا ردِّ عمل بہت سخت پڑا۔پنڈت موتی لعل نہرو اور لالہ لاجپت رائے نے جیل سے ہی اس کی مخالفت کی جس سے انگریزوں کو سمجھنے کا موقع ملا کہ اب مہاتما گاندھی کی ہر دل عزیزی ختم ہوگئی ہے۔چنانچہ انھوں نے انھیں چھ سال کی سزا دے کر جیل میں بند کر دیا۔اسی دوران کانگریس کے کچھ رہنماؤں نے 'کونسل میں داخلہ' کی تجویز کی،جن میں پنڈت موتی لعل نہرو اور دیش بندھو چترنجن داس اہم تھے۔کانگریس کے بعض اراکین نے اس کی مخالفت کی،لیکن جب انھوں نے 'سوراج دَل' کے نام سے الگ جماعت قائم کر لی تو ایسے کانگریسی جو گاندھی جی کے رویے سے مطمئن نہ تھے۔اس میں شامل ہو گئے۔لیکن یہ جماعت بہت دنوں تک باضابطہ عمل نہ کر سکی اور ۱۹۲۵ء میں دیش بندھو کی موت کے بعد اس کا زور گھٹ گیا۔اس دور میں ایک انگریزی کمیشن ہندوستان کے حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے آیا جو اس خیال کا حامی تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔لہٰذا اس نے تجویز رکھی کہ وہ صرف ان معاملات پر غور کر سکے گا جو دونوں میں مشترک ہوں۔چنانچہ ہندوستانیوں نے ایک مشترک تجویز پیش کی،لیکن انگریز اسے قبول نہ کر سکے۔

کانگریس کا دسمبر ۱۹۲۹ء کا اجلاس منعقدہ لاہور،ایک طرح سے ہندوستانی تاریخ میں اہم ترین حیثیت کا مالک ہے۔اس میں مہاتما گاندھی نے ملکی تحریک آزادی کو ''مکمل آزادی'' کے نصب العین سے شروع کرنے کا اعلان کیا اور کانگریس نے ایک ریزولیشن کے ذریعہ نہرو رپورٹ کی تجویزوں کو مسترد کر دیا۔اس سے فرقہ وارانہ مسائل کی سنگینی دوبارہ بڑھ گئی۔اسی زمانہ میں گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور نمک قانون کے توڑنے پر بھی زور دیا۔انگریزوں نے اس تحریک کو دبانے کے لیے تشدد کے حربے استعمال کیے اور متعدد جگہوں پر لاٹھی چارج،گولیوں اور کرفیو کا استعمال کیا گیا۔بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو لاہور سازش کے سلسلہ میں سزائے موت کا حکم دیا گیا۔حالانکہ مہاتما گاندھی ان کے موقف سے مطمئن نہ تھے،لیکن انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور سزائے موت کو سزائے عمر میں تبدیل کرنے کی سفارش کی لیکن لارڈ اِروِن نے اسے نامنظور کر دیا۔اسی دور میں مہاتما گاندھی وائسرائے کے ساتھ ایک صلح نامہ پر دستخط کیے جو تاریخ میں گاندھی اروِن پیک کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کے مطابق تمام قیدی جیل سے رہا کر دیئے گئے اور مہاتما گاندھی دوسری روا ؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے ولایت گئے۔لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انگریزوں نے عملی تعاون سے نہ صرف گریز کیا بلکہ لندن کی واپسی میں ہی انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔اسی سال حکومت نے اچھوتوں کی الگ قومیت کا اعلان کیا۔جس کی مخالفت میں مہاتما گاندھی نے جیل سے ہی ۲۱ دن کے برت کا اعلان کر دیا۔مہاتما گاندھی کو ۸ مئی ۱۹۳۳ء میں رہائی حاصل ہوئی اور حکومت نے چند اصلاحات کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پاس کیا۔اس ایکٹ نے ہندوستانی جاگیرداروں اور حکومت کے رشتے کو تقویت دی۔حکومت نے مالیات،فوج اور امور خارجہ کے معاملات کو محفوظ رکھنے کے بعد پریوی کونسل کی رکنیت کی تجویز رکھی جسے ناپسند کر دیا گیا اور ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔بعد میں قانون میں مزید ترمیم کیے گئے جس سے اس کی اہمیت اور بھی کم ہوگئی۔لیکن کچھ دن بعد کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے قبول کر لیا اور انتخاب کی سرگرمیوں میں فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوا۔

جواب نمبر 5۔ ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کے بعد اور ۵۷ کے غدر کے بعد انگریزوں نے ایک ادارہ کا قیام کیا تا کہ سرکاری افسروں اور ان کے ماتحتوں کے مابین تعاون کی فضا ہموار ہو سکے۔اسی مناسبت سے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی گئی جس

نے بعد میں اپنے انقلابی کارناموں کے سبب ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا۔ کانگریس کی کوششوں کا مرکز انڈین سیکرٹ کونس کا خاتمہ، سرکاری ملازمت میں رعایت، ہندوستانی فوج میں تخفیف اور انتظامی اصلاحات وغیرہ تھے۔ لیکن انگریزوں نے کبھی بھی ان چیزوں کو اہمیت نہ دی۔ اس دور میں کانگریس کے اجلاس میں حکومت برطانیہ کی مدح وثنا زور وشور سے ہوتی۔ چنانچہ عوام کے علاوہ خواص میں انگریزوں کی انصاف پسندی کی تعریفیں کی جاتیں۔ یہ رجحان اس وقت بدلنا شروع ہوا جب کانگریس میں لالہ لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک، بپن چند پال وغیرہ شامل ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء تک کا دور سیاسی حکومت کی جدوجہد کا دور رہا۔ اس دور میں کانگریس کے دونوں بازوؤں میں آپسی کشمکش بھی جاری رہی اور انگریزوی حکومت نے ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' (تقسیم اور حکومت) کے نظریے کے تحت ہندوستانیوں میں تفریق پیدا کرنے کی مسلسل کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کر دینا تھا۔ یہ صورت حال باقی نہ رہ سکی لیکن فرقہ وارانہ جذبات کو قوت حاصل ہوئی اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ گیا۔ مسلم لیگ اصولاً بعض معاملات میں کانگریس کے دائیں بازو کی ہم خیال تھی۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت، حاکموں سے اشتراک عمل اور ملک کی مختلف ملتوں میں خلوص کا جذبہ پیدا کرنا ان کے مقاصد میں شامل تھے۔ لیکن عملاً یہ کانگریس کی مخالفت تک محدود تھی اور نفرت کے جذبات ابھارنے کا ذریعہ بھی بنی۔ انگریزوں کے شیطانی چالوں کے ردِّعمل کے طور پر ایک انقلابی جماعت نے بھی جنم لیا، جس کا عقیدہ تھا کہ تشدد کے خاتمے کے لیے تشدد ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا طریقۂ کار عام کانگریسیوں سے مختلف تھا۔ انھوں نے اخباروں کے ذریعہ غلامی سے نفرت کے جذبات کو بیدار کیا۔ نوجوانوں کو بھرتی کر کے باغی فوجیوں کے گروہ تیار کیے، بم اور ہتھیاروں کے ذریعہ جنگی تربیت کی اور شب خون اور حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان دنوں کانگریس نے کئی طرح کے سیاسی ہچکولے برداشت کیے۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو اصلاحوں کی تائید کی، پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں سے اشتراک عمل کیا، ترکی کی خلافت کے خاتمہ پر ناراض مسلمانوں کی دل دہی کی اور رولٹ ایکٹ کی مخالف کی۔ اس دور میں کانگریس نے اپنی طاقت بہت بڑھالی جس سے انگریزوں میں عدم اعتمادی بڑھ گئی اور انھوں نے جلیان والا باغ میں لوگوں پر گولیاں چلوادیں۔ ۱۹۱۸ء میں دائیں بازو کے کانگریسی اس سے الگ ہو گئے۔ انھوں اپنی الگ ایک لبرل پارٹی تیار کی۔ یہاں سے کانگریس کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰۔۱۹۲۷ء تک سوراج کا مطالبہ جاری رکھا۔ اس کی شروعات مہاتما گاندھی کے عدم تعاون کی تحریک سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانی عوام ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر ستیا گرہ کرتے رہے تو ایک سال کے اندر ہی انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ لیکن انھوں چوراچوری کے قتلِ عام سے متاثر ہو کر جلد ہی اس تحریک کو روک دیا۔ کانگریس پر اس کا ردِّ عمل بہت سخت پڑا۔ پنڈت موتی لعل نہرو اور لالہ لاجپت رائے نے جیل سے ہی اس کی مخالفت کی جس سے انگریزوں کو سمجھنے کا موقع ملا کہ اب مہاتما گاندھی کی ہر دل عزیزی ختم ہوگئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے انھیں چھ سال کی سزا دے کر جیل میں بند کر دیا۔ اسی دوران کانگریس کے کچھ رہنماؤں نے 'کونسل میں داخلہ' کی تجویز کی، جن میں پنڈت موتی لعل نہرو اور دیش بندھو چترنجن داس اہم تھے۔ کانگریس کے بعض اراکین نے اس کی مخالفت کی، لیکن جب انھوں نے 'سوراج دَل' کے نام سے الگ جماعت قائم کر لی تو ایسے کانگریسی جو گاندھی جی کے رویے سے مطمئن نہ تھے۔ اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن یہ جماعت بہت دنوں تک باضابطہ عمل نہ کر سکی اور ۱۹۲۵ء میں دیش بندھو کی موت کے بعد اس کا زور گھٹ گیا۔ اس دور میں ایک انگریزی کمیشن ہندوستان کے حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے آیا جو اس خیال کا حامی تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔ لہٰذا اس نے تجویز رکھی کہ وہ صرف ان معاملات پر غور کر سکے گا جو دونوں میں مشترک ہوں۔ چنانچہ ہندوستانیوں

نے ایک مشترک تجویز پیش کی، لیکن انگریز اسے قبول نہ کر سکے۔

کانگریس کا دسمبر ۱۹۲۹ء کا اجلاس منعقدہ لاہور، ایک طرح سے ہندوستانی تاریخ میں اہم ترین حیثیت کا مالک ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی نے ملکی تحریک آزادی کو ''مکمل آزادی'' کے نصب العین سے شروع کرنے کا اعلان کیا اور کانگریس نے ایک ریزولیشن کے ذریعہ نہرو رپورٹ کی تجویزوں کو مسترد کر دیا۔ اس سے فرقہ وارانہ مسائل کی سنگینی دوبارہ بڑھ گئی۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور نمک قانون کے توڑنے پر بھی زور دیا۔ انگریزوں نے اس تحریک کو دبانے کے لیے تشدد کے حربے استعمال کیے اور متعدد جگہوں پر لاٹھی چارج، گولیوں اور کرفیو کا استعمال کیا گیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو لاہور سازش کے سلسلہ میں سزائے موت کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ مہاتما گاندھی ان کے موقف سے مطمئن نہ تھے، لیکن انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور سزائے موت کو سزائے عمر میں تبدیل کرنے کی سفارش کی لیکن لارڈ اِرون نے اسے نامنظور کر دیا۔ اسی دور میں مہاتما گاندھی وائسرائے کے ساتھ ایک صلح نامہ پر دستخط کیے جو تاریخ میں گاندھی ارون پیک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے مطابق تمام قیدی جیل سے رہا کر دیئے گئے اور مہاتما گاندھی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے ولایت گئے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انگریزوں نے عملی تعاون سے نہ صرف گریز کیا بلکہ لندن کی واپسی میں ہی انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اسی سال حکومت نے اچھوتوں کی الگ قومیت کا اعلان کیا۔ جس کی مخالفت میں مہاتما گاندھی نے جیل سے ہی ۱۴ دن کے برت کا اعلان کر دیا۔ مہاتما گاندھی کو ۸ مئی ۱۹۳۳ء میں رہائی حاصل ہوئی اور حکومت نے چند اصلاحات کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پاس کیا۔ اس ایکٹ نے ہندوستانی جاگیرداروں اور حکومت کے رشتے کو تقویت دی۔ حکومت نے مالیات، فوج اور امور خارجہ کے معاملات کو محفوظ رکھنے کے بعد پریوی کونسل کی رکنیت کی تجویز رکھی جسے ناپسند کر دیا گیا اور ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں قانون میں مزید ترمیم کیے گئے جس سے اس کی اہمیت اور بھی کم ہوگئی۔ لیکن کچھ دن بعد کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے قبول کر لیا اور انتخاب کی سرگرمیوں میں فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوا۔

1.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
نظم وضبط	انتظام، سرکاری یا دفتری امور کا بندوبست
آہنی گرفت	زنجیروں میں جکڑا ہوا
مستحکم	مضبوط، پائدار
سامراجی	سامراج سے منسوب، شاہی، وہ نظام حکومت جو نوآبادیات پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے قائم کیا جائے
مفاد	فائدہ، نفع، بھلائی
اعتماد	بھروسا، یقین، اعتبار، ساکھ
مفلوک الحال	غریبی محتاجی، افلاس
مقصود	آرزومندی، ارادہ

مستحکم	پائیدار، پختہ، مضبوط
بےسود	بے فائدہ
وسعت	کشادگی، ،فراخی
متوسط	درمیانی، بیچ میں واقع
معاش	رزق، روزی، روزگار
معیار	کسوٹی، پرکھ، جانچ
فرسودہ	پرانا، خستہ حال
اقتدار	حکومت، اختیار، طاقت، شان وشوکت
درہم برہم	الٹ پلٹ، تہ وبالا، منتشر، مخلوط
شیرازہ	انتظام، بندوبست، ذریعۂ اجتماع، سلسلہ
معیشت	روزگار، گزراوقات، معاشی صورتِ حال، روزی
کاشت کاری	کھیتی باڑی، کھیتی، زراعت
موروثی	وراثت، ورثہ جو حصے میں آئے، آباواجداد کا بنایا ہوا سرمایا،
رعیت داری	فرماں روائی، بادشاہ کے حکم پر رعایا کے انتظام دیکھنا
مصنوعات	بنائی ہوئی چیزیں، تیار کردہ اشیا
صنعت وحرفت	دستکاری، ہاتھ یا مشینوں سے کیا جانے والا کام
شعور	عقل، سمجھ بوجھ، کسی کام کو انجام دینے کا سلیقہ، تمیز،
احتجاج	حجت یا دلیل پیش کرنے کا عمل، ناپسندیدگی کے خلاف آواز بلند کرنا
وحشیانہ	جانوروں کی طرح، درندوں کی مانند، وحشیوں کی طرح
جابرانہ	جابر سے منسوب، سخت گیری، ظلم روا رکھنا، ظالمانہ
استحصال	ناجائز فائدہ اٹھانا، کسی حصہ دار کا حصہ ہتھیانا،
زبوں حالی	خستہ حالی، ماشی طور پر گری ہوئی حالت، مفلسی، غریبی
موہوم	وہم کیا گیا، خیالی، تصوراتی، فرضی
زراعتی	کھیتی باڑی سے متعلق
ستم ظریفی	ظرافت کے پردے میں ظلم کرنا، ہنسی ہنسی میں قیامت ڈھانا
قناعت	صبر، تھوڑی سی چیز پر رضامندی
پیش خیمہ	کسی کام کے ظہور کی حالت، پہلے پیش آنے والی حالت
انتشار	بکھراؤ، پریشاں خیالی، تفریق پیدا ہونا

فرقہ وارانہ گروہ بندی، جماعت بندی، دو جماعتوں میں تفرقہ ڈالنا

1.10 کتب برائے مطالعہ

1. قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009ء
2. مانک ٹالا، پریم چند حیاتِ نو، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1992ء
3. پرکاش چندر گپت، پریم چند (مونوگراف)، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1976ء
4. بپن چندرا، تحریک آزادی میں آزاد ہندوستان کا تصور، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 1998ء
5. بپن چندرا، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 1979ء
6. جعفر رضا، پریم چند کہانی کا رہنما، شبستان شاہ گنج، الہ آباد، 1999ء
7. ڈاکٹر صغیر افراہیم، پریم چند۔ ایک نقیب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987ء

اکائی:02 پریم چند کا عہد: سوانح، شخصیت اور حالاتِ زندگی

2.1 اغراض ومقاصد
2.2 تمہید
2.3 پریم چند کی سوانح اور حالاتِ زندگی
2.4 پریم چند کی شخصیت اور مزاج
2.5 پریم چند کے کارنامے
2.6 آپ نے کیا سیکھا
2.7 اپنا امتحان خود لیجئے
2.8 سوالات کے جوابات
2.9 فرہنگ
2.10 کتب برائے مطالعہ

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- پریم چند کی سوانحی حالات سے واقف ہوں گے۔
- پریم چند کی حالاتِ زندگی سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔
- پریم چند کی شخصیت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- پریم چند کے کارناموں کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔
- پریم چند کی سماجی اور سیاسی نظریات سے آگاہی حاصل ہوگی۔
- پریم چند کی سوانح اور شخصیت کا مکمل معلومات حاصل کرسکیں گے۔

2.2 تمہید

پریم چند نے اپنی پوری زندگی، سماج، ملک اور ادب کی خدمت میں صرف کر دی۔ جس کی دوسری مثال ہندوستانی ادب کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اپنی تیس سالہ ادبی زندگی میں انھوں نے تقریباً تین سو کہانیاں، بارہ ناول، تین ڈرامے اور سیکڑوں مضامین تحریر کئے ہیں۔ ان کے لکھنے کا مقصد ادب اور زندگی کے رشتے کو مستحکم کرنا اور اردو کے افسانوی ادب کو محل سراؤں، اور امراء کے تعیش وتفریح کے تنگ دائروں سے نکار کر اسے عوام تک پہنچانا تھا۔ انھوں نے ادب کو وسعت ورفعت اور مقصدیت وافادیت کا رنگ وآہنگ عطا کیا۔

منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ پریم چند ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس کے مڈھوالمہی گاؤں متصل پانڈے پور بنارس میں پیدا ہوئے۔ پریم چند کی عمر سات برس تھی جب ان کی والدہ آنندی دیوی کا انتقال ہوا اور ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ پریم چند کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ والد کے تبادلے کی وجہ سے گورکھپور میں ان کا داخلہ مشن اسکول میں کرایا گیا۔ حالانکہ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ پریم چند کا تعلق ایک مشترکہ اور متوسط گھرانے سے تھا۔ معاش کا ذریعہ صرف ملازمت ہی نہیں بلکہ کھتی باڑی بھی تھا۔ پریم چند نے ۱۸۹۸ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈیویژن سے پاس کیا۔ والد کے انتقال کے بعد سوتیلی ماں اور دو بھائیوں کی ذمہ داری ان پر آپڑی۔ ۱۸۹۹ء میں اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ۱۸ روپے ماہانہ پر ان کا تقرر ہو گیا۔ گورکھ پور کے قیام کے دوران پریم چند نے انگریزی ناول، داستانیں اور ابتدائی ناول نگاروں کے بیشتر ناول پڑھ لئے جس کی وجہ سے فکشن کی سوجھ بوجھ جلد ہی پیدا ہو گئی۔ پریم چند نے اکتوبر، نومبر ۱۹۱۰ء تک نواب رائے اور رائے بنارسی کے قلمی ناموں سے کہانیاں لکھیں۔ اس کے بعد ''پریم چند'' کا قلمی نام اختیار کیا۔ دسمبر ۱۹۱۰ء میں رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' پریم چند کے قلمی نام سے ہی شائع ہوا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی، تاریخ اور فارسی مضامین کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ پریم چند نے کئی رسالوں کی ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھائی اور فراق گورکھپوری کے ساتھ مل کر سرسوتی پریس بھی قائم کیا۔ اور اپنا رسالہ 'ہنس' کے نام سے بھی جاری کیا۔ پریم چند نے بمبئی کا بھی سفر کیا اور وہاں پر انھوں نے کچھ فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی وہ واپس بنارس لوٹ آئے۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ ترقی پسند تحریک کے اصولوں سے ان کی ذہنی مناسبت فطری تھی۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ جس کی صدارت کے فرائض پریم چند نے بہت اہلیت اور وقار کے ساتھ ادا کئے۔ ادب اور سماج ،ادب اور سیاست، ادب اور جمالیات جیسے پیچیدہ موضوعات پر اپنے مربوط خیالات کا اظہار کرتے ہوئے افادی ادب اور حسن کا معیار بدلنے جیسی چیزوں پر زور دیا۔ اس کانفرنس کے چند ماہ بعد ہی وہ بیمار ہو گئے اور ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اس اکائی میں ہم پریم چند کی سوانح، شخصیت اور ان کی حالاتِ زندگی کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

2.3 پریم چند کی سوانح اور حالاتِ زندگی

۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو پریم چند بنارس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں 'لمہی' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ پریم چند کے والد ڈاک خانے میں کلرک کی ملازمت کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی کا کام بھی کرتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو پریم چند معاشی لحاظ سے سماج کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا نام نواب رائے بھی تھا۔ اکثر مصنفین نے اس نام کو فرضی قرار دیا ہے۔ لیکن پروفیسر قمر رئیس نے لکھا ہے کہ یہ نام پریم چند کے چچا کا دیا ہوا

تھا جو انھیں بہت ہی پسند تھا۔ ابتدا میں پریم چند اپنے اسی قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ان کا تعلق سری واستو خاندان سے تھا جو ہندو معاشرے میں کائستھ ذات کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ ہندوستان میں اس برادری کا پیشہ ابتدا ہی سے لکھنا پڑھنا اور منشی گری رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوؤں کی جس ذات نے سب سے پہلے فارسی زبان سے اپنا تعلق استوار کیا وہ یہی ذات تھی۔ پریم چند کے بچپن میں ہی جب ان کی عمر آٹھ سال کی تھی والدہ آنندی دیوی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ والدہ کے انتقال کے بعد پریم چند اپنی دادی سے زیادہ مانوس ہو گئے تھے۔ جو انھیں ہر رات کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ اس طرح یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بچپن کی یہی سنی ہوئی کہانیوں نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا اور یہیں سے انھیں افسانے کے فن سے رغبت پیدا ہو گئی۔ اسی دلچسپی نے پریم چند کو ایک عظیم افسانہ نگار اور ناول نگار بنا دیا۔

پریم چند کے والد نے بہت جلد دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کے گھر میں آنے سے پریم چند کی زندگی نئے مسائل میں گھر گئی۔ نئی بیوی کے آنے کے بعد باپ کا رویہ اپنے پہلے بیٹے کے تئیں بدل گیا۔ اسی درمیان میں پریم چند کی دادی کا انتقال ہو گیا جس سے وہ ماں کے بعد بہت مانوس تھے۔ پریم چند کا سارا بچپن دکھ درد، محرومیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ماں اور دادی کے انتقال کے بعد وہ بے حد غمگین اور افسردہ رہنے لگے تھے۔ سوتیلی ماں کا رویہ ان کے ساتھ ہمیشہ سے ظالمانہ رہا اور والد کی شفقت و محبت سے بھی محرومی ان کا مقدر بن گئی۔ قمر رئیس نے ہنس راج رہبر کے حوالے سے لکھا ہے کہ پریم چند کو اب انھیں جوٹھے برتن ہی نہیں مانجھنے ہوتے تھے سوتیلی ماں کے بچے کو کھلانا بھی ہوتا تھا۔ پریم چند کے لڑکپن کی محرومیوں کا بیان کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کی اس زمانے کی معاشی پریشانیوں اور تنگ دستیوں کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مہینے میں بارہ آنے اسکول کی فیس دینا بھی ان کے لیے دشوار ہوتا تھا۔ سوتیلی ماں کی بدسلوکی اور غیر ہمدردانہ رویے سے انھیں کسی نیکی کی توقع نہ تھی۔ باپ کو اول تو اپنے ہی کاموں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اور اگر فرصت میسر بھی ہوتی تو انھیں نئی بیوی کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچنے کا موقع نہیں ملتا۔ پریم چند اس پیار اور شفقت سے محروم تھے جو بالعموم اس عمر میں انسان کو پریم چند کی غیر افسانوی نگارشات کا تنقیدی مطالعہ ہوتی ہے اور جو اس کی شخصیت کے فطری نشو و نما میں معاون ہوتی ہے۔'' (پروفیسر قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیتِ ناول نگار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹، ص:۳۲)

پریم چند کی ابتدائی تعلیم پانچ سال کی عمر میں مکتب سے شروع ہوئی۔ جہاں انھیں ایک مولوی صاحب فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔ اس طرح بچپن ہی میں فارسی اور اردو سے ان کا تعلق استوار ہوا۔ پریم چند جب ۱۴ رسال کے تھے اس وقت ان کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا تھا۔ یہاں کے ایک مشن اسکول میں انھیں چھٹی جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کی باقاعدہ اسکولی تعلیم کی شروعات یہیں سے ہوئی۔ تقریباً تین سال تک گورکھپور میں رہنے کے بعد پریم چند اپنے گاؤں واپس ہوے اور بنارس کے کوئنس کالج میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ پریم چند ابھی نویں جماعت میں ہی زیرِ تعلیم تھے کہ ان کے والد نے ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی کر دی جب کہ ان کی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی پریم چند کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اب اپنی بیوی، سوتیلی ماں اور اس کے دو بچوں یعنی پانچ افراد کی کفالت کی ذمے داری پریم چند کے کمزور کاندھوں پر آ پڑی۔ پریم چند وکالت کا امتحان کامیاب کر کے وکیل بننا چاہتے تھے۔ بڑے نامساعد اور صبر آزما حالات میں انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ انھوں نے نامساعد حالات کا مردانہ وار

مقابلہ کیا اور میٹرک کا امتحان دوسرے درجے میں کامیاب کیا۔ کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے لیکن ریاضی کمزور ہونے کی وجہ سے داخلہ نہ مل سکا۔

میٹرک کامیاب کرنے کے فوراً بعد پریم چند کو ایک اسکول میں اسسٹینٹ ٹیچر کی حیثیت سے عارضی طور پر ملازمت حاصل ہوئی۔ ملازمت کے دوران میں ہی ۱۹۰۲ء میں انھیں سرکاری طور پر ٹریننگ کے لیے الٰہ آباد ٹریننگ کالج بھیج دیا گیا۔ پریم چند نے جونیئر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کرلیا۔ ٹریننگ مکمل ہونے کے چند ماہ بعد پریم چند کو الٰہ آباد ماڈل اسکول کے صدر مدرس کے عہدے پر مامور کیا گیا۔

الٰہ آباد آئے ہوئے پریم چند کو تقریباً چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ مئی ۱۹۰۵ء میں ان کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔ ۱۹۰۹ء میں پریم چند ترقی پاکر ڈپٹی سب انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے مہوبہ آ گئے۔ ۱۹۱۴ء میں روہیل کھنڈ کے علاقہ ضلع بستی میں ان کا تبادلہ ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں پریم چند کا تبادلہ گورکھپور میں ہوا۔ گورکھپور میں قیام کے دوران پریم چند نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔اے کا امتحان بھی دینا چاہتے تھے لیکن مسائل کی وجہ سے نہ دے سکے۔

۱۹۲۰ء کے اواخر میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تحریک جب عروج پر تھی۔ پریم چند نے بھی اس تحریک میں دلچسپی لی۔ پریم چند کے دل میں انگریزی حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف باغیانہ جذبات پل رہے تھے لیکن ابھی یہ جذبات شعلے میں تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ پریم چند ابتدا سے ہی مہاتما گاندھی سے متاثر تھے۔ گورکھپور کے دورانِ قیام جب گاندھی جی ایک جلسے میں گورکھپور آئے تھے تو ان کی تقریر سننے کے لیے پریم چند بھی چلے گئے اور اس تقریر سے ایسے متاثر ہوئے کہ فروری ۱۹۲۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد پریم چند شدید قسم کے معاشی بحران کا شکار ہوئے۔ گزر اوقات کے لیے کچھ نہ کچھ روزگار درکار تھا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست مہاویر پرشاد پوت دار کی پارٹنرشپ میں چرخوں کی تجارت کا کام شروع کیا لیکن یہ کاروبار نہ چل سکا۔ چند ماہ بعد کانپور کے ایک اسکول ''ماروا ڑی ودیالیہ'' میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں لیکن بہت جلد ہی انھوں نے یہ ملازمت بھی ترک کر دی۔ اور لکھنؤ میں قائم گنگا پستک مالا میں بھی ملازمت کی جہاں وہ تقریباً ایک سال تک نصابی کتابوں کی تیاری کا کام کرتے رہے۔

۱۹۲۲ء میں پریم چند بنارس سے شائع ہونے والے ہندی ماہنامے ''مریادا'' کی ادارتی ذمہ داری سنبھال لی۔ یہاں پبلشنگ کے کاروبار سے واقفیت حاصل ہوئی تو انھیں اس کاروبار میں دلچسپی پیدا ہوئی اور پریم چند نے خود اس کاروبار کو شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ پریم چند ایک ایسا پبلشنگ ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جہاں سے اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع ہوں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے ۱۹۲۳ء میں بنارس میں سرسوتی پریس کے نام سے فراقؔ کی پارٹنرشپ میں پیرس قائم کیا۔ اس کاروبار میں نقصان ہوتا دیکھ کر پریم چند کے پارٹنر اپنا پیسہ لے کر علاحدہ ہوگئے۔ لیکن پریم چند نے مستقل مزاجی سے پریس کو قائم رکھا اور نقصان برداشت کرتے رہے۔

۱۹۲۹ء میں پریم چند ہندی کے مشہور رسالے ''مادھوری'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس رسالے کی ادارت کے دوران پریم چند کی مدیرانہ صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں پریم چند نے سرسوتی پریس سے ہندی ماہنامہ ''ہنس'' جاری کیا۔ اس رسالے کے جاری کرنے کے ایک سال بعد وہ ''مادھوری'' سے علاحدہ ہوگئے اور اپنے پرچے کی ترتیب و اشاعت میں پورا وقت لگانے لگے۔ بہت جلد یہ پرچہ ہندی کا مقبول اور معیاری پرچہ بن گیا۔ یہاں سے پریم چند ایک بہترین مدیر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ''ہنس'' جاری کرنے کے کچھ دن بعد پریم چند نے ہندی زبان ہی مین ایک ہفت روزہ اخبار ''جاگرن'' کے نام سے جاری کیا۔ ان پرچوں کی

اشاعت سے بھی پریم چند کو خاطر خواہ آمدنی نہ ہوئی بلکہ نقصان ہی ہوتا رہا لیکن انھوں نے پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ ان پرچوں کو جاری رکھا۔ ان پرچوں کو جاری رکھنے کا مقصد پریم چند کے نزدیک منافع کمانا نہیں بلکہ صالح ادب کا فروغ تھا۔ پریم چند نے ان رسالوں کے ذریعے بھی ملک وقوم کی خدمت اور اصلاح کا کام لیا۔ پریم چند نے اپنے اداریوں اور مضامین کے ذریعے سماجی اصلاح کا پیغام عام کیا اور جنگِ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے لیے اہلِ وطن کے دلوں میں جوش وجذبہ پیدا کیا۔

پریم چند نے رسالہ ہنس اور جاگرن کو غیر تجارتی نقطۂ نظر سے جاری کیا تھا۔ اس لیے ان پرچوں سے انھیں کوئی خاص مالی نفع حاصل نہ ہوا بلکہ یہ نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ وہ اس نقصان کو برابر برداشت کرتے رہے اس کے باوجود ان رسالوں کی اشاعت کو بند نہیں کیا۔ ۱۹۳۴ء میں بمبئی کی اجنتا سینی ٹون فلم کمپنی نے پریم چند کو معقول معاوضے پر فلمی کہانیاں لکھنے کی پیش کش کی۔ پریم چند نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور وہ بمبئی چلے گئے۔ پریم چند ایک مقصد کے ساتھ بمبئی گئے اور فلمی دنیا سے وابستگی قبول کی لیکن انھیں وہاں اپنے مقصد میں کامیابی ملتی نظر نہیں آئی۔ اصل میں پریم چند خالص ادبی انسان تھے ان کے کچھ اصول تھے جن سے وہ کسی قیمت پر بھی سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے۔ فلمی دنیا کے حالات اور وہاں کی طرزِ زندگی پریم چند کو راس نہ آئی۔ اس لیے بہت جلد ہی انھوں نے اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پریم چند کو فلمی زندگی کی بے ہودگیاں، عریانیت اور کلچر قطعی پسند نہ آیا۔ وہ فلم سے بھی سماجی اصلاح کا کام لینا چاہتے تھے۔ لیکن یہاں ہر قسم کی برائیاں موجود تھیں۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔

پریم چند کی ازدواجی زندگی:

جیسا کہ پیچھے ذکر آیا ہے کہ پریم چند کی شادی سولہ برس کی عمر میں ہی ان کے والد نے کر دی تھی جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ابتدا میں پریم چند کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہ تھی۔ ان کا اپنی پہلی بیوی سے نباہ نہ ہو سکا۔ ساس بہو میں آئے دن تکرار ہوا کرتی تھی۔ گھریلو جھگڑے اس قدر بڑھ گئے کہ پریم چند کی بیوی گھر چھوڑ کر میکے چلی گئی اور کبھی واپس نہیں آئی، پریم چند نے بھی اسے واپس لانے کی کوشش نہیں کی۔ پریم چند نے اپنی سوتیلی ماں کے مشورے اور اصرار پر دوسری شادی کر لی۔ پریم چند دوسری شادی کے لیے تیار تو ہوئے لیکن ودھوا کے ساتھ۔ چنانچہ ان کی دوسری شادی بال ودھوا سے ہوئی جس کا نام شورانی دیوی تھا۔ دراصل پریم چند ودھوا سے شادی کر کے ہندو معاشرہ میں موجود سخت اور فرسودہ روایات ورسوم کے قانون کو توڑنا چاہتے تھے۔ پریم چند کے اس جذبے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندو سماج کے فرسودہ روایات ونظام کے تئیں باغیانہ خیالات رکھتے تھے۔ پریم چند کی دوسری بیوی کے ساتھ تعلقات کافی خوشگوار رہے اور وہ ان سے بے حد خوش بھی تھے۔ شورانی دیوی نہ صرف پریم چند کی ہم مزاج تھیں بلکہ پریم چند کے مطابق وہ ادبی ذوق بھی رکھتی تھیں اور کہانیاں بھی لکھتی تھیں۔

۱۹۳۴ء میں پریم چند بمبئی تشریف لے گئے جہاں مختصر مدت کے لیے انھوں نے فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ قیامِ بمبئی کے دوران میں ان کی صحت خراب ہو گئی۔ ۱۹۳۵ء میں بمبئی سے وہ بنارس واپس آ گئے۔ لیکن صحت بدستور خراب ہی رہنے لگی۔ انھیں ہاضمے کی شکایت تھی۔ علاج ومعالجے کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں علالت نے زور پکڑا اور آخر کار ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو پریم چند نے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پریم چند نے کل ۵۶/چھپن برس کی عمر پائی۔ پریم چند کی بے وقت موت سے اردو اور ہندی دونوں ہی ادب کو جو نقصان ہوا اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پریم چند ایک عظیم تخلیق کار تھے۔ علی سردار جعفری نے پریم چند کی موت کو بے وقت کی موت قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پریم چند کی قبل از وقت موت نے اردو اور ہندی ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اور میں ان کے بارے میں وہی کہنا چاہتا ہوں جو کارل مارکس نے انگریزی شاعر شیلی کی موت پر کہا تھا۔ اگر پریم چند زندہ رہ جاتے تو وہ اس عہد کے سب سے بڑے انقلابی ادیب ہوتے۔'' (علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۲)

2.4 پریم چند کی شخصیت اور مزاج

پریم چند ایک خوددار اور بے ریا انسان تھے۔ زندگی سے متعلق ان کے کچھ اصول و آدرش تھے جس پر انھوں نے ساری زندگی گزاری۔ پریم چند کو زندگی کی آخری سانس تک اپنے اصولوں سے پیار، خدمت کی لگن اور فرض کا احساس رہا۔ وہ برے فن کار اور ادیب کے ساتھ عظیم انسان اور اعلیٰ اخلاقی صفات کے مالک تھے۔ کسی مذہب کی پیروی نہ کی لیکن دوسروں کے مذہبی جذبات کو ٹھوس نہ پہنچائی۔ ۱۹۲۳ء میں ''زمانہ'' میں انھوں نے شدھی کی تحریک کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا جس کی وجہ سے آریہ سماجی ہندو ان کے جان کے دشمن ہو گئے۔ لیکن انھوں نے کسی کی پروانہ کی۔ اسی طرح انھوں نے ہندی رسالہ ''آج'' میں مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والے کانگریسوں کا راز فاش کرنے والا مضمون لکھا تھا۔ جوابی عمل میں کاشی کے ہندوؤں نے ان کے گھر آ کر سخت احتجاج کیا اور دھمکی دی لیکن ان پر ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ دنیا ہی جھگڑے کی ہے یہاں گھبرا کر بھاگنے سے کام نہیں چلتا۔

پریم چند ہندوستان کے دیہات یعنی گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہاں کی زندگی کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا ان کے مزاج بھی وہی سادگی موجود تھی۔ وہ خوش اخلاق اور شریف النفس انسان تھے۔ پریم چند کی شرافت کے متعلق ایک واقعہ یہ ہے کہ کانپور کے قیام کے دوران ایک بنگالی اپنے آپ کو مفلس ادیب ظاہر کر کے چار پانچ سو روپے کا دھوکا دے گیا۔ پریم چند نوکروں سے برادرانہ سلوک کرتے تھے۔ ان کے نظریہ کے مطابق نوکر اور مالک ایک دوسرے کی ضرورت ہوتے ہیں۔ مالک کو کام کی اور نوکر کو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نوکر سے کبھی تحکمانہ برتاؤ نہ کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں سادگی، انسانی ہمدردی کو اہم مقام تھا۔ پریم چند ایک زندہ دل اور حساس انسان تھے لیکن اس کے باوجود دن رات کی محنت نے وقت سے پہلے ہی ان کے جسم کو کوکھلا کر دیا۔ معاشی پریشانیوں اور فرائض کے احساس نے ان کی بے پناہ قوتوں کو پسپا کر دیا۔ پریم چند ساری عمر معاشی تنگی کا شکار رہے لیکن کبھی بھی ظالم کے سامنے قصیدہ خوانی نہ کی اور نہ ہی مال و دولت کا ہوس انھیں سرگرداں رکھ سکا۔ حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۲۹ء میں پریم چند کو رائے بہادر کے خطاب سے نوازا لیکن انھوں نے اس خطاب کو قبول نہیں کیا۔ اگر وہ چاہتے تو فلمی دنیا سے مستقل وابستہ رہ کر پیسہ اور شہرت دونوں ہی حاصل کر سکتے تھے لیکن فلمی دنیا ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی اس لیے اسے بھی خیر باد کہہ دیا۔

پریم چند سادگی کا پیکر تھے۔ ان کی زندگی شہری تکلفات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی وہ جہاں بھی رہے سادہ زندگی بسر کی۔ نمود و نمائش اور ٹھاٹ باٹ سے وہ کوسوں دور تھے۔ پریم چند اپنے طلبا کے جذبات کا بھی احترام کرتے تھے اسی لیے وہ طلبا اور اپنے ساتھی اساتذہ کے درمیان بھی کافی مشہور تھے۔ جو بھی ان سے ملاقات کرتا ان کی شخصیت کی دل آویزی سے متاثر ہو جاتا تھا۔ بات بات پر بے ساختہ بلند قہقہے ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ وہ ہر ایک سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے۔ نو عمر ادیبوں سے ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتے اور اس کا حوصلہ بڑھاتے۔ اس کی نگارشات کی خوبیوں کی داد دیتے اور خامیوں کی طرف اشارہ کرتے اور کسی تلخ احساس کے بغیر

اسے مطمئن کر دیتے۔ اسی طرح بزرگوں کی فرسودہ رسم اور قدامت پسندانہ باتوں کو وہ خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ پریم چند نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا تو وہاں بھی ان کی وہی سادگی تھی۔ وہ وہاں بھی ہر شخص سے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ان شرافتِ طبیعت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ انھوں نے کبھی بھی اپنی زبانِ قلم سے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔

2.5 پریم چند کے کارنامے

پریم چند کو طالبِ علمی کے ابتدائی زمانے ہی سے مطالعے کا شوق تھا۔ انھوں نے لڑکپن ہی میں اردو کی مشہور داستانیں پڑھ دالیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی ان کے مطالعے کے ذوق میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اب انھوں نے شعروادب کے ساتھ ساتھ مذہب، فلسفہ، تاریخ اور دیگر علمی کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کیا۔ پریم چند کے ادبی ذوق نے ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب کو باہر نکالا۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز بھی ہوا۔ قیامِ کانپور کے دوران میں پریم چند کی ادبی زندگی کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ پریم چند اردو اور ہندی کے عظیم اور عہد ساز ادیب گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ہندی ادب کو مالا مال کیا ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے لکھنا شروع کیا اور اپنی وفات تک مسلسل لکھتے رہے۔ ان کی ادبی زندگی کا دورانیہ چھتیس برسوں کو محیط ہے۔ وہ بے تکان لکھتے رہے۔ نہ ان کا قلم تھکا اور نہ وہ تھکے۔ علالت اور بسترِ مرگ پر بھی ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ پریم چند کی ابتدائی تخلیقات پر رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے لیکن بعد میں انھوں نے اپنے قلم کو حقیقت نگاری کی طرف موڑ لیا۔ پریم چند نے بارہ ناول اور سینکڑوں کہانیاں لکھیں۔ مضامین، خطوط، اداریے اور حالاتِ حاضرہ پر شذرات الگ رہے۔ ''کربلا'' اور ''روحانی شادی'' کے نام سے دو ڈرامے بھی ان کی یادگار ہیں۔ پریم چند نے اس کثرت سے لکھا ہے کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو نہایت فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوی ادب کے ذریعے ہندوستان میں پھیلی ہوئی سماجی و سیاسی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک اصلاح پسند فن کار تھے۔ پریم چند ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور ساری عمر اپنے اسی نظریے کے تابع رہے۔ پریم چند اردو میں مختصر افسانے کے بانی ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے فنِ افسانہ نگاری کو بامِ عروج پر بھی پہنچایا۔ دراصل پریم چند نے اردو کے افسانوی ادب کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ وہ ایک ایسے حقیقت نگار فکشن نگار تھے جس کا کوئی ثانی اردو ادب آج تک پیش نہ کر سکا۔ پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو زبان میں کیا۔ ایک مدت تک وہ اردو ہی میں لکھتے رہے، بعد میں انھوں نے ہندی زبان میں بھی لکھنا شروع کیا۔ اس طرح وہ اردو اور ہندی کے عظیم فن کار ہیں۔

پریم چند کی تصانیف درج ذیل ہیں:

پریم چند کے ناول

اسرارِ معابد (۱۸۰۳)، ہم خرما و ہم ثواب (۱۹۰۷)، روٹھی رانی (۱۹۰۷)، جلوۂ ایثار (۱۹۱۲)، بازارِ حسن (۱۹۱۶)، گوشۂ عافیت (۱۹۲۲)، چوگانِ ہستی (۱۹۲۴)، نرملا (۱۹۲۵)، غبن (۱۹۳۱ء، میدانِ عمل (۱۹۳۲)، پردۂ مجاز (۱۹۳۴)، گئودان (۱۹۳۶)، منگل سوتر

پریم چند کے ڈرامے

۱۔سنگرام (۱۹۲۳)　　۲۔کربلا (۱۹۲۴)　　۳۔پریم کی دیوی (۱۹۳۳)

پریم چند کے افسانوی مجموعے

۱۔سوزِ وطن (۱۹۰۸)،　　۲۔پریم پچیسی جلد اول (۱۹۱۵)،　　۳۔پریم پچیسی جلد دوم (۱۹۱۸)،
۴۔پریم بتیسی جلد اول (۱۹۲۰)،　　۵۔پریم بتیسی جلد دوم (۱۹۲۰)،　　۶۔خاکِ پروانہ (۱۹۲۸)،
۷۔خواب وخیال (۱۹۲۸)،　　۸۔فردوسِ خیال (۱۹۲۹)،　　۹۔پریم چالیسی جلد اول (۱۹۳۰)،
۱۰۔پریم چالیسی جلد دوم (۱۹۳۰)　　۱۱۔آخری تحفہ (۱۹۳۴)،　　۱۲۔زادِراہ (۱۹۳۴)،
۱۳۔دودھ کی قیمت (۱۹۳۷)،　　۱۴۔واردات (۱۹۳۸)

2.6　آپ نے کیا سیکھا

- آپ نے سیکھا کہ منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ وہ ۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس کے مڈھوالمہی گاؤں متصل پانڈے پور بنارس میں پیدا ہوئے۔ پریم چند کی عمر سات برس تھی جب ان کی والدہ آنندی دیوی کا انتقال ہوا اور ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ پریم چند کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ والد کے تبادلے کی وجہ سے گورکھپور میں ان کا داخلہ مشن اسکول میں کرایا گیا۔ حالانکہ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ پریم چند کا تعلق ایک مشترکہ اور متوسط گھرانے سے تھا۔ معاش کا ذریعہ صرف ملازمت ہی نہیں بلکہ کھتی باڑی بھی تھا۔ پریم چند نے ۱۸۹۸ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ والد کے انتقال کے بعد سوتیلی ماں اور دو بھائیوں کی ذمہ داری ان پر آ پڑی۔ ۱۸۹۹ء میں اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ۱۸ روپے ماہانہ پر ان کا تقرر ہو گیا۔ گورکھ پور کے قیام کے دوران پریم چند نے انگریزی ناول، داستانیں اور ابتدائی ناول نگاروں کے بیشتر ناول پڑھ لئے جس کی وجہ سے فکشن کی سوجھ بوجھ جلد ہی پیدا ہوگئی۔ پریم چند نے اکتوبر، نومبر ۱۹۱۰ء تک نواب رائے اور رائے بنارسی کے قلمی ناموں سے کہانیاں لکھیں۔ اس کے بعد ''پریم چند'' کا قلمی نام اختیار کیا۔
- پریم چند نے بھی اپنے عہد کے بڑے تخلیق کاروں اور سیاسی و مذہبی رونماؤں کی طرح آزادی کی تحریک میں دلچسپی لی۔ پریم چند کے دل میں انگریزی حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف باغیانہ جذبات پل رہے تھے لیکن ابھی یہ جذبات شعلے میں تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ پریم چند ابتدا سے ہی مہاتما گاندھی سے متاثر تھے۔
- آپ نے دیکھا کہ پریم چند ایک خوددار اور بے ریا انسان تھے۔ زندگی سے متعلق ان کے کچھ اصول و آدرش تھے جس پر انھوں نے ساری زندگی گزاری۔ پریم چند کو زندگی کی آخری سانس تک اپنے اصولوں سے پیار، خدمت کی لگن اور فرض کا احساس رہا۔ وہ برے فن کار اور ادیب کے ساتھ عظیم انسان اور اعلیٰ اخلاقی صفات کے مالک تھے۔ کسی مذہب کی پیروی نہ کی لیکن دوسروں کے مذہبی جذبات کو ٹھوس نہ پہنچائی۔
- پریم چند کی تخلیقی زندگی کے بارے میں آپ نے پڑھا کہ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے لکھنا شروع کیا اور اپنی وفات تک مسلسل لکھتے رہے۔ ان کی ادبی زندگی کا دورانیہ چھتیس برسوں کو محیط ہے۔ وہ بے تکان لکھتے رہے۔ نہ ان کا قلم تھکا اور نہ وہ تھکے۔ علالت اور بسترِ مرگ پر بھی ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ پریم چند کی ابتدائی تخلیقات پر رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے لیکن بعد میں انھوں نے اپنے

قلم کو حقیقت نگاری کی طرف موڑ لیا۔ پریم چند نے بارہ ناول اور سینکڑوں کہانیاں لکھیں۔ مضامین، خطوط، اداریے اور حالاتِ حاضرہ پر شذرات الگ رہے۔ ''کربلا'' اور روحانی شادی'' کے نام سے دو ڈرامے بھی ان کی یادگار ہیں۔

2.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ پریم چند کی سوانحی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بتایئے؟

2۔ پریم چند کی ملازمت کے سفر کا جائزہ لیجئے۔

3۔ پریم چند کی شخصیت پر روشنی ڈالئے۔

4۔ پریم چند کی ازدواجی زندگی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجئے؟

5۔ پریم چند کے کارناموں کا بیان کیجئے؟

2.8 سوالات کے جوابات

جواب نمبر 1۔ ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو پریم چند بنارس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں 'لمہی' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ پریم چند کے والد ڈاک خانے میں کلرک کی ملازمت کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی کا کام بھی کرتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو پریم چند معاشی لحاظ سے سماج کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا نام نواب رائے بھی تھا۔ اکثر مصنفین نے اس نام کو فرضی قرار دیا ہے۔ لیکن پروفیسر قمر رئیس نے لکھا ہے کہ یہ نام پریم چند کے چچا کا دیا ہوا تھا جو انھیں بہت ہی پسند تھا۔ ابتدا میں پریم چند اپنے اسی قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ان کا تعلق سری واستو خاندان سے تھا جو ہندو معاشرے میں کائستھ ذات کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ ہندوستان میں اس برادری کا پیشہ ابتدا ہی سے لکھنا پڑھنا اور منشی گری رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوؤں کی جس ذات نے سب سے پہلے فارسی زبان سے اپنا تعلق استوار کیا وہ یہی ذات تھی۔ پریم چند کے بچپن میں ہی جب ان کی عمر آٹھ سال کی تھی والدہ آنندی دیوی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ والدہ کے انتقال کے بعد پریم چند اپنی دادی سے زیادہ مانوس ہو گئے تھے۔ جو انھیں ہر رات کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ اس طرح یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بچپن کی یہی سنی ہوئی کہانیوں نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا اور یہیں سے انھیں افسانے کے فن سے رغبت پیدا ہو گئی۔ اسی دلچسپی نے پریم چند کو ایک عظیم افسانہ نگار اور ناول نگار بنا دیا۔

پریم چند کے والد نے بہت جلد دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کے گھر میں آنے سے پریم چند کی زندگی نئے مسائل میں گھر گئی۔ نئی بیوی کے آنے کے بعد باپ کا رویہ اپنے پہلے بیٹے کے تئیں بدل گیا۔ اسی درمیان میں پریم چند کی دادی کا انتقال ہو گیا جس سے وہ ماں کے بعد بہت مانوس تھے۔ پریم چند کا سارا بچپن دکھ درد، محرومیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ماں اور دادی کے انتقال کے بعد وہ بے حد غمگین اور افسردہ رہنے لگے تھے۔ سوتیلی ماں کا رویہ ان کے ساتھ ہمیشہ سے ظالمانہ رہا اور والد کی شفقت و محبت سے بھی محرومی ان کا مقدر بن گئی۔ قمر رئیس نے ہنس راج رہبر کے حوالے سے لکھا ہے کہ پریم چند کو اب انھیں جوٹھے برتن ہی نہیں مانجھنے ہوتے تھے سوتیلی ماں کے بچے کو کھلانا بھی ہوتا تھا۔ پریم چند کی ابتدائی تعلیم پانچ سال کی عمر میں مکتب سے شروع ہوئی۔ جہاں انھیں ایک مولوی صاحب فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔ اس طرح بچپن ہی میں فارسی اور اردو سے ان کا تعلق استوار ہوا۔ پریم چند جب ۱۴ رسال کے تھے اس وقت ان کے والد کا تبادلہ

گورکھپور ہوگیا تھا۔ یہاں کے ایک مشن اسکول میں انھیں چھٹی جماعت میں داخل کرادیا گیا۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند کی باقاعدہ اسکولی تعلیم کی شروعات یہیں سے ہوئی۔تقریباً تین سال تک گورکھپور میں رہنے کے بعد پریم چند اپنے گاؤں واپس ہوے اور بنارس کے کوئنس کالج میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ پریم چند ابھی نویں جماعت میں ہی زیرِ تعلیم تھے کہ ان کے والد نے ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی کردی جب کہ ان کی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔شادی کے ایک سال بعد ہی پریم چند کے والد کا انتقال ہوگیا۔اب اپنی بیوی، سوتیلی ماں اوراس کے دو بچوں یعنی پانچ افراد کی کفالت کی ذمے داری پریم چند کے کمزور کاندھوں پر آپڑی۔ پریم چند وکالت کا امتحان کامیاب کرکے وکیل بننا چاہتے تھے۔ بڑے نامساعد اور صبر آزما حالات میں انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔انھوں نے نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور میٹرک کا امتحان دوسرے درجے میں کامیاب کیا۔کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے لیکن ریاضی کمزور ہونے کی وجہ سے داخلہ نہ مل سکا۔

میٹرک کامیاب کرنے کے فوراً بعد پریم چند کو ایک اسکول میں اسسٹینٹ ٹیچر کی حیثیت سے عارضی طور پر ملازمت حاصل ہوئی۔ ملازمت کے دوران میں ہی ۱۹۰۲ء میں انھیں سرکاری طور پر ٹریننگ کے لیے الٰہ آباد ٹریننگ کالج بھیج دیا گیا۔ پریم چند نے جونیئر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کرلیا۔ٹریننگ مکمل ہونے کے چند ماہ بعد پریم چند کو الٰہ آباد ماڈل اسکول کے صدر مدرس کے عہدے پر مامور کیا گیا۔

الٰہ آباد آئے ہوئے پریم چند کو تقریباً چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ مئی ۱۹۰۵ء میں ان کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔۱۹۰۹ء میں پریم چند ترقی پاکر ڈپٹی سب انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے مہوبہ آگئے۔۱۹۱۴ء میں روہیل کھنڈ کے علاقہ ضلع بستی میں ان کا تبادلہ ہوا۔۱۹۱۶ء میں پریم چند کا تبادلہ گورکھپور میں ہوا۔گورکھپور میں قیام کے دوران پریم چند نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ایم۔اے کا امتحان بھی دینا چاہتے تھے لیکن مسائل کی وجہ سے نہ دے سکے۔

پریم چند نے اکتوبر، نومبر ۱۹۱۰ء تک نواب رائے اور رائے بنارسی کے قلمی ناموں سے کہانیاں لکھیں۔اس کے بعد ''پریم چند'' کا قلمی نام اختیار کیا۔دسمبر ۱۹۱۰ء میں رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' پریم چند کے قلمی نام سے ہی شائع ہوا تھا۔۱۹۱۹ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی، تاریخ اور فارسی مضامین کے ساتھ بی۔اے پاس کیا۔ پریم چند نے کئی رسالوں کی ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھائی اور فراق گورکھپوری کے ساتھ مل کر سرسوتی پریس بھی قائم کیا۔اور اپنا رسالہ 'ہنس' کے نام سے بھی جاری کیا۔ پریم چند نے بمبئی کا بھی سفر کیا اور وہاں پر انھوں نے کچھ فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی وہ واپس بنارس لوٹ آئے۔۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ترقی پسند تحریک کے اصولوں سے ان کی ذہنی مناسبت فطری تھی۔ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔جس کی صدارت کے فرائض پریم چند نے بہت اہلیت اور وقار کے ساتھ ادا کئے۔ادب اور سماج، ادب اور سیاست، ادب اور جمالیات جیسے پیچیدہ موضوعات پر اپنے مربوط خیالات کا اظہار کرتے ہوئے افادی ادب اور حسن کا معیار بدلنے جیسی چیزوں پر زور دیا۔اس کانفرنس کے چند ماہ بعد ہی وہ بیمار ہوگئے اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔

جواب نمبر 2۔ پریم چند نے بڑے نامساعد اور صبر آزما حالات میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔انھوں نے نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور میٹرک کا امتحان دوسرے درجے میں کامیاب کیا۔کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے لیکن ریاضی کمزور ہونے کی وجہ سے داخلہ نہ مل سکا۔

میٹرک کامیاب کرنے کے فوراً بعد پریم چند کو ایک اسکول میں اسسٹینٹ ٹیچر کی حیثیت سے عارضی طور پر ملازمت حاصل ہوئی۔ ملازمت کے دوران میں ہی ۱۹۰۲ء میں انھیں سرکاری طور پر ٹریننگ کے لیے الٰہ آباد ٹریننگ کالج بھیج دیا گیا۔ پریم چند نے جونیئر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کرلیا۔ ٹریننگ مکمل ہونے کے چند ماہ بعد پریم چند کو الٰہ آباد ماڈل اسکول کے صدر مدرس کے عہدے پر مامور کیا گیا۔

الٰہ آباد آئے ہوئے پریم چند کو تقریباً چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ مئی ۱۹۰۵ء میں ان کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔ ۱۹۰۹ء میں پریم چند ترقی پاکر ڈپٹی سب انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے مہوبہ آ گئے۔ ۱۹۱۴ء میں روہیل کھنڈ کے علاقہ ضلع بستی میں ان کا تبادلہ ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں پریم چند کا تبادلہ گورکھپور میں ہوا۔ گورکھپور میں قیام کے دوران پریم چند نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔اے کا امتحان بھی دینا چاہتے تھے لیکن مسائل کی وجہ سے نہ دے سکے۔

۱۹۲۰ء کے اواخر میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تحریک جب عروج پر تھی۔ پریم چند نے بھی اس تحریک میں دلچسپی لی۔ پریم چند کے دل میں انگریزی حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف باغیانہ جذبات پل رہے تھے لیکن ابھی یہ جذبات شعلے میں تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ پریم چند ابتدا سے ہی مہاتما گاندھی سے متاثر تھے۔ گورکھپور کے دورانِ قیام جب گاندھی جی ایک جلسے میں گورکھپور آئے تھے تو ان کی تقریر سننے کے لیے پریم چند بھی چلے گئے اور اس تقریر سے ایسے متاثر ہوئے کہ فروری ۱۹۲۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد پریم چند شدید قسم کے معاشی بحران کا شکار ہوئے۔ گزر اوقات کے لیے کچھ نہ کچھ روزگار درکار تھا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست مہاویر پرشاد پوت دار کی پارٹنرشپ میں چرخوں کی تجارت کا کام شروع کیا لیکن یہ کاروبار نہ چل سکا۔ چند ماہ بعد کانپور کے ایک اسکول ''مارواڑی ودیالیہ'' میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں لیکن بہت جلد ہی انھوں نے یہ ملازمت بھی ترک کر دی۔ اور لکھنؤ میں قائم گنگا پستک مالا میں بھی ملازمت کی جہاں وہ تقریباً ایک سال تک نصابی کتابوں کی تیاری کا کام کرتے رہے۔

۱۹۲۲ء میں پریم چند بنارس سے شائع ہونے والے ہندی ماہنامے ''مریادا'' کی ادارتی ذمہ داری سنبھال لی۔ یہاں پبلشنگ کے کاروبار سے واقفیت حاصل ہوئی تو انھیں اس کاروبار میں دلچسپی پیدا ہوئی اور پریم چند نے خود اس کاروبار کو شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ پریم چند ایک ایسا پبلشنگ ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جہاں سے اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع ہوں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے ۱۹۲۳ء میں بنارس میں سرسوتی پریس کے نام سے فراقؔ کی پارٹنرشپ میں پیرس قائم کیا۔ اس کاروبار میں نقصان ہوتا دیکھ کر پریم چند کے پارٹنر اپنا پیسہ لے کر علاحدہ ہوگئے۔ لیکن پریم چند نے مستقل مزاجی سے پریس کو قائم رکھا اور نقصان برداشت کرتے رہے۔

۱۹۲۹ء میں پریم چند ہندی کے مشہور رسالے ''مادھوری'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس رسالے کی ادارت کے دوران پریم چند کی مدیرانہ صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں پریم چند نے سرسوتی پریس سے ہندی ماہنامہ ''ہنس'' جاری کیا۔ اس رسالے کے جاری کرنے کے ایک سال بعد وہ ''مادھوری'' سے علاحدہ ہوگئے اور اپنے پرچے کی ترتیب و اشاعت میں پورا وقت لگانے لگے۔ بہت جلد یہ پرچہ ہندی کا مقبول اور معیاری پرچہ بن گیا۔ یہاں سے پریم چند ایک بہترین مدیر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ''ہنس'' جاری کرنے کے کچھ دن بعد پریم چند نے ہندی زبان ہی مین ایک ہفت روزہ اخبار ''جاگرن'' کے نام سے جاری کیا۔ ان پرچوں کی اشاعت سے بھی پریم چند کو خاطر خواہ آمدنی نہ ہوئی بلکہ نقصان ہی ہوتا رہا۔

پریم چند نے رسالہ ہنس اور جاگرن کو غیر تجارتی نقطۂ نظر سے جاری کیا تھا۔ اس لیے ان پرچوں سے انھیں کوئی خاص مالی نفع

حاصل نہ ہوابلکیہ نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ وہ اس نقصان کو برابر برداشت کرتے رہے اس کے باوجود ان رسالوں کی اشاعت کو بند نہیں کیا۔ ۱۹۳۴ء میں بمبئی کی اجنتا سینی ٹون فلم کمپنی نے پریم چند کو معقول معاوضے پر فلمی کہانیاں لکھنے کی پیش کش کی۔ پریم چند نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور وہ بمبئی چلے گئے۔ پریم چند ایک مقصد کے ساتھ بمبئی گئے اور فلمی دنیا سے وابستگی قبول کی لیکن انھیں وہاں اپنے مقصد میں کامیابی ملتی نظر نہیں آئی۔ اصل میں پریم چند خالص ادبی انسان تھے ان کے کچھ اصول تھے جن سے وہ کسی قیمت پر بھی سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے۔ فلمی دنیا کے حالات اور وہاں کی طرزِ زندگی پریم چند کو راس نہ آئی۔ اس لیے بہت جلد ہی انھوں نے اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

جواب نمبر 3۔ پریم چند ایک خوددار اور بے ریا انسان تھے۔ زندگی سے متعلق ان کے کچھ اصول و آدرش تھے جس پر انھوں نے ساری زندگی گزاری۔ پریم چند کو زندگی کی آخری سانس تک اپنے اصولوں سے پیار، خدمت کی لگن اور فرض کا احساس رہا۔ وہ بڑے فن کار اور ادیب کے ساتھ عظیم انسان اور اعلیٰ اخلاقی صفات کے مالک تھے۔ کسی مذہب کی پیروی نہ کی لیکن دوسروں کے مذہبی جذبات کو ٹھوس نہ پہنچائی۔ ۱۹۲۳ء میں ''زمانہ'' میں انھوں نے شدھی کی تحریک کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا جس کی وجہ سے آریہ سماجی ہندو ان کے جان کے دشمن ہو گئے۔ لیکن انھوں نے کسی کی پروا نہ کی۔ اسی طرح انھوں نے ہندی رسالہ ''آج'' میں مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والے کانگریسوں کا راز فاش کرنے والا مضمون لکھا تھا۔ جوابی عمل میں کاشی کے ہندوؤں نے ان کے گھر آ کر سخت احتجاج کیا اور دھمکی دی لیکن ان پر ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ دنیا ہی جھگڑے کی ہے یہاں گھبرا کر بھاگنے سے کام نہیں چلتا۔

پریم چند ہندوستان کے دیہات یعنی گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہاں کی زندگی کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا ان کے مزاج بھی وہی سادگی موجود تھی۔ وہ خوش اخلاق اور شریف النفس انسان تھے۔ پریم چند کی شرافت کے متعلق ایک واقعہ یہ ہے کہ کانپور کے قیام کے دوران ایک بنگالی اپنے آپ کو مفلس ادیب ظاہر کر کے چار پانچ سو روپے کا دھوکا دے گیا۔ پریم چند نوکروں سے برادرانہ سلوک کرتے تھے۔ ان کے نظریہ کے مطابق نوکر اور مالک ایک دوسرے کی ضرورت ہوتے ہیں۔ مالک کو کام کی اور نوکر کو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نوکر سے کبھی تحکمانہ برتاؤ نہ کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں سادگی، انسانی ہمدردی کو اہم مقام تھا۔ پریم چند ایک زندہ دل اور حساس انسان تھے لیکن اس کے باوجود دن رات کی محنت نے وقت سے پہلے ہی ان کے جسم کو کھلا کر دیا۔ معاشی پریشانیوں اور فرائض کے احساس نے ان کی بے پناہ قوتوں کو پسپا کر دیا۔ پریم چند ساری عمر معاشی تنگی کا شکار رہے لیکن کبھی بھی ظالم کے سامنے قصیدہ خوانی نہ کی اور نہ ہی مال و دولت کا ہوس انھیں سرگرداں رکھ سکا۔ حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۲۹ء میں پریم چند کو رائے بہادر کے خطاب سے نوازا لیکن انھوں نے اس خطاب کو قبول نہیں کیا۔ اگر وہ چاہتے تو فلمی دنیا سے مستقل وابستہ رہ کر پیسہ اور شہرت دونوں ہی حاصل کر سکتے تھے لیکن فلمی دنیا ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی اس لیے اسے بھی خیر باد کہہ دیا۔

پریم چند سادگی کا پیکر تھے۔ ان کی زندگی شہری تکلفات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی وہ جہاں بھی رہے سادہ زندگی بسر کی۔ نمود و نمائش اور ٹھاٹ باٹ سے وہ کوسوں دور تھے۔ پریم چند اپنے طلبا کے جذبات کا بھی احترام کرتے تھے اسی لیے وہ طلبا اور اپنے ساتھی اساتذہ کے درمیان بھی کافی مشہور تھے۔ جو بھی ان سے ملاقات کرتا ان کی شخصیت کی دل آویزی سے متاثر ہو جاتا تھا۔ بات بات پر بے ساختہ بلند قہقہے ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ وہ ہر ایک سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے۔ نو عمر ادیبوں سے ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتے اور اس کا حوصلہ بڑھاتے۔ اس کی نگارشات کی خوبیوں کی داد دیتے اور خامیوں کی طرف اشارہ کرتے اور کسی تلخ احساس کے بغیر

اسے مطمئن کر دیتے۔ اسی طرح بزرگوں کی فرسودہ رسم اور قدامت پسندانہ باتوں کو وہ خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ پریم چند نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا تو وہاں بھی ان کی وہی سادگی تھی۔ وہ وہاں بھی ہر شخص سے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ان شرافتِ طبیعت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ انھوں نے کبھی بھی اپنی زبانِ قلم سے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔

جواب نمبر 4۔ پریم چند کی شادی سولہ برس کی عمر میں ہی ان کے والد نے کر دی تھی جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ابتدا میں پریم چند کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہ تھی۔ ان کا اپنی پہلی بیوی سے بناہ نہ ہو سکا۔ ساس بہو میں آئے دن تکرار ہوا کرتی تھی۔ گھریلو جھگڑے اس قدر بڑھ گئے کہ پریم چند کی بیوی گھر چھوڑ کر میکے چلی گئی اور کبھی واپس نہیں آئی، پریم چند نے بھی اسے واپس لانے کی کوشش نہیں کی۔ پریم چند نے اپنی سوتیلی ماں کے مشورے اور اصرار پر دوسری شادی کر لی۔ پریم چند دوسری شادی کے لیے تیار تو ہوئے لیکن ودھوا کے ساتھ۔ چنانچہ ان کی دوسری شادی بال ودھوا سے ہوئی جس کا نام شورانی دیوی تھا۔ دراصل پریم چند ودھوا سے شادی کر کے ہندو معاشرہ میں موجود سخت اور فرسودہ روایات ورسوم کے قانون کو توڑنا چاہتے تھے۔ پریم چند کے اس جذبے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندو سماج کے فرسودہ روایات ونظام کے تئیں باغیانہ خیالات رکھتے تھے۔ پریم چند کی دوسری بیوی کے ساتھ تعلقات کافی خوشگوار رہے اور وہ ان سے بے حد خوش بھی تھے۔ شورانی دیوی نہ صرف پریم چند کی ہم مزاج تھیں بلکہ پریم چند کے مطابق وہ ادبی ذوق بھی رکھتی تھیں اور کہانیاں بھی لکھتی تھیں۔

۱۹۳۴ء میں پریم چند بمبئی تشریف لے گئے جہاں مختصر مدت کے لیے انھوں نے فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ قیامِ بمبئی کے دوران میں ان کی صحت خراب ہوگئی۔ ۱۹۳۵ء میں بمبئی سے وہ بنارس واپس آ گئے۔ لیکن صحت بدستور خراب ہی رہنے لگی۔ انھیں ہاضمے کی شکایت تھی۔ علاج ومعالجے کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں علالت نے زور پکڑا اور آخر کار ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو پریم چند نے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پریم چند نے کل ۵۶/چھپن برس کی عمر پائی۔ پریم چند کی بے وقت موت سے اردو اور ہندی دونوں ہی ادب کو جو نقصان ہوا اس کی تلافی ممکن نہیں۔

جواب نمبر 5۔ پریم چند کو طالبِ علمی کے ابتدائی زمانے ہی سے مطالعے کا شوق تھا۔ انھوں نے لڑکپن ہی میں اردو کی مشہور داستانیں پڑھ ڈالیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی ان کے مطالعے کے ذوق میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اب انھوں نے شعر وادب کے ساتھ ساتھ مذہب، فلسفہ، تاریخ اور دیگر علمی کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کیا۔ پریم چند کے ادبی ذوق نے ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب کو باہر نکالا۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز بھی ہوا۔ قیامِ کانپور کے دوران میں پریم چند کی ادبی زندگی کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ پریم چند اردو اور ہندی کے عظیم اور عہد ساز ادیب گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ہندی ادب کو مالا مال کیا ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے لکھنا شروع کیا اور اپنی وفات تک مسلسل لکھتے رہے۔ ان کی ادبی زندگی کا دورانیہ چھتیس برسوں کو محیط ہے۔ وہ بے تکان لکھتے رہے۔ نہ ان کا قلم تھکا اور نہ وہ تھکے۔ علالت اور بسترِ مرگ پر بھی ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ پریم چند کی ابتدائی تخلیقات پر رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے لیکن بعد میں انھوں نے اپنے قلم کو حقیقت نگاری کی طرف موڑ لیا۔ پریم چند نے بارہ ناول اور سینکڑوں کہانیاں لکھیں۔ مضامین، خطوط، اداریے اور حالاتِ حاضرہ پر شذرات الگ رہے۔ ''کربلا'' اور ''روحانی شادی'' کے نام سے دو ڈرامے بھی ان کی یادگار ہیں۔ پریم چند نے اس کثرت سے لکھا ہے کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو نہایت فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوی ادب کے

ذریعے ہندوستان میں پھیلی ہوئی سماجی وسیاسی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک اصلاح پسند فن کار تھے۔ پریم چند ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور ساری عمر اپنے اسی نظریے کے تابع رہے۔ پریم چند اردو میں مختصر افسانے کے بانی ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے فنِ افسانہ نگاری کو بامِ عروج پر بھی پہنچایا۔ دراصل پریم چند نے اردو کے افسانوی ادب کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ وہ ایک ایسے حقیقت نگار فکشن نگار تھے جس کا کوئی ثانی اردو ادب آج تک پیش نہ کر سکا۔ پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو زبان میں کیا۔ ایک مدت تک وہ اردو ہی میں لکھتے رہے، بعد میں انھوں نے ہندی زبان میں بھی لکھنا شروع کیا۔ اس طرح وہ اردو اور ہندی کے عظیم فن کار ہیں۔

پریم چند کی تصانیف درج ذیل ہیں:

پریم چند کے ناول

اسرار معابد (۱۸۰۳)، ہم خرما وہم ثواب (۱۹۰۷)، روٹھی رانی (۱۹۰۷)، جلوۂ ایثار (۱۹۱۲)، بازارِ حسن (۱۹۱۶)، گوشۂ عافیت (۱۹۲۲)، چوگانِ ہستی (۱۹۲۴)، نرملا (۱۹۲۵)، غبن (۱۹۳۱) میدانِ عمل (۱۹۳۲)، پردۂ مجاز (۱۹۳۴)، گئودان (۱۹۳۶)، منگل سوتر

پریم چند کے ڈرامے

۱۔ سنگرام (۱۹۲۳) ۲۔ کربلا (۱۹۲۴) ۳۔ پریم کی دیوی (۱۹۳۳)

پریم چند کے افسانوی مجموعے

۱۔ سوزِ وطن (۱۹۰۸)، ۲۔ پریم پچیسی جلد اول (۱۹۱۵)، ۳۔ پریم پچیسی جلد دوم (۱۹۱۸)، ۴۔ پریم بتیسی جلد اول (۱۲۰)، ۵۔ پریم بتیسی جلد دوم (۱۹۲۰)، ۶۔ خاکِ پروانہ (۱۹۲۸)، ۷۔ خواب وخیال (۱۹۲۸)، ۸۔ فردوسِ خیال (۱۹۲۹)، ۹۔ پریم چالیسی جلد اول (۱۹۳۰)، ۱۰۔ پریم چالیسی جلد دوم (۱۹۳۰) ۱۱۔ آخری تحفہ (۱۹۳۴)، ۱۲۔ زادِ راہ (۱۹۳۴)، ۱۳۔ دودھ کی قیمت (۱۹۳۷)، ۱۴۔ واردات (۱۹۳۸)

2.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
مقصود	آرزومندی، ارادہ
مستحکم	پائیدار، پختہ، مضبوط
تعیش	عیش پرستی، عیش وعشرت
تفریح	مسرت، مذاق، اطمینان
بےسود	بے فائدہ
وسعت	کشادگی،، فراخی
رفعت	بلندی، اونچائی، عروج
متصل	ملا ہوا، قریب، نزدیک

متوسط	درمیانی، بیچ میں واقع
معاش	رزق، روزی، روزگار
معیار	کسوٹی، پرکھ، جانچ
افادی	فائدہ مند، نفع بخش
عارضی	غیر مستقل، چندروزہ، وقتی
مدرس	استاد، پڑھانے والا
فرسودہ	پرانا، خستہ حال
تخلیق کار	فن پارہ کو تحریر کرنے والا
مفلس	غریب، کمزور
بے ریا	جس کے اندر دکھاوا نہ ہو
مفصل	تفصیل کے ساتھ، واضح کرنا
شریف النفس	نیک طبیعت والا
ملازمت	نوکری
سوانح	حالاتِ زندگی، کسی کی مکمل زندگی کے بارے میں لکھی گئی تحریر

2.10 کتب برائے مطالعہ

1. قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009ء
2. مانک ٹالا، پریم چند حیاتِ نو، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1992ء
3. پرکاش چندر گپت، پریم چند (مونوگراف)، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1976ء
4. امرت رائے (مترجم، بلراج مین را) نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، 1981ء
5. ڈاکٹر قمر رئیس، منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1983ء
6. جعفر رضا، پریم چند کہانی کار رہنما، شبستان شاہ گنج، الہ آباد، 1999ء
7. ڈاکٹر صغیر افراہیم، پریم چند۔ ایک نقیب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987ء

اکائی: 03 پریم چند کے عہد کی قومی اور اصلاحی تحریکیں

3.1 اغراض ومقاصد
3.2 تمہید
3.3 پریم چند کے عہد کی مختلف اصلاحی مذہبی وسماجی تحریکیں
3.4 پریم چند کا عہد اور علی گڑھ تحریک
3.5 پریم چند اور آریہ سماج کی تحریک
3.6 پریم چند اور ترقی پسند تحریک
3.7 آپ نے کیا سیکھا
3.8 اپنا امتحان خود لیجئے
3.9 سوالات کے جوابات
3.10 فرہنگ
3.11 کتب برائے مطالعہ

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- پریم چند کے عہد میں ہونے والی اصلاحی تحریکوں سے واقف ہوں گے۔
- پریم چند کے عہد کی اصلاحی تحریکوں کے ذریعہ ہونے والی تبدیلی سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔
- پریم چند کے عہد کی قومی بیداری کا جائزہ لے سکیں گے۔
- پریم چند کے عہد میں ہونے والی قومی تحریکوں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- پریم چند کا اپنے عہد کی اصلاحی وقومی تحریکوں سے کیا سروکار رہا اس کے بارے میں آگاہی حاصل ہوگی۔
- پریم چند کے عہد کی اصلاحی وقومی تحریکوں کا مجموعی طور پر جائزہ لے سکیں گے۔

3.2 تمہید

پریم چند اپنے عہد کے ایک مشہور مفکر، ادیب و فنکار تھے۔ پریم چند بھی اپنے عہد و ماحول کے پروردہ تھے۔ وہ اپنے آس پاس کے حالات و واقعات سے اپنی تخلیقات کا تانا بانا تیار کرتے تھے۔ اسی لیے پریم چند کی شخصیت اور ان کے فن پارے کا جائزہ لینے کے لیے ان کے عہد کے تاریخی پس منظر کی معلومات ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر پریم چند جو بیک وقت عظیم فنکار ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار بھی تھے ان کی عظمت و شہرت کے پیچھے کارفرما عوامل و محرکات کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے عہد اور ماحول کے قومی و سیاسی تحریکوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ جس میں ان کے فکری ارتقاء کی منزلوں کا اندازہ بھی ہوگا۔

پریم چند نے اپنی کہانیوں کا مواد براہِ رات اپنے عہد کی زندگی سے ہی لیا ہے۔ ان کے فن کے ہر گوشے پر زندگی کے حقائق کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی و سیاسی زندگی کا قافلہ جس سمت گامزن تھا اور جن منزلوں پر وہ ٹھہرا اس کے ثبوت ہمیں پریم چند کی تخلیقات میں واضح نظر آتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان معاشرت اور فکر و شعور کے اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اس اکائی میں ہم پریم چند کے عہد میں ہونے والی قومی و اصلاحی تحریکوں کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

3.3 پریم چند کے عہد میں مختلف اصلاحی، مذہبی و سماجی تحریکیں

پریم چند کا تعلق ہندوستان کی تاریخ کے اس دور سے ہے جب ہندوستانی سیاست اور معاشرہ پر برطانوی نوآبادیاتی نظام پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور جس کے سبب یہاں کی سیاسی سماجی معاشی زندگی تغیر و تبدل سے دوچار تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سیاست پر برطانوی نوآبادیاتی نظام کی گرفت اور بھی زیادہ مستحکم ہو جاتی ہے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں پر بھی انگریزوں کا تسلط و تصرف قائم ہو جاتا ہے، انگریزی دورِ حکومت میں صرف سیاسی اقتدار ہی نہیں غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آیا بلکہ معاشی و معاشرتی زندگی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں معاشی رشتے بھی بدلے اور عدالتی و انتظامی سانچہ بھی تبدیل ہوا۔ گاؤں کی خودمختار معاشی زندگی بھی تہہ و بالا ہوئی اور دیسی صنعتیں کرگھے اور چرخے بھی برباد ہوئے ریلوے لائنوں اور ٹیلی فون کے تاروں کا جال ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیل گیا۔ سمندر میں کشتیوں کی جگہ کوئلے سے چلنے والے جہازوں نے لے لی اور ہندوستانی بازاروں میں برطانوی کارخانوں کی بنی ہوئی اشیاء نے دیسی سامانوں کی کھپت کے مواقع رفتہ رفتہ کم کر دیئے۔ گاؤں میں جاگیردار اور چھوٹے بڑے کسان کھیت مزدور، سودخور اور بنئے پیدا ہوئے شہروں میں بورژوازی طبقہ دلال سوداگر اور نیا متوسط (سرکاری اور غیر سرکاری) صنعت کار اور مزدور پیدا ہوئے۔

قرونِ وسطیٰ کے تعلیمی نظام کی جگہ اب انگریزی تعلیم کی افادیت اور ضرورت بڑھ گئی مغربی علوم و فنون افکار و خیالات ادب و فلسفہ جمہوری اقدار اور جدید تعلیم سے افراد روشناس ہوئے مذہبی و سماجی اصلاح و احیاء کی تحریکیں وجود میں آئیں ہندوستانی متوسط طبقہ نے اپنی فلاح و بہبود کے کے لیے معاشرتی، مذہبی و اصلاحی تحریکوں سے سیاسی تحریک کی طرف رخ کیا۔ اصلاح کی تحریکیں سب سے پہلے مشرقی ہندوستان (بنگال، اڑیسہ، مشرقی بہار) میں شروع ہوئیں جہاں پر برطانوی اقتدار سب سے پہلے قائم ہوا، جس سے یہاں کے لوگ براہِ راست متاثر ہوئے تھے۔ مختلف سماجی و سیاسی اصلاح کی تحریکیں اس علاقہ سے اٹھ کر ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلتی ہیں یہیں سے راجہ رام موہن رائے جیسے انسان نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ برطانوی فتوحات کے اثرات دھیرے دھیرے پورے ملک پر پڑے انھیں

اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستانی عوام نے سماج کو سدھارنے اور جدید بنانے کی بنیاد رکھنے کے لیے سماج کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا اور انیسویں صدی کے دوران کئی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، ان تحریکوں نے وطن پرستی کے جذبہ کی نشو ونما اور ملک کی آزادی اور سماج کی تعمیرِ نو کے مقاصد حامل تحریکوں کے لیے بھی راہ ہموار کی، اس تحریک میں راجہ رام موہن رائے مرکزی شخصیت کے مالک تھے، جنھیں جدید ہندوستان کا معمار کیا گیا ہے، ان کا سب سے اہم کارنامہ ستی کی رسم کے خلاف محاذ آرا ہونا اور حکومت وقت سے اس پر پابندی عائد کرنا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے معاشرہ میں عورت اور بیوہ کی حالت کو سدھارنے اور فرسودہ سماجی و مذہبی رسم و رواج کو ترک کرنیکی ترغیب دی اور جدید تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔

راجہ رام موہن رائے نے اصلاحی مقاصد کی تکمیل کے لیے ۱۸۲۸ء میں ''برہموسماج'' کی بنیاد ڈالی اور مذہبی تعطل قدامت پسندی اور تنگ نظری کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سبھی مذاہب اور انسانیت کے لیے ایک خدا کا پرچار کیا، انھوں نے مذہب کے تئیں عقلی انداز فکر اختیار کرنے پر زور دیا اور لوگوں کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ ان کی اس تحریک کا اثر خاص طور پر نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ پر بہت زیادہ ہوا اور نوجوان طبقے نے مذہبی اصلاح کی سرگرمیوں میں حصہ بھی لیا، انھوں نے مذہبی سدھار کے علاوہ سماجی اصلاحات کی طرف بھی توجہ کی اور سماج میں پھیلے ذات پات کے نظام کو غیر انسانی قرار دے کر اس کی بنیادوں پر حملہ کیا، انھوں نے بچپن کی شادی کو بھی ختم کرنیکی مہم چلائی، عورتوں کو مساوی حقوق دلانے، بیواؤں کی دوسری شادی کرنے نیز جائیداد پر بھی عورتوں کے حقوق کی وکالت کی، ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ستی کی رسم ختم کرانے کے لیے لارڈ ولیم بینٹک کے عہد میں ایک قرارداد پیش کی گئی جس کو قانونی شکل ملی۔

راجہ رام موہن رائے کو سماج کے کچھ قدامت پسندوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ جدید تعلیم کے بھی حامی تھے۔ ان کی کوششوں کے ہی نتیجہ میں ''ہندو کالج'' کا قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے لارڈ میکالے کی بھی حمایت کی بعد کے دقتوں میں تو آپ نے اپنی تمام تر کوششیں جدید علوم کے فروغ اور ہندوستانی سماج کو جدید بنانے کی طرف صرف کر دیں۔

راجہ رام موہن رائے کی قائم کردہ تنظیم ''برہموسماج'' ہندوستان کو نئے سرے سے تشکیل دینے اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی پہلی کوشش تھی، ان کے بعد اس کام کو ''دیویندرناتھ ٹیگور'' اور ''کیشب چندسین'' جیسی روشن خیال شخصیتوں نے پورے ملک میں پھیلایا، ملک کے مختلف حصوں میں اس تنظیم کی شاخیں قائم ہوئیں، جس کے ذریعہ بعض اہم سماجی اصلاحات عمل میں آئیں۔ کشیب چندرسین نے ''برہموسماج'' میں شامل ہونے کے بعد اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے جس کے ذریعہ یہ تحریک لوگوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر گئی۔ مذہب کی تبلیغ کے لیے انھوں نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ انھوں نے بہت سی دوسری تنظیمیں مثلاً ''گڈول فریٹرنٹی سوسائٹی''، ''برہمو ہندوسماج'' اور ''پرہموودیالے'' وغیرہ قائم کیا۔ راجہ رام موہن رائے کی طرح آپ نے بھی معاشرے کی اصلاح پر زور دیا، پردہ کے رواج کو ختم کرنے بیواؤں کی شادی اور مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیان کا سلسلہ قائم کرنے کی وکالت کی، وہ عورتوں کی تعلیم کے بھی حمایتی تھے، انھوں نے لڑکیوں کی کم سنی کی شادی اور کثرت ازدواج کے خاتمہ پر زور دیا، انھوں نے ۱۹۶۰ء میں ''سنگت سبھا'' قائم کی۔ قدامت پسندوں سے اختلاف کی بنیاد پر انھوں نے برہموسماج سے الگ ہو کر ''برہموسبھا آف انڈیا'' کی تشکیل کی اور قدیم ہندو لیٹریچر کی تفسیر اور تراجم شائع کر کے ہندو مذہب کی وحدانیت پر زور دیا۔

اس طرح کی دیگر مذہبی و سماجی اصلاح کی تحریکیں ملک کے مختلف حصوں میں شروع ہو گئیں، بنگال کے علاوہ جس دوسرے حصہ

میں اصلاح کی آواز اٹھائی گئی وہ مغربی ہندوستان تھا، جہاں مختلف تحریکوں اور تنظیموں نے عورتوں کی تعلیم، بیواؤں کی دوسری شادی اور شادی کی عمر کی حد بڑھانے ذات پات کی پابندیوں کے سلسلے میں بہت اہم خدمات انجام دی ہیں، ان اصلاحی تحریکات کی سرگرمیوں کا ہی اثر تھا کہ کچھ ہی بعد سارے ملک میں اس طرح کی تحریکیں عام ہوگئیں اور ہر طرف بیداری کے آثار نظر آنے لگے، ۱۸۶۷ء میں بمبئی میں ''پرارتھنا سماج'' کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ہندوستان میں پھیلی ہوئی برائیوں کو ختم کرنا تھا مہادیو گووندرانا ڈے جیسے لوگوں کی شمولیت کے ساتھ یہ تحریک سیکولر تنظیم کی حیثیت سے کام کرتی رہی اور ہندو سماج کی اصلاح وجدید کاری پر زور دیتی رہی۔

اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں سماجی اصلاح کی ایک اور تحریک سوامی دیانند سرسوتی کی سرکردگی میں پھل پھول رہی تھی۔ آپ نے ہندو مذہب کی اصلاح کے لیے ویدوں کی جانب رجوع کیا۔ آپ نے بچپن کی شادی کو ویدوں کے منافی قرار دے کر اس کے خلاف آواز اٹھائی آپ نے دوسرے مذاہب میں رائج غلط روایات کی بھی مذمت کی اور ایک نئے انداز سے ویدوں کی تفسیر کی اور ہندو مذہب کو قدیم ویدوں کے عہد کی طرح پاک وصاف کرنے کی کوشش کی وحدانیت کی تبلیغ اور یہ ثابت کیا کہ ویدوں میں ذات پات کی کوئی تفریق نہیں تھی۔

شمالی ہند کی یہ پہلی تحریک تھی جس نے مذہب پر تنقید کرتے ہوئے اپنی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا۔ اس تحریک کی سب سے نمایاں کامیابی تعلیم کے میدان میں ہوئی جس نے ملک بھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے لاتعداد اسکول اور کالج کھلوائے اور ہندی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اس کے علاوہ ہندوؤں کو شک وشبہات سے نجات دلانے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ سی ایف اینڈریوز، نے اسے ہندوستان کی پہلی عوامی تحریک سے تعبیر کیا ہے۔

اسی عہد میں بنگال میں ایک دوسری اصلاحی تحریک ''رام کرشن پرم ہنس'' نے ہندو مذہب اور سماج میں پھیلی ہوئی برائی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے وحدانیت کے فلسفے اور بھگتی مارگ پر زور دیا بعد میں اس تحریک کو ''سوامی ویویکانند'' نے آگے بڑھایا آپ نے اپنے مشن کو پھیلانے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں ادارے قائم کئے۔ آپ نے اسی مقصد کے تحت بیرونی ممالک کا دورہ بھی کیا، ساتھ ہی مسلمان صوفیوں اور راہبوں کی صحبت بھی اختیار کی۔ ۱۸۸۶ء میں رام کرشن قائم کر کے اپنے تعلیم کا پرچار کیا۔ سوامی ویویکانند نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران ہندو فلسفہ کو دنیا کے سامنے آفاقی پیغام کے صورت میں پیش کیا۔ آپ نے یہ دلیل دی کہ ویدانت صرف ہندوؤں کا مذہب نہیں ہے بلکہ تمام عالم انسان کا مذہب ہے۔ سوامی جی کی تعلیم نے ایک بہت بڑے طبقے کو متاثر کیا اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں بھی مذہبی وسماجی اصلاح کی تحریکیں شروع ہوئیں مثلاً ''تھیوسوفیکل سوسائٹی'' کا قیام بمبئی میں عمل میں آیا۔ جس نے پارسیوں میں اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ایک بڑے طبقہ کو متاثر بھی کیا۔

3.4 پریم چند کا عہد اور علی گڑھ تحریک

مذہبی وسماجی اصلاح کی یہ تحریکیں دوسرے مذاہب میں بھی شروع ہوئیں۔ کیوں کہ مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی بلکہ بعض اعتبار سے تو ان کے مسائل اور بھی زیادہ پیچیدہ تھے، سیاسی اقتدار ختم ہو جانے کے بعد مسلم طبقہ خاص طور پر اثر انداز ہوا۔ کیوں کہ انگریزوں کو اقتدار حاصل کرنے کے لیے مسلم حکمراں سے ہی جنگ کرنی پڑی، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں

انگریزوں کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو ہی خاص طور پر نشانہ بنایا گیا، جب یہ بغاوت ختم ہوگئی تو برطانوی حکمران نے مسلمانوں کو ہی بغاوت کا ذمہ دار قرار دے کر ان پر سخت مظالم ڈھائے۔ مسلم مخالف پالیسی اختیار کی اور ہر طرح سے مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کی، چنانچہ ان حالات میں کچھ روشن خیال لوگوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ کی کیوں کہ مسلم معاشرہ بھی بعض مذہبی اور بعض انگریز مخالفت کی وجہ سے جدید علوم سے بے زار تھا۔ جب کہ دوسرے مذاہب میں جدید علوم کی طرف رجحان بڑھا تھا چنانچہ ان تحریکوں نے مسلم معاشرہ کو جدید تعلیم فراہم کرنے پردے کے رواج اور کثرتِ ازدواج کے خلاف مہم شروع کی اور نیز نئے خیالات کی روشنی میں مذہب کی تشریح کی ان میں سے کچھ تحریکوں نے اپنے آپ کو جدید تعلیم کی توسیع اور اصلاحات کے لیے وقف کر دیا نیز کچھ تحریکیں برطانوی حکومت کے خلاف سیاسی مخالفت کے لیے قائم ہوئیں۔ ان تحریکوں نے عوام کو تبدیلی کی ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں نواب عبداللطیف نے بنگال میں ۱۸۶۳ء میں انگریزی زبان نیز جدید تعلیم کے حق میں ایک ادبی سوسائٹی ''محمڈن لیٹریری سوسائٹی'' قائم کی جس نے بنگال میں کئی علمی ادارے قائم کئے۔

مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کرنے اور نئی تاریخی قوتوں اور زندگی کے لیے نئے تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا درس دینے کے لیے کئی تحریکیں سامنے آئیں ''احمدیہ تحریک'' اور دارالعلوم دیوبند'' وغیرہ اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں قدیم دلی کالج نے بھی مسلمانوں کے اندر نئے رجحان کو فروغ دینے میں بہت نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں مسلمانوں میں اصلاح سے متعلق سب سے زبردست اور حیرت انگیز کام سرسید احمد خاں نے شروع کیا، جس کو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے بھی یاد کیا گیا۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سرسید کے رفقائے کار کا بہت اہم رول رہا ہے۔ سرسید خود ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے ہندوسانیوں کو خاص طور پر مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی ضرورتوں پر غور کیا اور اپنی کوششوں سے زندگی کے ہر شعبے کو سیاست، ادب، تعلیم، معاشرت اور ہندوستانی مسلمانوں کے درپیش مسائل کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے، سرسید احمد خاں نے جہد وعمل کا درس دیا عزلت نشینوں کو گوشہ تنہائی سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا، ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا تنگ نظروں میں وسعت نظر سکھلائی اجداد کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے آپ میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

سرسید احمد خاں مسلمانوں کو تاریک اور تنگ راستے سے نکالنے کے لیے اور جدید علوم سے روشناس کرانے کے لیے پوری زندگی جدوجہد کرتے رہے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی وخوشحالی کے لیے پوری زندگی وقف کر دی انھوں نے 'سائنٹفک سوسائٹی'' اور پھر ''ایم اے او کالج'' قائم کیا۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد ''تہذیب الاخلاق'' پرچہ جاری کیا تہذیب الاخلاق کے ذریعہ انھوں نے جدید علم بالخصوص انگریزی تعلیم کے فوائد کو مدِّ نظر رکھا اور اپنے مضامین کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کا کام لیا خود بھی لکھا اور اپنے رفقائے کار سے بھی لکھوایا تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سرسید نے سیاسی سماجی وتہذیبی و مذہبی مسائل پر سنجیدہ مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا اور خاص طور پر انھوں نے اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بکثرت مضامین لکھے۔

علی گڑھ تحریک کی سب سے اہم خصوصیت عقلیت پسندی ہے انھوں نے ''توہم پرستی'' کے خلاف اور جذباتی کوششوں سے گریز کرنے اور جدید تہذیب وتمدن وجدید تعلیم کی طرف رجحان مبذول کرایا اس لحاظ سے سرسید کا یہ کارنامہ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ کہ انھوں نے منطقی واستدلالی طرز وطریق اپناتے ہوئے جدید معاشرے کے نشیب وفراز کو جدید تعلیم کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے

عام مسلمانوں کی ذہنی بیداری کے لیے محض تخیلیت اور تصوریت کی دنیا سے نکل کر سماجی حقیقت کو عقلی دلائل کی روشنی میں سمجھنے اور جانچنے پر زور دیا ہے۔

غرض سرسید تحریک نے سیاسی و معاشرتی تہذیبی وفکری علمی و ادبی و مذہبی اقدار کی اصلاح کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیئے گرچہ سرسید تحریک کی مخالفت بھی کی گئی لیکن وہ کسی بھی عتاب سے بے خبر اپنے اصلاحی کاموں کے اغراض و مقاصد میں لگے رہے۔ ان اصلاحی کاموں کے اغراض و مقاصد کے لیے مغربی افکار و خیالات ونظریات کو مشعل راہ بنایا جن سے روشنی پا کر مغربی قومیں اس قدر طاقتور اور ترقی یافتہ ہوئی تھیں۔

سرسید کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے فکر وعمل کا رخ بہت حد تک موڑ دیا اور سماج کا ایک بہت بڑا طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا، جس نے اصلاحی مقاصد کی تکمیل میں ان کا ساتھ دیا اور یہ انھیں کی برکتوں کا نتیجہ ہے کہ آج قوم ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کے قابل ہوئی ہے۔

مندرجہ بالا تحریکوں نے ہندوستان کی سماجی معاشرتی و مذہبی زندگی کی تعمیر میں نمایاں کارنامے انجام دیئے جس کے زیر اثر کئی سماجی اصلاحات بھی عمل میں آئیں ان تحریکات نے خاص طور پر نئے متوسط طبقہ کی آئینہ داری کی ہے کیوں کہ انگریزی اقتدار کے بعد متوسط طبقے کی معاشی و معاشرتی زندگی زیادہ متاثر تھی۔ اس طبقہ کے لوگ اپنی معاشی وسماجی زندگی کی فلاح و بہبود چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس طبقہ نے زندگی کے نئے سماجی رشتے اور نئی معاشی قوتوں سے ہم آہنگ ہو کر مغربی افکار و خیالات اور جدید تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے قبول کیا۔ یہ تمام تحریکیں ہندوستانیوں کے اجتماعی ذہنی رویہ کی آئینہ دار ہیں جس نے تقریباً پورے ملک کے لوگوں کو متاثر کیا۔

3.5 پریم چند کا عہد اور آریہ سماج کی تحریک

آریہ سماج تحریک کے پس منظر میں پریم چند کی وابستگی کا ذکر بھی لازمی ہے کیوں کہ پریم چند ان تحریکات سے خود منسلک ہوئے تھے۔ جو ملک کی آزادی اور سماج کی اصلاح کے لیے کام کر رہی تھی، آریہ سماج نے ملک گیر اثرات مرتب کئے۔ آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی نے اپریل ۱۸۷۵ء کو بمبئی میں رکھی رفتہ رفتہ دوسری جگہوں پر بھی اس کی شاخیں قائم ہوتی گئیں اس تحریک نے سماج میں پھیلی ہوئی برائی فرسودہ روایات کو ختم کرنے ہریجنوں کی بہتری، لڑکیوں کی تعلیم، جاگیردارانہ رشتوں اور غیر مذہبی رسم ورواج ضعیف الاعتقادی و توہم پرستی کا خاتمہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آریہ سماج تحریک نے ''اچھوت اور اونچ نیچ وغیرہ پر زور دیا تھا۔ شدھی کا راستہ دکھلایا تھا۔ بال ودھواؤں کی شادی کی تلقین کی تھی اور یہ بتلایا تھا کہ ویدوں کے پڑھنے کا استحقاق ہر ایک انسان کو ہے۔ پریم چند سوامی دیانند کی عہد آفریں شخصیت اور ان کی تحریک کی افادیت سے بے حد متاثر ہوئے انھوں نے ان مسائل پر کئی مضامین اور کہانیاں بھی لکھیں، پریم چند اس تحریک کی صرف اصلاحی تصورات سے متاثر تھے کیوں کہ وہ خود بھی ہندو سماج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے آریہ سماج جب انتہا پسند تحریک ہوگئی اور وہ ہندو مذہب ومعاشرت کے اعتبار سے الگ جماعت تصور کرنے لگی جب کہ یہ بات ہندوؤں کے قدیم روایات کے خلاف تھی اور بعد میں آریہ سماج نے شدھی کا انوکھا طریقہ وضع کر کے ملک کی فضا کو خراب کر دیا تو ان کے اس رویہ سے فرقہ واریت کو فروغ ملا۔ پریم چند نے اس کی شدید مخالفت کی اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ اپنے مضمون ''سامپردایکتا اور

سنسکرتی'' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ فرقہ واریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، اور مسلمان اپنی تہذیب کو، حالاں کہ دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب، ہم آج بھی ہندو مسلم تہذیب کا رونا روتے چلے جاتے ہیں.....تہذیب کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، عیسائی مسلم یا ہندو تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں ہے''۔ (کنور پال سنگھ (مرتب)، پریم چند اور جنوادی ساہتیہ کی پرمپرا، ص: ۷)

پریم چند اپنی زندگی میں ایسی تمام تحریکات کی شدید مخالفت کرتے رہے ہیں جو فرقہ پرستی کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں آریہ سماجیوں نے جب ملک میں شدھی کی تحریک کا آغاز کیا تو پریم چند نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ پریم چند نے شدھی کے خلاف لکھے گئے مضمون میں اس تحریک سے ہونے والے نقصانات سے عوام کو آگاہ کیا اور اسے ہندوستان کی یکجہتی کے لیے خطرناک بتایا، انھوں نے تحریک سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اس کے غلط رویوں کی مخالفت کی، پریم چند نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا اور اس رجحان کی پرزور حمایت کی جو ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے اور تحریکِ آزادی میں معاون ثابت ہوا اور ہر اس تحریک کی مخالفت کی جس سے نقصان پہنچ سکتا تھا۔

3.6 پریم چند اور ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک سے پریم چند کا تعلق بہت گہرا رہا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے ترقی پسند تحریک جو کہ اپنے وقت اور حالات کی پیداوار ہے جس کا رشتہ دراصل آزادی کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اس کے وجود میں آنے کے پیچھے ملک کے سیاسی سماجی واقتصادی حالات کارفرما رہے ہیں ان حالات کا ذکر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان لفظوں میں کیا ہے:

''ہندوستان میں قومی بیداری کی جو لہر اٹھی تھی اس میں گرچہ بنیادی طور پر یہاں کے سیاسی واقتصادی حالات اور برطانوی سرمایہ داری کی سخت گیریوں کو دخل تھا، لیکن قومیت کے جدید تصور کے ساتھ ہی بین الاقوامی مسائل کا شعور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا.....۱۹۰۵ء کے انقلاب روس سے ساری دنیا میں عوامی تحریکوں کا دھارا پھوٹ پڑا اور ایشیا کے محکوم ممالک اپنی گہری نیند سے چونک اٹھے اور پھر ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس کے اثرات اور ہنگامہ یلقان میں ہندوستان کا ترکی سے تعاون اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اب سیاسی وسماجی مسائل کی سطح ملکی و علاقائی حدود سے نکل کر ایک وسیع تر سرحد میں داخل ہو رہی ہے.....اس سیاسی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے آثار سے پورے مغرب میں ہلچل پیدا ہوگئی اس کا اثر ہندوستانی طلباء پر خاص طور پر پڑا جو کہ یورپ کی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔'' (خلیل الرحمٰن اعظمی: اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص: ۳۱)

ان حالات وواقعات سے وہ ہندوستانی نوجوان جوان دنوں یوروپ میں مقیم تھے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، انھیں دانشوروں نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی، ہندوستان آنے کے بعد سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے یہاں پر بھی ترقی پسند مصنفین کی تنظیم شروع کی تو ہمارے ملک کے دانشوروں اور ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا، ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کو سماج کے حقیقی و بنیادی مسائل سے جوڑنا اور تہذیبی معاشرتی سیاسی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کی ترجمانی کرنا اور ساتھ ہی دولت اور محنت کے افتراق، لوٹ گھسوٹ کو ختم کر کے مساوات کا نظام قائم کرنا رہا ہے۔

پریم چند جیسا حساس اور دردمند ادیب کیسے الگ رہ سکتے تھے۔ پریم چند کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی ذہنی ونظریاتی رہی ہے

کیوں کہ ترقی پسند مصنفین نے جو اعلان نامہ پیش کیا اس کے خیالات کو پریم چند اس سے قبل سے ہی اپنی تخلیقات میں پیش کر رہے تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس پریم چند کی صدارت میں ہوئی اس موقع پر جو صدارتی خطبہ انھوں نے دیا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے واضح کیا کہ ادب کیا ہے؟ اس کے فوائد اور ایک ادیب کے فرائض کیا ہیں انھوں نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے خیال میں ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ پریم چند نے اپنے اس خطبے میں آرٹ کی افادیت، مقصد، ذوقِ حسن کی تقویت پر زور دیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا اسی کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں، رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا جھونپڑے اور کھنڈرات اس کے قابل نہ تھے انھیں انسانیت کے دامن سے وہ خارج سمجھتا تھا آرٹ نام محدود صورت پرستی کا الفاظ کی ترکیبوں کا خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔

پریم چند نے اپنے اس خطبے میں آخر میں ادب کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے ادب کے زندگی سے تعلق اور ادیبوں کے سماجی فریضے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے ایک نظام کی تکمیل کرنی ہے ہمارے لٹریچر کو اس آئیڈیل کو پیش کرنا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو تعمیر کی روح ہو زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے حالات اور وقت کے تقاضوں سے ہندوستانی ادیبوں فنکاروں اور نوجوانوں کو ادب اور زندگی رشتے ادیب کے فرائض اور ادب کے مقاصد سے واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور بگڑی ہوئی صورتِ حال کا مقابلہ کریں۔ اس طرح پریم چند نے گذشتہ صفحات میں مذکورہ تمام اصلاحی وقومی تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنی تمام تحریروں کے ذریعہ جذبہ بیداری کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اپنے فن کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا۔

3.7 آپ نے کیا سیکھا

- پریم چند کے عہد کی سماجی وقومی تحریکوں کے آغاز وارتقا کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔
- پریم چند کے عہد میں راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی یہ ایک سماجی تحریک تھی جس کے ذریعہ ہندو مذہب اور سماج میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور فرسودہ رسوم ورواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔
- علی گڑھ تحریک کے آغاز وارتقا اور سرسید احمد کی خدمات کے بارے میں معلومات فراہم ہوئیں۔ علی گڑھ تحریک نے سماج اور ادب میں جو خدمات انجام دیں اس کے متعلق آگاہی حاصل ہوئی۔
- پریم چند کے عہد میں ہی برہمو سماج تحریک کے بعد آریہ سماج تحریک کی بنیاد پڑی۔ یہ بھی ایک سماجی اور قومی اصلاحی تحریک تھی۔ اس تحریک نے سماج میں فرسودہ رسوم ورواج کو ختم کرنے اور تعلیم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

- پریم چند کے آخری عہد میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی۔ یہ تحریک مکمل طور پر ادبی تحریک تھی۔لیکن اس تحریک کے ذریعہ سماج کے اصلاح کا ہی کام لیا گیا۔سماج میں فرسودہ رسوم ورواج اور سماجی ونفسیاتی مسائل کو ادب کے ذریعہ اجاگر کیا گیا۔خود پریم چند نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ سماجی وسیاسی مسائل کو دعوام کے سامنے پیش کیا۔

3.8 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ پریم چند کے عہد میں موجود قومی واصلاحی تحریکوں کا تفصیل سے ذکر کیجئے؟

2۔ راجہ رام موہن رائے کی تحریک ''برہموسماج'' کی خدمات کا بیان کیجئے؟

3۔ سرسید احمد خاں کی تحریک یا علی گڑھ تحریک پر روشنی ڈالئے؟

4۔ آریہ سماج کی تحریک پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے؟

5۔ پریم چند اور ترقی پسند تحریک پر ایک مفصل نوٹ قلم بند کیجئے؟

3.9 سوالات کے جوابات

جواب نمبر 1۔ پریم چند کا تعلق ہندوستان کی تاریخ کے اس دور سے ہے جب ہندوستانی سیاست اور معاشرہ پر برطانوی نو آبادیاتی نظام پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور جس کے سبب یہاں کی سیاسی سماجی معاشی زندگی تغیر وتبدل سے دوچار تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سیاست پر برطانوی نوآبادیاتی نظام کی گرفت اور بھی زیادہ مستحکم ہو جاتی ہے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں پر بھی انگریزوں کا تسلط وتصرف قائم ہو جاتا ہے، انگریزی دورِ حکومت میں صرف سیاسی اقتدار ہی نہیں غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آیا بلکہ معاشی و معاشرتی زندگی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں معاشی رشتے بھی بدلے اور عدالتی وانتظامی سانچہ بھی تبدیل ہوا۔ گاؤں کی خودمختار معاشی زندگی بھی تہہ وبالا ہوئی اور دیسی صنعتیں کرگھے اور چرخے بھی برباد ہوئے ریلوے لائنوں اور ٹیلی فون کے تاروں کا جال ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیل گیا۔سمندر میں کشتیوں کی جگہ کوئلے سے چلنے والے جہازوں نے لے لی اور ہندوستانی بازاروں میں برطانوی کارخانوں کی بنی ہوئی اشیاء نے دیسی سامانوں کی کھپت کے مواقع رفتہ رفتہ کم کر دیئے۔ گاؤں میں جاگیردار اور چھوٹے بڑے کسان کھیت مزدور، سودخور اور بنئے پیدا ہوئے شہروں میں بورژوازی طبقہ دلال سوداگر اور نیا متوسط (سرکاری اور غیر سرکاری) صنعت کار اور مزدور پیدا ہوئے۔

قرونِ وسطیٰ کے تعلیمی نظام کی جگہ اب انگریزی تعلیم کی افادیت اور ضرورت بڑھ گئی مغربی علوم وفنون افکار وخیالات ادب و فلسفہ جمہوری اقدار اور جدید تعلیم سے افراد روشناس ہوئے مذہبی وسماجی اصلاح واحیاء کی تحریکیں وجود میں آئیں ہندوستانی متوسط طبقہ نے اپنی فلاح و بہبود کے کے لیے معاشرتی، مذہبی واصلاحی تحریکوں سے سیاسی تحریک کی طرف رخ کیا۔اصلاح کی تحریکیں سب سے پہلے مشرقی ہندوستان (بنگال، اڑیسہ، مشرقی بہار) میں شروع ہوئیں جہاں پر برطانوی اقتدار سب سے پہلے قائم ہوا، جس سے یہاں کے لوگ براہِ راست متاثر ہوئے تھے۔مختلف سماجی وسیاسی اصلاح کی تحریکیں اس علاقہ سے اٹھ کر ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلتی ہیں یہیں سے راجہ رام موہن رائے جیسے انسان نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ برطانوی فتوحات کے اثرات دھیرے دھیرے پورے ملک پر پڑے انھیں اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستانی عوام نے سماج کو سدھارنے اور جدید بنانے کی بنیاد رکھنے کے لیے سماج کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا اور

انیسویں صدی کے دوران کئی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، ان تحریکوں نے وطن پرستی کے جذبہ کی نشو ونما اور ملک کی آزادی اور سماج کی تعمیرِ نو کے مقاصد حامل تحریکوں کے لیے بھی راہ ہموار کی، اس تحریک میں راجہ رام موہن رائے مرکزی شخصیت کے مالک تھے، جنھیں جدید ہندوستان کا معمار کیا گیا ہے، ان کا سب سے اہم کارنامہ ستی کی رسم کے خلاف محاذ آرا ہونا اور حکومت وقت سے اس پر پابندی عائد کرنا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے معاشرہ میں عورت اور بیوہ کی حالت کو سدھارنے اور فرسودہ سماجی و مذہبی رسم ورواج کو ترک کرنیکی ترغیب دی اور جدید تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔

راجہ رام موہن رائے نے اصلاحی مقاصد کی تکمیل کے لیے ۱۸۲۸ء میں ''برہموسماج'' کی بنیاد ڈالی اور مذہبی تعطل قدامت پسندی اور تنگ نظری کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سبھی مذاہب اور انسانیت کے لیے ایک خدا کا پرچار کیا، انھوں نے مذہب کے تئیں عقلی انداز فکر اختیار کرنے پر زور دیا اور لوگوں کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ ان کی اس تحریک کا اثر خاص طور پر نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ پر بہت زیادہ ہوا اور نوجوان طبقے نے مذہبی اصلاح کی سرگرمیوں میں حصہ بھی لیا، انھوں نے مذہبی سدھار کے علاوہ سماجی اصلاحات کی طرف بھی توجہ کی اور سماج میں پھیلے ذات پات کے نظام کو غیر انسانی قرار دے کر اس کی بنیادوں پر حملہ کیا، انھوں نے بچپن کی شادی کو بھی ختم کرنیکی مہم چلائی، عورتوں کو مساوی حقوق دلانے، بیواؤں کی دوسری شادی کرنے نیز جائیداد پر بھی عورتوں کے حقوق کی وکالت کی، ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ستی کی رسم ختم کرانے کے لیے لارڈ ولیم بینٹک کے عہد میں ایک قرارداد پیش کی گئی جس کو قانونی شکل ملی۔

راجہ رام موہن رائے کو سماج کے کچھ قدامت پسندوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ جدید تعلیم کے بھی حامی تھے۔ ان کی کوششوں کے ہی نتیجہ میں ''ہندو کالج'' کا قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے لارڈ میکالے کی بھی حمایت کی بعد کے دقتوں میں تو آپ نے اپنی تمام تر کوششیں جدید علوم کے فروغ اور ہندوستانی سماج کو جدید بنانے کی طرف صرف کردیں۔

راجہ رام موہن رائے کی قائم کردہ تنظیم ''برہموسماج'' ہندوستان کو نئے سرے سے تشکیل دینے اور سماج میں پھلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی پہلی کوشش تھی، ان کے بعد اس کام کو ''دیویندرناتھ ٹیگور'' اور ''کیشب چندرسین'' جیسی روشن خیال شخصیتوں نے پورے ملک میں پھیلایا، ملک کے مختلف حصوں میں اس تنظیم کی شاخیں قائم ہوئیں، جس کے ذریعہ بعض اہم سماجی اصلاحات عمل میں آئیں۔ کشیب چندرسین نے ''برہموسماج'' میں شامل ہونے کے بعد اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے جس کے ذریعہ یہ تحریک لوگوں میں خاصی مقبولیت حاصل کرگئی۔ مذہب کی تبلیغ کے لیے انھوں نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ انھوں نے بہت سی دوسری تنظیمیں مثلاً ''گڈول فریٹرنٹی سوسائٹی''، ''برہمو ہندوسماج'' اور ''پرہموودیالے'' وغیرہ قائم کیا۔ راجہ رام موہن رائے کی طرح آپ نے بھی معاشرے کی اصلاح پر زور دیا، پردہ کے رواج کو ختم کرنے بیواؤں کی شادی اور مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیان کا سلسلہ قائم کرنے کی وکالت کی، وہ عورتوں کی تعلیم کے بھی حمایتی تھے، انھوں نے لڑکیوں کی کم سنی کی شادی اور کثرت ازدواج کے خاتمہ پر زور دیا، انھوں نے ۱۹۶۰ء میں ''سنگت سبھا'' قائم کی۔ قدامت پسندوں سے اختلاف کی بنیاد پر انھوں نے برہموسماج سے الگ ہوکر ''برہموسبھا آف انڈیا'' کی تشکیل کی اور قدیم ہندو لیٹریچر کی تفسیر اور تراجم شائع کرکے ہندو مذہب کی وحدانیت پر زور دیا۔

اس طرح کی دیگر مذہبی وسماجی اصلاح کی تحریکیں ملک کے مختلف حصوں میں شروع ہوگئیں، بنگال کے علاوہ جس دوسرے حصہ میں اصلاح کی آواز اٹھائی گئی وہ مغربی ہندوستان تھا، جہاں مختلف تحریکوں اور تنظیموں نے عورتوں کی تعلیم، بیواؤں کی دوسری شادی اور

شادی کی عمر کی حد بڑھانے ذات پات کی پابندیوں کے سلسلے میں بہت اہم خدمات انجام دی ہیں، ان اصلاحی تحریکات کی سرگرمیوں کا ہی اثر تھا کہ کچھ ہی بعد سارے ملک میں اس طرح کی تحریکیں عام ہوگئیں اور ہر طرف بیداری کے آثار نظر آنے لگے، ۱۸۶۷ء میں بمبئی میں ''پرارتھنا سماج'' کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ہندوستان میں پھیلی ہوئی برائیوں کو ختم کرنا تھا مہادیو گووندرانا ڈے جیسے لوگوں کی شمولیت کے ساتھ یہ تحریک سیکولر تنظیم کی حیثیت سے کام کرتی رہی اور ہندو سماج کی اصلاح وجدید کاری پر زور دیتی رہی۔

اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں سماجی اصلاح کی ایک اور تحریک سوامی دیانند سرسوتی کی سرکردگی میں پھل پھول رہی تھی۔ آپ نے ہندو مذہب کی اصلاح کے لیے ویدوں کی جانب رجوع کیا۔ آپ نے بچپن کی شادی کو ویدوں کے منافی قرار دے کر اس کے خلاف آواز اٹھائی آپ نے دوسرے مذاہب میں رائج غلط روایات کی بھی مذمت کی اور ایک نئے انداز سے ویدوں کی تفسیر کی اور ہندو مذہب کو قدیم ویدوں کے عہد کی طرح پاک وصاف کرنے کی کوشش کی وحدانیت کی تبلیغ اور یہ ثابت کیا کہ ویدوں میں ذات پات کی کوئی تفریق نہیں تھی۔

شمالی ہند کی یہ پہلی تحریک تھی جس نے مذہب پر تنقید کرتے ہوئے اپنی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا۔ اس تحریک کی سب سے نمایاں کامیابی تعلیم کے میدان میں ہوئی جس نے ملک بھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے لاتعداد اسکول اور کالج کھلوائے اور ہندی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اس کے علاوہ ہندوؤں کو شک وشبہات سے نجات دلانے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ سی ایف اینڈریوز، نے اسے ہندوستان کی پہلی عوامی تحریک سے تعبیر کیا ہے۔

اسی عہد میں بنگال میں ایک دوسری اصلاحی تحریک ''رام کرشن پرم ہنس'' نے ہندو مذہب اور سماج میں پھیلی ہوئی برائی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے وحدانیت کے فلسفے اور بھگتی مارگ پر زور دیا بعد میں اس تحریک کو ''سوامی ویویکانند'' نے آگے بڑھایا آپ نے اپنے مشن کو پھیلانے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں ادارے قائم کئے۔ آپ نے اسی مقصد کے تحت بیرونی ممالک کا دورہ بھی کیا، ساتھ ہی مسلمان صوفیوں اور راہبوں کی صحبت بھی اختیار کی۔ ۱۸۸۶ء میں رام کرشن قائم کر کے اپنے تعلیم کا پرچار کیا۔ سوامی ویویکانند نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران ہندو فلسفہ کو دنیا کے سامنے آفاقی پیغام کے صورت میں پیش کیا۔ آپ نے یہ دلیل دی کہ ویدانت صرف ہندوؤں کا مذہب نہیں ہے بلکہ تمام عالم انسان کا مذہب ہے۔ سوامی جی کی تعلیم نے ایک بہت بڑے طبقے کو متاثر کیا اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں بھی مذہبی وسماجی اصلاح کی تحریکیں شروع ہوئیں مثلاً ''تھیوسوفیکل سوسائٹی'' کا قیام بمبئی میں عمل میں آیا۔ جس نے پارسیوں میں اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ایک بڑے طبقہ کو متاثر بھی کیا۔

جواب نمبر 2۔ راجہ رام موہن رائے نے اصلاحی مقاصد کی تکمیل کے لیے ۱۸۲۸ء میں ''برہموسماج'' کی بنیاد ڈالی اور مذہبی تعطل قدامت پسندی اور تنگ نظری کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سبھی مذاہب اور انسانیت کے لیے ایک خدا کا پرچار کیا، انھوں نے مذہب کے تئیں عقلی انداز فکر اختیار کرنے پر زور دیا اور لوگوں کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ ان کی اس تحریک کا اثر خاص طور پر نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ پر بہت زیادہ ہوا اور نوجوان طبقے نے مذہبی اصلاح کی سرگرمیوں میں حصہ بھی لیا، انھوں نے مذہبی سدھار کے علاوہ سماجی اصلاحات کی طرف بھی توجہ کی اور سماج میں پھیلے ذات پات کے نظام کو غیر انسانی قرار دے کر اس کی بنیادوں پر حملہ کیا، انھوں نے بچپن کی شادی کو بھی ختم کرنیکی مہم چلائی، عورتوں کو مساوی حقوق دلانے، بیواؤں کی دوسری شادی کرنے نیز جائیداد پر بھی عورتوں کے حقوق کی وکالت کی، ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کرستی کی رسم ختم کرانے کے لیے لارڈ ولیم بینٹک کے عہد میں ایک قرارداد پیش کی گئی جس کو

قانونی شکل ملی۔

راجہ رام موہن رائے کو سماج کے کچھ قدامت پسندوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ جدید تعلیم کے بھی حامی تھے۔ ان کی کوششوں کے ہی نتیجہ میں ''ہندو کالج'' کا قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے لارڈ میکالے کی بھی حمایت کی بعد کے دقتوں میں تو آپ نے اپنی تمام تر کوششیں جدید علوم کے فروغ اور ہندوستانی سماج کو جدید بنانے کی طرف صرف کر دیں۔

راجہ رام موہن رائے کی قائم کردہ تنظیم ''برہموسماج'' ہندوستان کو نئے سرے سے تشکیل دینے اور سماج میں پھلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی پہلی کوشش تھی، ان کے بعد اس کام کو ''دیویندرناتھ ٹیگور'' اور ''کیشب چندسین'' جیسی روشن خیال شخصیتوں نے پورے ملک میں پھیلایا، ملک کے مختلف حصوں میں اس تنظیم کی شاخیں قائم ہوئیں، جس کے ذریعہ بعض اہم سماجی اصلاحات عمل میں آئیں۔ کشیب چندرسین نے ''برہموسماج'' میں شامل ہونے کے بعد اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے جس کے ذریعہ یہ تحریک لوگوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر گئی۔ مذہب کی تبلیغ کے لیے انھوں نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ انھوں نے بہت سی دوسری تنظیمیں مثلاً ''گڈول فریٹرنٹی سوسائٹی''، ''برہمو ہندوسماج'' اور ''پرہموودیالے'' وغیرہ قائم کیا۔ راجہ رام موہن رائے کی طرح آپ نے بھی معاشرے کی اصلاح پر زور دیا، پردہ کے رواج کو ختم کرنے بیواؤں کی شادی اور مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیان کا سلسلہ قائم کرنے کی وکالت کی، وہ عورتوں کی تعلیم کے بھی حمایتی تھے، انھوں نے لڑکیوں کی کم سنی کی شادی اور کثرت ازدواج کے خاتمہ پر زور دیا، انھوں نے ۱۹۶۰ء میں ''سنگت سبھا'' قائم کی۔ قدامت پسندوں سے اختلاف کی بنیاد پر انھوں نے برہموسماج سے الگ ہو کر ''برہموسبھا آف انڈیا'' کی تشکیل کی اور قدیم ہندو لیٹریچر کی تفسیر اور تراجم شائع کر کے ہندو مذہب کی وحدانیت پر زور دیا۔

جواب نمبر 3۔ مذہبی وسماجی اصلاح کی یہ تحریکیں دوسرے مذاہب میں بھی شروع ہوئیں۔ کیوں کہ مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی بلکہ بعض اعتبار سے تو ان کے مسائل اور بھی زیادہ پیچیدہ تھے، سیاسی اقتدار ختم ہو جانے کے بعد مسلم طبقہ خاص طور پر اثر انداز ہوا۔ کیوں کہ انگریزوں کو اقتدار حاصل کرنے کے لیے مسلم حکمراں سے ہی جنگ کرنی پڑی، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں انگریزوں کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو ہی خاص طور پر نشانہ بنایا گیا، جب یہ بغاوت ختم ہو گئی تو برطانوی حکمران نے مسلمانوں کو ہی بغاوت کا ذمہ دار قرار دے کر ان پر سخت مظالم ڈھائے۔ مسلم مخالف پالیسی اختیار کی اور ہر طرح سے مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کی، چنانچہ ان حالات میں کچھ روشن خیال لوگوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ کی کیوں کہ مسلم معاشرہ بھی بعض مذہبی اور بعض انگریز مخالفت کی وجہ سے جدید علوم سے بے زار تھا۔ جب کہ دوسرے مذاہب میں جدید علوم کی طرف رجحان بڑھا تھا چنانچہ ان تحریکوں نے مسلم معاشرہ کو جدید تعلیم فراہم کرنے پردے کے رواج اور کثرتِ ازدواج کے خلاف مہم شروع کی اور نیز نئے خیالات کی روشنی میں مذہب کی تشریح کی ان میں سے کچھ تحریکوں نے اپنے آپ کو جدید تعلیم کی توسیع اور اصلاحات کے لیے وقف کر دیا نیز کچھ تحریکیں برطانوی حکومت کے خلاف سیاسی مخالفت کے لیے قائم ہوئیں۔ ان تحریکوں نے عوام کو تبدیلی کی ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں نواب عبداللطیف نے بنگال میں ۱۸۶۳ء میں انگریزی زبان نیز جدید تعلیم کے حق میں ایک ادبی سوسائٹی ''محمڈن لیٹریری سوسائٹی'' قائم کی جس نے بنگال میں کئی علمی ادارے قائم کئے۔

مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کرنے اور نئی تاریخی قوتوں اور زندگی کے لیے نئے تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے آپ کو حالات کے

مطابق ڈھالنے کا درس دینے کے لیے کئی تحریکیں سامنے آئیں ''احمدیہ تحریک'' اور دارالعلوم دیوبند'' وغیرہ اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں قدیم دلی کالج نے بھی مسلمانوں کے اندر نئے رجحان کو فروغ دینے میں بہت نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں مسلمانوں میں اصلاح سے متعلق سب سے زبردست اور حیرت انگیز کام سرسید احمد خاں نے شروع کیا، جس کو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے بھی یاد کیا گیا۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سرسید کے رفقائے کار کا بہت اہم رول رہا ہے۔ سرسید خود ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے ہندوسانیوں کو خاص طور پر مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی ضرورتوں پر غور کیا اور اپنی کوششوں سے زندگی کے ہر شعبے کو سیاست، ادب، تعلیم، معاشرت اور ہندوستانی مسلمانوں کے درپیش مسائل کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے، سرسید احمد خاں نے جہد وعمل کا درس دیا عزلت نشینوں کو گوشہ تنہائی سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا، ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا تنگ نظروں میں وسعت نظر سکھلائی اجداد کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے آپ میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

سرسید احمد خاں مسلمانوں کو تاریک اور تنگ راستے سے نکالنے کے لیے اور جدید علوم سے روشناس کرانے کے لیے پوری زندگی جدوجہد کرتے رہے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی وخوشحالی کے لیے پوری زندگی وقف کردی انھوں نے 'سائنٹفک سوسائٹی'' اور پھر ''ایم اے او کالج'' قائم کیا۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد ''تہذیب الاخلاق'' پرچہ جاری کیا تہذیب الاخلاق کے ذریعہ انھوں نے جدید علم بالخصوص انگریزی تعلیم کے فوائد کو مدِّنظر رکھا اور اپنے مضامین کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کا کام لیا خود بھی لکھا اور اپنے رفقائے کار سے بھی لکھوایا تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سرسید نے سیاسی سماجی وتہذیبی و مذہبی مسائل پر سنجیدہ مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا اور خاص طور پر انھوں نے اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بکثرت مضامین لکھے۔

علی گڑھ تحریک کی سب سے اہم خصوصیت عقلیت پسندی ہے انھوں نے ''توہم پرستی'' کے خلاف اور جذباتی کوششوں سے گریز کرنے اور جدید تہذیب وتمدن وجدید تعلیم کی طرف رجحان مبذول کرایا اس لحاظ سے سرسید کا یہ کارنامہ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ کہ انھوں نے منطقی واستدلالی طرز وطریق اپناتے ہوئے جدید معاشرے کے نشیب وفراز کو جدید تعلیم کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے عام مسلمانوں کی ذہنی بیداری کے لیے محض تخیلیت اور تصوریت کی دنیا سے نکل کر سماجی حقیقت کو عقلی دلائل کی روشنی میں سمجھنے اور جانچنے پر زور دیا ہے۔

غرض سرسید تحریک نے سیاسی ومعاشرتی تہذیبی وفکری علمی وادبی و مذہبی اقدار کی اصلاح کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیئے گرچہ سرسید تحریک کی مخالفت بھی کی گئی لیکن وہ کسی بھی عتاب سے بےخبر اپنے اصلاحی کاموں کے اغراض ومقاصد میں لگے رہے۔ ان اصلاحی کاموں کے اغراض ومقاصد کے لیے مغربی افکار وخیالات ونظریات کو مشعل راہ بنایا جن سے روشنی پاکر مغربی قومیں اس قدر طاقتور اور ترقی یافتہ ہوئی تھیں۔

سرسید کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے فکر وعمل کا رخ بہت حد تک موڑ دیا اور سماج کا ایک بہت بڑا طبقہ ان کے ساتھ ہوگیا، جس نے اصلاحی مقاصد کی تکمیل میں ان کا ساتھ دیا اور یہ انھیں کی برکتوں کا نتیجہ ہے کہ آج قوم ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کے قابل ہوئی ہے۔

مندرجہ بالا تحریکوں نے ہندوستان کی سماجی معاشرتی و مذہبی زندگی کی تعمیر میں نمایاں کارنامے انجام دیئے جس کے زیر اثر کئی

سماجی اصلاحات بھی عمل میں آئیں ان تحریکات نے خاص طور پر نئے متوسط طبقہ کی آئینہ داری کی ہے کیوں کہ انگریزی اقتدار کے بعد متوسط طبقے کی معاشی و معاشرتی زندگی زیادہ متاثر تھی۔ اس طبقہ کے لوگ اپنی معاشی و سماجی زندگی کی فلاح و بہبود چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس طبقہ نے زندگی کے نئے سماجی رشتے اور نئی معاشی قوتوں سے ہم آہنگ ہوکر مغربی افکار و خیالات اور جدید تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے قبول کیا۔ یہ تمام تحریکیں ہندوستانیوں کے اجتماعی ذہنی رویہ کی آئینہ دار ہیں جس نے تقریباً پورے ملک کے لوگوں کو متاثر کیا۔

جواب نمبر 4۔ آریہ سماج تحریک کے پس منظر میں پریم چند کی وابستگی کا ذکر بھی لازمی ہے کیوں کہ پریم چند ان تحریکات سے خود منسلک ہوئے تھے۔ جو ملک کی آزادی اور سماج کی اصلاح کے لیے کام کر رہی تھی، آریہ سماج نے ملک گیر اثرات مرتب کئے۔ آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی نے اپریل ۱۸۷۵ء کو بمبئی میں رکھی رفتہ رفتہ دوسری جگہوں پر بھی اس کی شاخیں قائم ہوتی گئیں اس تحریک نے سماج میں پھیلی ہوئی برائی فرسودہ روایات کو ختم کرنے ہریجنوں کی بہتری، لڑکیوں کی تعلیم، جاگیردارانہ رشتوں اور غیر مذہبی رسم و رواج ضعیف الاعتقادی و توہم پرستی کا خاتمہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آریہ سماج تحریک نے ''اچھوت اور اونچ نیچ وغیرہ پر زور دیا تھا۔ شدھی کا راستہ دکھلایا تھا۔ بال ودھواؤں کی شادی کی تلقین کی تھی اور یہ بتلایا تھا کہ ویدوں کے پڑھنے کا استحقاق ہر ایک انسان کو ہے۔ پریم چند سوامی دیانند کی عہد آفریں شخصیت اور ان کی تحریک کی افادیت سے بے حد متاثر ہوئے انھوں نے ان مسائل پر کئی مضامین اور کہانیاں بھی لکھیں، پریم چند اس تحریک کی صرف اصلاحی تصورات سے متاثر تھے کیوں کہ وہ خود بھی ہندو سماج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے آریہ سماج جب انتہا پسند تحریک ہوگئی اور وہ ہندو مذہب و معاشرت کے اعتبار سے الگ جماعت تصور کرنے لگی جب کہ یہ بات ہندوؤں کے قدیم روایات کے خلاف تھی اور بعد میں آریہ سماج نے شدھی کا انوکھا طریقہ وضع کر کے ملک کی فضا کو خراب کر دیا تو ان کے اس رویہ سے فرقہ واریت کو فروغ ملا۔ پریم چند نے اس کی شدید مخالفت کی اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ اپنے مضمون ''سامپر دایکتا اور سنسکرتی'' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ فرقہ واریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، اور مسلمان اپنی تہذیب کو، حالاں کہ دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب، ہم آج بھی ہندو مسلم تہذیب کا رونا روتے چلے جاتے ہیں.....تہذیب کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، عیسائی مسلم یا ہندو تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں ہے''۔ (کنور پال سنگھ (مرتب)، پریم چند اور جنوادی ساہتیہ کی پرمپرا، ص: ۷)

پریم چند اپنی زندگی میں ایسی تمام تحریکات کی شدید مخالفت کرتے رہے ہیں جو فرقہ پرستی کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں آریہ سماجیوں نے جب ملک میں شدھی کی تحریک کا آغاز کیا تو پریم چند نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ پریم چند نے شدھی کے خلاف لکھے گئے مضمون میں اس تحریک سے ہونے والے نقصانات سے عوام کو آگاہ کیا اور اسے ہندوستان کی یکجہتی کے لیے خطرناک بتایا، انھوں نے تحریک سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اس کے غلط رویوں کی مخالفت کی، پریم چند نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا اور اس رجحان کی پرزور حمایت کی جو ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے اور تحریکِ آزادی میں معاون ثابت ہوا اور ہر اس تحریک کی مخالفت کی جس سے نقصان پہنچ سکتا تھا۔

جواب نمبر 5۔ ترقی پسند تحریک سے پریم چند کا تعلق بہت گہرا رہا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے ترقی پسند تحریک جو کہ اپنے وقت اور حالات کی پیداوار ہے جس کا رشتہ دراصل آزادی کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اس کے وجود میں آنے کے پیچھے ملک کے سیاسی سماجی و اقتصادی حالات کارفرما رہے ہیں ان حالات کا ذکر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان لفظوں میں کیا ہے:

''ہندوستان میں قومی بیداری کی جولہر اٹھی تھی اس میں گرچہ بنیادی طور پر یہاں کے سیاسی واقتصادی حالات اور برطانوی سرمایہ داری کی سخت گیریوں کو دخل تھا،لیکن قومیت کے جدید تصور کے ساتھ ہی بین الاقوامی مسائل کا شعور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا.....۱۹۰۵ء کے انقلاب روس سے ساری دنیا میں عوامی تحریکوں کا دھارا پھوٹ پڑا اور ایشیا کے محکوم ممالک اپنی گہری نیند سے چونک اٹھے اور پھر ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس کے اثرات اور ہنگامہ یلقان میں ہندوستان کا ترکی سے تعاون اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اب سیاسی وسماجی مسائل کی سطح ملکی و علاقائی حدود سے نکل کر ایک وسیع تر سرحد میں داخل ہورہی ہے.....اس سیاسی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے آثار سے پورے مغرب میں ہلچل پیدا ہوگئی اس کا اثر ہندوستانی طلباء پر خاص طور پر پڑا جو کہ یوروپ کی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے تھے۔'' (خلیل الرحمٰن اعظمی: اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک،ص:۳۱)

ان حالات وواقعات سے وہ ہندوستانی نوجوان جوان دنوں یوروپ میں مقیم تھے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے،انھیں دانشوروں نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی، ہندوستان آنے کے بعد سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے یہاں پر بھی ترقی پسند مصنفین کی تنظیم شروع کی تو ہمارے ملک کے دانشوروں اور ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا،ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کو سماج کے حقیقی و بنیادی مسائل سے جوڑنا اور تہذیبی معاشرتی سیاسی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کی ترجمانی کرنا اور ساتھ ہی دولت اور محنت کے افتراق، لوٹ گھسوٹ کو ختم کر کے مساوات کا نظام قائم کرنا رہا ہے۔

پریم چند جیسا حساس اور دردمند ادیب کیسے الگ رہ سکتے تھے۔ پریم چند کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی ذہنی ونظریاتی رہی ہے کیوں کہ ترقی پسند مصنفین نے جو اعلان نامہ پیش کیا اس کے خیالات کو پریم چند اس سے قبل سے ہی اپنی تخلیقات میں پیش کررہے تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس پریم چند کی صدارت میں ہوئی اس موقع پر جو صدارتی خطبہ انھوں نے دیا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے واضح کیا کہ ادب کیا ہے؟ اس کے فوائد اور ایک ادیب کے فرائض کیا ہیں انھوں نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے خیال میں ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ پریم چند نے اپنے اس خطبے میں آرٹ کی افادیت،مقصد، ذوقِ حسن کی تقویت پر زور دیا۔انھوں نے بتایا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا اسی کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں، رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا جھونپڑے اور کھنڈرات اس کے قابل نہ تھے انھیں انسانیت کے دامن سے وہ خارج سمجھتا تھا آرٹ نام محدود صورت پرستی کا الفاظ کی ترکیبوں کا خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔

پریم چند نے اپنے اس خطبے میں آخر میں ادب کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے ادب کے زندگی سے تعلق اور ادیبوں کے سماجی فریضے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے فرمایا کہ ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے ایک نظام کی تکمیل کرنی ہے ہمارے لٹریچر کو اس آئیڈیل کو پیش کرنا ہے۔مزید کہتے ہیں کہ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو تعمیر کی روح ہو زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے حالات اور وقت کے تقاضوں سے ہندوستانی ادیبوں فنکاروں اور نوجوانوں کو ادب اور

زندگی رشتے ادیب کے فرائض اور ادب کے مقاصد سے واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور بگڑی ہوئی صورتِ حال کا مقابلہ کریں۔ اس طرح پریم چند نے گذشتہ صفحات میں مذکورہ تمام اصلاحی وقومی تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنی تمام تحریروں کے ذریعہ جذبہ بیداری کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اپنے فن کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا۔

3.10 فرہنگ

الفاظ	معانی
نظم وضبط	انتظام، سرکاری یا دفتری امر کا بندوبست
تصرف	قبضہ، دخل، اختیار، ردوبدل
مستحکم	مضبوط، پائدار
اقتدار	حکومت، اختیار، طاقت، مرتبہ
مفاد	فائدہ، نفع، بھلائی
اعتماد	بھروسا، یقین، اعتبار، ساکھ
خودمختار	بااختیار، اپنے عمل پر قادر، تابع یا ماتحتی سے آزاد
مقصود	آرزومندی، ارادہ
مستحکم	پائیدار، پختہ، مضبوط
بورژوازی	سرمایہ دارانہ معاشرہ میں اعلیٰ طبقہ اور استحصالی طبقہ کو بورژوازی کہا جاتا ہے۔
وسعت	کشادگی،، فراخی
متوسط	درمیانی، بیچ میں واقع
معاش	رزق، روزی، روزگار
معیار	کسوٹی، پرکھ، جانچ
فرسودہ	پرانا، خستہ حال
تعمیرِ نو	نئے طریقے سے تعمیر کرنا، نئی تنظیم، نئی ڈھنگ سے تیار کرنا
درہم برہم	الٹ پلٹ، تہ وبالا، منتشر، مخلوط
معمار	بنانے والا، عمارت بنانے والا، تعمیر کرنے والا
تعطل	بے کار ہونا، کسی کام یا خدمت کا روک دیا جانا، فرسودہ ہونا
تفریق	اختلاف، جھگڑا، نفرت، منتشر، برہم
وحدانیت	ایک ہونا، خدا کا ایک ہونا، واحد ہونا، یگانہ پن

روشناس	واقف، شناسا، جان پہچان والا، صورت آشنا
توہم پرستی	وہم پوجنا، خلافِ عقل باتوں کو ماننا
نشیب وفراز	پست اور بلند مقام، پستی وبلندی
استحقاق	قانونی یا اخلاقی حق، شہری حقوق کی بنا پر کسی بات کا حقدار ہونا
احتجاج	حجت یا دلیل پیش کرنے کا عمل، ناپسندیدگی کے خلاف آواز بلند کرنا
وحشیانہ	جانوروں کی طرح، درندوں کی مانند، وحشیوں کی طرح
جابرانہ	جابر سے منسوب، سخت گیری، ظلم روا رکھنا، ظالمانہ
استحصال	ناجائز فائدہ اٹھانا، کسی حصہ دار کا حصہ ہتھیانا،
زبوں حالی	خستہ حالی، ماشی طور پر گری ہوئی حالت، مفلسی، غریبی
موہوم	وہم کیا گیا، خیالی، تصوراتی، فرضی
انتشار	بکھراؤ، پریشاں خیالی، تفریق پیدا ہونا
فرقہ وارانہ	گروہ بندی، جماعت بندی، دو جماعتوں میں تفرقہ ڈالنا

3.11 کتب برائے مطالعہ

1. قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009ء
2. مانک ٹالا، پریم چند حیاتِ نو، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1992ء
3. پرکاش چندر گپت، پریم چند (مونوگراف)، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1976ء
4. پین چندرا، تحریک آزادی میں آزاد ہندوستان کا تصور، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 1998ء
5. پین چندرا، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 1979ء
6. جعفر رضا، پریم چند کہانی کار رہنما، شبستان شاہ گنج، الہ آباد، 1999ء
7. ڈاکٹر صغیر افراہیم، پریم چند۔ ایک نقیب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987ء

اکائی: 04 پریم چند پر ان کے عہد کی تحریک کے اثرات

4.1 اغراض ومقاصد
4.2 تمہید
4.3 پریم چند پر برہموسماج کے اثرات
4.4 پریم چند پر آریہ سماج تحریک کے اثرات
4.5 پریم چند پر راما کرشنا مشن کے اثرات
4.6 پریم چند پر تھیوسوفیکل سوسائٹی کے اثرات
4.7 پریم چند پر علی گڑھ تحریک کے اثرات
4.8 پریم چند پر ترقی پسند تحریک کے اثرات
4.9 پریم چند پر عدم تعاون تحریک کے اثرات
4.10 پریم چند پر جنگِ آزادی تحریک کے اثرات
4.11 آپ نے کیا سیکھا
4.12 اپنا امتحان خود لیجئے
4.13 سوالات وجواب
4.14 فرہنگ
4.15 کتب برائے مطالعہ

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- پریم چند کے عہد کی اصلاحی، قومی وادبی تحریکوں سے روشناس ہوسکیں گے۔
- پریم چند پر مختلف تحریکوں کے کیا اثرات مرتبہ ہوئے ان سے واقف ہوسکیں گے۔
- پریم چند کی تخلیقات پر برہموسماج تحریک کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔

- پریم چند پ آریہ سماج تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے، علم ہو سکے گا۔
- پریم چند پر تھیوسوفیکل سوسائٹی کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔
- پریم چند پر علی گڑھ، ترقی پسند اور جنگِ آزادی کی تحریکات کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔

4.2 تمہید

پریم چند اپنے عہد کے ایک مشہور مفکر، ادیب و فنکار تھے۔ پریم چند بھی اپنے عہد و ماحول کے پروردہ تھے۔ وہ اپنے آس پاس کے حالات و واقعات سے اپنی تخلیقات کا تانا بانا تیار کرتے تھے۔ اسی لیے پریم چند کی شخصیت اور ان کے فن پارے کا جائزہ لینے کے لیے ان کے عہد کے تاریخی پس منظر کی معلومات ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر پریم چند جو بیک وقت عظیم فنکار ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار بھی تھے ان کی عظمت و شہرت کے پیچھے کارفرما عوامل و محرکات کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے عہد اور ماحول کے قومی و سیاسی تحریکوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ جس میں ان کے فکری ارتقاء کی منزلوں کا اندازہ بھی ہوگا۔

پریم چند نے اپنی کہانیوں کا مواد براہِ رات اپنے عہد کی زندگی سے ہی لیا ہے۔ ان کے فن کے ہر گوشے پر زندگی کے حقائق کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی و سیاسی زندگی کا قافلہ جس سمت گامزن تھا اور جن منزلوں پر وہ ٹھہرا اس کے ثبوت ہمیں پریم چند کی تخلیقات میں واضح نظر آتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان معاشرت اور فکر و شعور کے اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اس اکائی میں ہم پریم چند کے عہد میں ہونے والی قومی و اصلاحی تحریکوں کے جو اثرات پریم چند کی تخلیقات پر مرتب ہوئے ان کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

4.3 پریم چند پر برہمو سماج تحریک کے اثرات

پریم چند کا تعلق ہندوستان کی تاریخ کے اس دور سے ہے جب ہندوستانی سیاست اور معاشرہ پر برطانوی نوآبادیاتی نظام پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور جس کے سبب یہاں کی سیاسی سماجی معاشی زندگی تغیر و تبدل سے دوچار تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سیاست پر برطانوی نوآبادیاتی نظام کی گرفت اور بھی زیادہ مستحکم ہو جاتی ہے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں پر بھی انگریزوں کا تسلط و تصرف قائم ہو جاتا ہے، انگریزی دورِ حکومت میں صرف سیاسی اقتدار ہی نہیں غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آیا بلکہ معاشی و معاشرتی زندگی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں معاشی رشتے بھی بدلے اور عدالتی و انتظامی سانچہ بھی تبدیل ہوا۔ گاؤں کی خود مختار معاشی زندگی بھی تہہ و بالا ہوئی اور دیسی صنعتیں کرگھے اور چرخے بھی برباد ہوئے ریلوے لائنوں اور ٹیلی فون کے تاروں کا جال ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیل گیا۔ سمندر میں کشتیوں کی جگہ کوئلے سے چلنے والے جہازوں نے لے لی اور ہندوستانی بازاروں میں برطانوی کارخانوں کی بنی ہوئی اشیاء نے دیسی سامانوں کی کھپت کے مواقع رفتہ رفتہ کم کر دیئے۔ گاؤں میں جاگیردار اور چھوٹے بڑے کسان کھیت مزدور، سود خور اور بنئے پیدا ہوئے شہروں میں بورژوازی طبقہ دلال سوداگر اور نیا متوسط (سرکاری اور غیر سرکاری) صنعت کار اور مزدور پیدا ہوئے۔

قرونِ وسطیٰ کے تعلیمی نظام کی جگہ اب انگریزی تعلیم کی افادیت اور ضرورت بڑھ گئی مغربی علوم و فنون افکار و خیالات ادب و فلسفہ جمہوری اقدار اور جدید تعلیم سے افراد روشناس ہوئے مذہبی و سماجی اصلاح و احیاء کی تحریکیں وجود میں آئیں ہندوستانی متوسط طبقہ نے اپنی فلاح و بہبود کے کے لیے معاشرتی، مذہبی و اصلاحی تحریکوں سے سیاسی تحریک کی طرف رخ کیا۔ اصلاح کی تحریکیں سب سے پہلے مشرقی

ہندوستان (بنگال، اڑیسہ، مشرقی بہار) میں شروع ہوئیں جہاں پر برطانوی اقتدار سب سے پہلے قائم ہوا، جس سے یہاں کے لوگ براہِ راست متاثر ہوئے تھے۔ مختلف سماجی وسیاسی اصلاح کی تحریکیں اس علاقہ سے اٹھ کر ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلتی ہیں یہیں سے راجہ رام موہن رائے جیسے انسان نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ برطانوی فتوحات کے اثرات دھیرے دھیرے پورے ملک پر پڑے انھیں اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستانی عوام نے سماج کو سدھارنے اور جدید بنانے کی بنیاد رکھنے کے لیے سماج کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا اور انیسویں صدی کے دوران کئی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، ان تحریکوں نے وطن پرستی کے جذبہ کی نشو ونما اور ملک کی آزادی اور سماج کی تعمیرِ نو کے مقاصد حامل تحریکوں کے لیے بھی راہ ہموار کی، اس تحریک میں راجہ رام موہن رائے مرکزی شخصیت کے مالک تھے، جنھیں جدید ہندوستان کا معمار کیا گیا ہے، ان کا سب سے اہم کارنامہ ستی کی رسم کے خلاف محاذ آرا ہونا اور حکومت وقت سے اس پر پابندی عائد کرنا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے معاشرہ میں عورت اور بیوہ کی حالت کو سدھارنے اور فرسودہ سماجی ومذہبی رسم ورواج کو ترک کرنیکی ترغیب دی اور جدید تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔

پریم چند نے آنکھ کھولی تو ملک کو شدید بحران میں مبتلا پایا۔ نصف صدی میں ہی غیر ملکی تسلط نے جاگیردارانہ نظام کی جڑوں کو اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ زمیندار، جاگیردار، تعلق دار، نواب، راجہ، مہاراجہ درجہ بدرجہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے عام رعیت اور کسانوں کا مختلف جہتوں سے استحصال کر رہے تھے۔ سماج کا ہر شخص اپنے سے کمزور کو دبا رہا تھا۔ اس طرح ملک غلامی کی زنجیروں میں مسلسل جکڑا جا رہا تھا۔ انسانی معاشرہ بے شمار طبقوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ انسان دوستی اور بھائی چارے کے فقدان نے معاشرہ کے آپسی رشتوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ غیر ملکی صنعت کاروں کی بدولت سارا ملک سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت میں آچکا تھا۔ یہ غیر ملکی حکمرانوں کی حکمت عملی تھی کہ ہندوستان میں بہ یک وقت جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی بنیادوں کو اس طرح مضبوط کیا گیا کہ اس کا اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی ڈھانچہ تباہ ہو کر رہ گیا۔ معاشرہ میں مساوات کی کمی کے سبب قومی وحدت ویگانگت کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ مشترکہ تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ سارا ملک عدم استحکام کا شکار تھا۔ متوسط طبقہ کا وجود خطرے میں تھا۔ کمزور اور غریب اس حد تک بکھر چکا تھا۔ کہ اس میں فریاد کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ناامیدی اور غم کے اس ماحول نے کچھ ایسی غیر انسانی رسوم ورواج کو جنم دیا تھا کہ معاشرہ کا ایک طبقہ خاص طور سے اور ہر طبقہ کے کچھ افراد عموماً حیوانوں کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ صدیوں کے اس ظلم وستم کے نتیجے میں پورا معاشرہ سسک کر دم توڑ رہا تھا۔ ان حالات نے باشعور انسانوں کی روح کو متزلزل کر کے رکھ دیا جس کے نتیجے میں ہندوستان کے مختلف خطوں میں متعدد تحریکیں جنم لینے لگیں۔ اصلاح کے لیے کچھ نے مذہب کو اولیت دی، کچھ نے معاشرتی فلاح و بہبود کو مقدم جانا اور اس جانب متوجہ ہوئے۔ کچھ ایسے بھی اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے غیر ملکی جبر وتسلط کو ان حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ بہر حال نصب العین ایک تھا۔ رائیں مختلف تھیں منزل ایک تھی، راستے جداگانہ تھے۔ پریم چند ان مختلف تحریکات افکار ونظریات سے متاثر ہوئے۔

پریم چند سے قبل ہندوستان میں بعض مذہبی اور سماجی تحریکیں اصلاح کی غرض سے وجود میں آچکی تھیں۔ پریم چند ذہنی طور پر ان تحریکوں سے متعلق بعض شخصیتوں کے زیر اثر تھے۔ اسی وجہ ہمارے لیے ان تحریکوں اور شخصیتوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ سب سے پہلا اور بہت اہم نام راجہ رام موہن رائے کا ہے۔

راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی غرض سے بنگال میں ''برہموسبھا'' کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی سبھا

نے کچھ عرصہ بعد ''برہموسماج'' کے نام سے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور جلد ہی ملک کے ایک بڑے حصہ میں پھیل گئی۔اس تحریک نے قدامت پرستی اور تنگ نظری پر مبنی بعض فرسودہ رسوم کے خلاف مورچہ قائم کیا، خدائے واحد کی طرف ہندو قوم کو رغبت دلائی، عورتوں کی زبوں حالی پر توجہ دی۔ستی کی رسم کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا۔اور بالآخر ۱۴دسمبر ۱۸۲۹ء کو حکومت وقت نے اسے خلافِ قانون قرار دیا۔راجہ رام موہن رائے کا یہ کارنامہ بلاشبہ ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے لیکن ان کا تاریخی اہمیت کا حامل ایک کام اور بھی ہے۔اس زمانے کے بعض ہندو مرد ایک سے زائد شادیاں کرتے۔نتیجہ میں وہ اپنے مرنے کے بعد کئی عورتوں کو بیوہ چھوڑ جاتے۔ہندو سماج میں بیواؤں کے لیے دوسری شادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔انھیں منحوس خیال کیا جاتا۔راجہ رام موہن رائے نے عورتوں کے ساتھ اس غیر انسانی سلوک کے خلاف آواز بلند کی۔انھوں نے کئی کم سن بیواؤں کی شادیاں کرائیں اور اس بات کی کوشش کی کہ شوہروں کی جائداد سے عورت کو بھی حصہ ملے۔پریم چند نے سب سے پہلے اس جانب توجہ دی اور اسے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔پریم چند نے ہی پہلی بات ایسی عورتوں کے لیے ان کے شوہروں کے انتقال کے بعد زندگی جینے کا حق مانگا۔انھوں نے اپنے افسانوں 'آہ بیکس'، 'بیٹی کا دھن، نوک جھونک، معصوم بچہ، ابھاگن، بدنصیب ماں، وغیرہ اور ہم خرما وہم ثواب، روٹھی رانی، جلوۂ ایثار، بیوہ، نرملا، غبن وغیرہ ناولوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ ہندو معاشرے میں کثرتِ ازدواج اور بیواؤں کے ان تمام مسائل کی جانب پڑھنے والوں کو متوجہ کیا وہ اپنے ناول بیوہ میں کملا پرشاد کی زبانی کہتے ہیں:

> ''اگر کسی ناگہانی صدمے سے یہ مکان گر پڑے تو ہم کل سے اسے پھر سے بنانا شروع کر دیں گے مگر جب کسی عورت کی زندگی پر کوئی ناگہانی آفت پڑ جاتی ہے تو اس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ اس نام کو روتی رہے یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے۔'' (پریم چند، بیوہ، ص: ۱۳۵)

راجہ رام موہن رائے کے بعد برہموسماج تحریک دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔پہلے گروہ کی قیادت تو رویندر ناتھ ٹیگور کے ہاتھوں میں تھی اور دوسری گروہ کی قیادت کیشپ چندر سین کر رہے تھے۔کیشپ چندر سین نے اپنی اس تحریک کا نام 'برہموسماج آف انڈیا' رکھا۔کیشپ چندر سین اور ان کے ساتھی گوبند رانا ڈے نے اپنے زورِ خطابت سے اس تحریک کو بہت قوت عطا کی۔ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں پہنچ کر انھوں نے ذات پات کے خلاف آواز بلند کی۔مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیاہ کے رشتوں کو جائز قرار دیا۔تعلیم کی اہمیت پر خاصا زور دیا۔عام بچوں، یتیموں اور بیواؤں کے لیے بالترتیب جگہ جگہ مدرسے، یتیم خانے اور بیوہ آشرم قائم کیے۔اور ان کے ہر ممکن سہولتیں فراہم کیں۔کم عمر بچوں کی شادی کی مخالفت کی اور بیوہ کی دوسری شادی پر زور دیا۔مشترکہ خاندان میں عورت کے لیے پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا اور ان سے نجات پانے کے ذرائع بتائے۔پریم نے ان تمام مسائل کو بیان کرنے کا ذمہ اٹھایا۔اور مختلف انداز سے ان کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ناول 'غبن' میں رتن کہتی ہے:

> ''میں نے کہہ دیا اس گھر کی کسی چیز پر میرا دعویٰ نہیں۔میں کرایہ کی لونڈی تھی۔لونڈی کا گھر سے کیا تعلق، نہ جانے کس پاپی نے یہ قانون بنایا تھا.....اگر میری زبان میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس کی آواز سارے ملک میں پہنچ سکتی تو میں اپنی بہنوں سے کہتی کسی مشترکہ خاندان میں شادی مت کرنا اور اگر کرنا تو جب تک اپنا گھر الگ نہ بنا لینا آرام کی نیند نہ سونا۔'' (پریم چند، غبن، ص: ۳۰۰)

4.4 پریم چند پر آریہ سماج تحریک کے اثرات

برہموسماج کے بعد ایک دوسری تحریک آریہ سماج نے ملک گیر اثرات مرتب کیے۔ آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی نے ۱۰/اپریل ۱۸۷۵ء کو بمبئی میں رکھی۔ رفتہ رفتہ دوسری جگہوں پر بھی اس تحریک کی شاخیں قائم ہوتی گئیں۔ اس تحریک نے بت پرستی کے خلاف زبردست صدائے احتجاج بلند کیا۔ اس تحریک کے رہنماؤں نے ہندوستانی معاشرہ میں ذات پات کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے سخت اقدامات اٹھائے، تعلیم کو فروغ دینے بالخصوص تعلیم نسواں کے لیے پرزور حمایت کی، مذہبی روپ دھارن کر لینے والے رسوم و رواج سے ہندو مذہب کا دامن پاک کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

پریم چند سوامی جی کی شخصیت اور ان کی تحریک کی افادیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے تنگ نظری اور پرانے رسوم پر اپنے ڈرامہ 'روحانی شادی' میں سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس ڈرامہ کے آخری منظر میں ہیروئین مس جنی کہتی ہے:

''میں نے ایک قابلِ قدر ہستی کو رسوم پر قربان کیا اور آج ان رسوم کو اس کے نام پر قربان کردوں گیا۔۔ ہمارے رسوم کتنے مہلک ہیں۔۔ جسے ہم مذہب کہتے ہیں محض رسوم کا پھندا ہے۔ ہماری روح اور ضمیر کی آزادی اس پھندے میں تڑپتی ہے۔۔ میں آج بلند آواز سے کہتی ہوں کہ انسان عقائد سے زیادہ اہم اور کہیں زیادہ بیش بہا ہے۔''

شروعات میں آریہ سماج کا مقصد مذہبی تعلیم کے فروغ تک ہی محدود تھا پھر قوم کے مفاد میں اس کا دائرہ عمل وسیع ہوتا گیا۔ آریہ سماجی تحریک سے پریم چند کو جو روحانی لگاؤ تھا اس کا اظہار ان کے ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' میں ہوتا ہے۔ اس ناول کا ہیرو 'امرت رائے' ایک نوجوان وکیل ہے۔ وہ سناتن دھرم چھوڑ کر آریہ سماجی عقیدے کا معتقد ہو جاتا ہے اور بڑے زور و شور کے ساتھ اس راہ کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ دھرم کے مروجہ معمولات سے انحراف کے سبب اس کی شادی پریما سے نہیں ہو پاتی ہے۔ لالہ بدری پرشاد اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا ہونے والا داماد 'ادھرمی' ہو کر روایات پر تنقید کرے اور قدیم ہندو تہذیب کی بے حرمتی کا مرتکب ہو۔ امرت رائے محبت کے جذبہ کو قوم کی خدمت کے فرض پر قربان کرتے ہوئے لالہ بدری پرشاد کو لکھتا ہے کہ:

> ''ہماری طرز معاشرت احکامِ وید سے متناقص ہے اور جس کو غلطی سے سناتن دھرم کہتے ہیں وہ ان پرانے بوسیدہ خیال لوگوں کی جماعت ہے جو مذہب کے پردے میں ذاتی فلاح ڈھونڈھتے ہیں۔ اس لیے ہم کو مجبوراً اس سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ اگر اس حیثیت میں آپ مجھ کو فرزندی میں قبول فرمائیں تو خیر، ورنہ مجھے اپنی بدقسمتی پر بھی افسوس نہ ہوگا۔'' (پریم چند، ہم خرما و ہم ثواب، ص ۲۳)

پریم چند نے اس ناول میں توہم پرستی، اندھی تقلید اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اور بیوہ کی شادی اور مختلف ذاتوں کے بیچ رشتے قائم کرنے کی تحریک کی ہے۔

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی خود بھی برہموسماج تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اسی سبب دونوں تحریکوں میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے اور بادی النظر میں کوئی بڑا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ آریہ سماج اور برہموسماج، ان دونوں تحریکوں نے ہندو قوم کی تعمیر انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی بنیاد پر جدید تقاضوں کے مطابق کرنی چاہی۔ ذات پات کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی۔ تعلیمی اہمیت پر زور دیا۔ علم کی اہمیت پر دونوں تحریکوں میں یکساں زور دیا جاتا تھا۔ دونوں کے حامیوں نے متعدد مقامات پر اسکول اور کالج کھولے۔ ویدک

علوم کو جدید سائنسی تقاضوں کے مطابق پیش کیا۔

4.5 پریم چند پر راما کرشنا مشن کے اثرات

برہموسماج اور آریہ سماج تحریکوں کے علاوہ پریم چند ایک تیسری تحریک ''راما کرشنا'' کے بھی بڑے مداح تھے جو اس زمانہ میں ملک گیر حیثیت حاصل کر رہی تھی۔ راما کرشنا مشن کی بنیاد بنگال کے ایک برہمن جوگی شری رام کرشن پرم ہنس نے رکھی تھی۔ یہ تحریک جوگی جی کے نام کی مناسبت سے مشہور ہوئی۔ بنکم چندر چٹر جی اور گریش چندر گھوش جیسے ادیب اس مشن کے ہمنوا ہوئے لیکن سب سے ممتاز نام سوامی وویکانند کا ہے جو بڑے پایے کے خطیب، مفکر اور اپنے مخصوص مذہبی معاملات کے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے اپنے زورِ بیان اور زورِ استدلال سے اس تحریک میں جان ڈال دی۔ ان کے کارناموں سے پریم چند بھی نہایت متاثر تھے چنانچہ وہ ان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ماہنامہ ''زمانہ'' کے شمارہ مئی ۱۹۰۸ء میں ''سوامی وویکانند'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

''گزشتہ صدی عیسوی کے ابتدا میں مادیت نے سر اٹھایا۔ اس کا حملہ ایسا پرزور تھا کہ ہندوستان کی روحانیت کو اس کے مقابل میں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔۔ ایسی حالت میں ہندوستان کی خاک پاک سے پھر ایک بزرگ اٹھا جو روحانیت کے جوش سے معمور تھا۔ جس کا دل محبت سے لبریز تھا۔۔ یہ اس نفس پاک کی تعلیم کی برکت ہے کہ آج ہم اپنے قدیم معیاروں کی پرستش کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

پریم چند سوامی وویکانند کی بارعب اور پروقار شخصیت کی دل نشین تصویر 'جلوۂ ایثار' میں پیش کرتے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو سوامی جی کی طرح ''ذہین اور متین معصوم اور خوبصورت ہے۔

> ''سوامی جی نہایت وجیہہ و شکیل بزرگ تھے۔ آپ کی نگاہ میں برقی تاثیر تھی۔ چہرہ روحانیت کے رعب و جلال سے منور تھا۔ مزاج بہت سادہ اور روش بالکل منکسرانہ تھی۔ ان کی علمیت لامحدود تھی۔'' (بحوالہ ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص ۲۱۲۔۲۱۳)

وویکانند نے اپنے گرو کی تعلیمات کو پھیلانے کے خاطر دور دراز علاقوں کے علاوہ غیر ممالک کے بھی سفر کیے۔ ان کی تعلیمات کے زیر اثر پریم چند مذکورہ مضمون میں ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''سری سوامی وویکانند کی تعلیم روحانیت کی کرامات ہے۔۔ سوامی جی کی تلقینات کا لب لباب یہ تھا کہ ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں، روحانیت حاصل کریں۔ شہ زور اور دلاور ہوں۔ نیچی ذاتوں کو ابھاریں اور انھیں اپنا بھائی سمجھیں۔ ہندو فلسفہ کے عملی پہلو پر عمل کریں اور نفس کشی اور ریاضت اور ترک ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جنھیں ایشور نے ان بلندیوں تک پہنچنے کی توفیق دی ہے۔''

4.6 پریم چند پر تھیوسوفیکل سوسائٹی کے اثرات

ہندوستان کی قومی اور سماجی تعمیر میں بعض غیر ملکی اداروں اور افراد کی کاوشیں بھی شامل رہی ہیں جنھوں نے ملک کو مغرب کے نئے رجحانات سے آگاہ کرایا اور ذی شعور حضرات کو مشعلِ راہ دکھائی۔ ان میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس سوسائٹی کا وجود نیویارک (امریکہ) میں ۷/دسمبر ۱۸۷۵ء کو عمل میں آیا تھا۔ اس کی شاخ ۱۸۸۲ء میں کرنل اسکات اور میڈم بلاواٹسکی نے مدراس میں قائم کی تھی۔ لیکن گیارہ سال بعد ۱۸۹۳ میں اینی بیسنٹ نے ہندوستان آ کر اس کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور اس کو متحرک و فعال بنا دیا۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام بنارس میں سنٹرل ہندو اسکول کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں مدن موہن مالویہ کی سرکردگی میں ترقی کر کے

ہندو یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔اس سوسائٹی کے کچھ اصول تھے جن کے دائرے میں رہ کر انھوں نے اپنے کام کو آگے بڑھایا۔اس نے سماجی اصلاح کے لیے کوششیں کیں اور تعلیم کے فروغ کی پرزور حمایت اور سعی کی۔ پریم چند کو بھی ہندوستانیوں میں تعلیم کی کمی کا احساس تھا۔اور وہ بھی ہندوستانیوں میں تعلیم کے رواج کو عام کرنا چاہتے تھے۔افسانوی مجموعے زادِراہ، خاکِ پروانہ اور واردات کے اکثر افسانوں میں انھوں نے تعلیم کی قدر و قیمت پر مختلف زاویوں سے زور دیا ہے۔ناول گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی اور میدانِ عمل میں تفصیل کے ساتھ تعلیمی مسائل کی اہمیت سے بحث کی ہے۔ان کا یہ ماننا تھا کہ بہت سی معاشرتی خرابیاں صرف جہالت کے سبب ہی باقی ہیں اگر تعلیم یافتہ ہوتے تو یہ سب ختم ہوگئیں ہوتیں۔تعلیم کی طرف سے عوامی غفلت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے پریم چند نے اپنے افسانہ ''روشنی'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کر لیا ہو اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔'' (افسانہ روشنی، مشمولہ مجموعہ واردات، ص ۷۲)

ناول میدانِ عمل میں پریم چند تعلیم کی اہمیت اور مقاصد کے ساتھ ہی اس کی ترویج کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''یہ مدرسہ ڈاکٹر صاحب کے بنگلے ہی میں تھا۔نو بجے تک ڈاکٹر صاحب خود تعلیم دیتے تھے۔اگرچہ یہاں فیس بالکل نہ لی جاتی تھی اور تعلیم کے جدید اور بہترین اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی پھر بھی لڑکوں کی تعداد بہت کم تھی۔۔مشکل سے دو ڈھائی سو لڑکے آتے تھے۔چھوٹے چھوٹے بھولے بھالے معصوم بچوں کا فطری نشو ونما کیسے ہو۔وہ کیسے باہمت، قناعت پسند، سچے خادم بن سکیں۔یہی اس کا خاص مقصد تھا۔'' (پریم چند، میدانِ عمل ص ۱۲۹)

تھیوسوفیکل سوسائٹی کے مدد سے بنارس میں ایک بڑے تعلیمی مرکز کا قیام عمل میں آیا تھا جو پریم چند کے نصب العین کی تکمیل کے سلسلہ میں ایک جز کی حیثیت رکھتا تھا۔اس سوسائٹی نے عالمی برادری کا جو تصور اس زمانے کے سماج کو دیا تھا اس میں بھی پریم چند کے لیے بڑی جاذبِ نظر تھی۔خود پریم چند کے نزدیک اعلیٰ انسانی اقدار کسی ایک ذات/ طبقے تک محدود نہیں تھیں۔وہ تمام انسانوں کے لیے سوچتے تھے۔ان کے اندر کا فن کار عام انسانوں کی محرومی پر تڑپ اٹھتا ہے جس کی عکاسی ہمیں ان کی تخلیقات میں نظر آتی ہیں۔

پریم چند نے ذات پات، اونچ نیچ کی تفریق کے نتیجے میں اچھوتوں کی کس مپرسی کی زندگی پر بھرپور توجہ دی ہے۔انھوں نے اچھوت طبقے کے وجود کو ہندو مذہب کے نام پر بڑا کلنک مانا ہے۔وہ اپنے ناول میدانِ عمل میں اس مسئلے پر تیکھا طنز کرتے ہیں اور اپنے ناولوں میں اس کا بیان کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے۔پریم چند اچھوتوں کو مندر کے باہر کتھا سننے کے واقعے اور دھرم بھرشٹ ہونے کے تصور اور اس ظلم کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

> ''آپ لوگوں نے ہاتھ کیوں بند کر لیے۔لگایئے خوب کس کس کر اور جوتوں سے کیا ہوتا ہے۔بندوقیں منگایئے اور ان بے دھرموں کا خاتمہ کر دیجئے۔اور تم دھرم کو ناپاک کرنے والو تم سب بیٹھ جاؤ اور جتنے جوتے کھا سکو کھاؤ۔تمھیں اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں سیٹھ، مہاجنوں کے بھگوان رہتے ہیں۔۔یہ بھگوان جواہرات کے زیور پہنتے ہیں۔موہن بھوگ اور ملائی کھاتے ہیں۔چیتھڑے پہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔'' (پریم چند، ناول میدانِ عمل، ص ۲۳۶)

اچھوت ہر ظلم وستم برداشت کرتے ہیں پھر بھی برہمنوں کو مقدس جان کر قابل پرستش سمجھتے ہیں۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کے وسیلے کو ضروری خیال کرتے۔ صدیوں سے چلی آرہی ان رسوم میں ان کا ذہن اس طرح ہموار ہوا کہ برہمنوں کو ہر طرح سے خوش رکھنا ہی ان کے لیے مذہب کا بنیادی فریضہ بن گیا۔ پریم چند نے برہمنوں کے طور طریقوں کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ بہت سی پوشیدہ گرہیں بھی روشن ہو جاتی ہیں:

''برہمنوں نے مذہب کو ہمیشہ اپنے خود غرضانہ مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔'' (قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص ۶۲۵)

ہریجن عورت کے ساتھ مذہبی رعب جما کر جنسی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کو پریم چند ''گئودان'' میں یوں اجاگر کرتے ہیں:

''آج تو تم یہاں سے نہ جانے پاؤ گی جھونا رانی! روج روج کلیجے پر چھری چلا کر بھاگ جاتی ہو۔ آج میرے ہاتھ سے نہ بچو گی۔۔ ایک چاہنے والے کا من رکھ لوگی تو تمھارا کیا بگڑے گا جھونا رانی! کبھی کبھی گریبوں پر دیا کیا کرو، نہیں بھگوان پوچھیں گے کہ میں نے تمھیں اتنا روپ کا دھن دیا تھا، تم نے اس سے ایک برہمن کا اپکار بھی نہیں کیا، تو کیا جواب دوگی؟ بولو! روپئے پیسے کا دان تو سدا ہی پاتا ہوں، آج روپ کا دان دو۔'' (پریم چند، گئودان، ص ۷۷۔۷۸)

اچھوتوں کے ساتھ جائز سلوک کے نتیجے میں جن پیش آنے والے حالات کی بظاہر اس عہد میں کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی پریم چند ان خطرات کا بخوبی اندازہ کر لیتے تھے جس کی نشاندہی ان کی تخلیقات میں نظر آتی ہے۔ چھوت چھات کی لعنت جس تباہ کن معاشرے کی تخلیق کر سکتی ہے پریم چند اس سے بخوبی واقف تھے اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ معاشرے کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔

4.7 پریم چند پر علی گڑھ تحریک کے اثرات

مذہبی وسماجی اصلاح کی یہ تحریکیں دوسرے مذاہب میں بھی شروع ہوئیں۔ کیوں کہ مسلمانوں کی حالت ہندؤں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی بلکہ بعض اعتبار سے تو ان کے مسائل اور بھی زیادہ پیچیدہ تھے، سیاسی اقتدار ختم ہو جانے کے بعد مسلم طبقہ خاص طور پر اثر انداز ہوا۔ کیوں کہ انگریزوں کو اقتدار حاصل کرنے کے لیے مسلم حکمراں سے ہی جنگ کرنی پڑی، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں انگریزوں کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو ہی خاص طور پر نشانہ بنایا گیا، جب یہ بغاوت ختم ہوگئی تو برطانوی حکمران نے مسلمانوں کو ہی بغاوت کا ذمہ دار قرار دے کر ان پر سخت مظالم ڈھائے۔ مسلم مخالف پالیسی اختیار کی اور ہر طرح سے مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کی، چنانچہ ان حالات میں کچھ روشن خیال لوگوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ کی کیوں کہ مسلم معاشرہ بھی بعض مذہبی اور بعض انگریز مخالفت کی وجہ سے جدید علوم سے بے زار تھا۔ جب کہ دوسرے مذاہب میں جدید علوم کی طرف رجحان بڑھا تھا چنانچہ ان تحریکوں نے مسلم معاشرہ کو جدید تعلیم فراہم کرنے پردے کے رواج اور کثرتِ ازدواج کے خلاف مہم شروع کی اور نیز نئے خیالات کی روشنی میں مذہب کی تشریح کی ان میں سے کچھ تحریکوں نے اپنے آپ کو جدید تعلیم کی توسیع اور اصلاحات کے لیے وقف کر دیا نیز کچھ تحریکیں برطانوی حکومت کے خلاف سیاسی مخالفت کے لیے قائم ہوئیں۔ ان تحریکوں نے عوام کو تبدیلی کی ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں نواب عبداللطیف نے بنگال میں ۱۸۶۳ء میں انگریزی زبان نیز جدید تعلیم کے حق میں ایک ادبی سوسائٹی ''محمڈن لیٹریری سوسائٹی'' قائم کی جس نے بنگال میں کئی

علمی ادارے قائم کئے۔

مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کرنے اور نئی تاریخی قوتوں اور زندگی کے لیے نئے تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا درس دینے کے لیے کئی تحریکیں سامنے آئیں ''احمدیہ تحریک'' اور دارالعلوم دیوبند'' وغیرہ اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں قدیم دلی کالج نے بھی مسلمانوں کے اندر نئے رجحان کو فروغ دینے میں بہت نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں مسلمانوں میں اصلاح سے متعلق سب سے زبردست اور حیرت انگیز کام سرسید احمد خاں نے شروع کیا، جس کو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے بھی یاد کیا گیا۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سرسید کے رفقائے کار کا بہت اہم رول رہا ہے۔ سرسید خود ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے ہندوسانیوں کو خاص طور پر مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی ضرورتوں پر غور کیا اور اپنی کوششوں سے زندگی کے ہر شعبے کو سیاست، ادب، تعلیم، معاشرت اور ہندوستانی مسلمانوں کے درپیش مسائل کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے، سرسید احمد خاں نے جہد وعمل کا درس دیا عزلت نشینوں کو گوشہ تنہائی سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا، ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا تنگ نظروں میں وسعت نظر سکھلائی اجداد کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے آپ میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

سرسید احمد خاں مسلمانوں کو تاریک اور تنگ راستے سے نکالنے کے لیے اور جدید علوم سے روشناس کرانے کے لیے پوری زندگی جدوجہد کرتے رہے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی وخوشحالی کے لیے پوری زندگی وقف کردی انھوں نے 'سائنٹفک سوسائٹی'' اور پھر ''ایم اے او کالج'' قائم کیا۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد ''تہذیب الاخلاق'' پرچہ جاری کیا تہذیب الاخلاق کے ذریعہ انھوں نے جدید علم بالخصوص انگریزی تعلیم کے فوائد کو مدِّنظر رکھا اور اپنے مضامین کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کا کام لیا خود بھی لکھا اور اپنے رفقائے کار سے بھی لکھوایا تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سرسید نے سیاسی سماجی وتہذیبی و مذہبی مسائل پر سنجیدہ مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا اور خاص طور پر انھوں نے اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بکثرت مضامین لکھے۔

علی گڑھ تحریک کی سب سے اہم خصوصیت عقلیت پسندی ہے انھوں نے ''توہم پرستی'' کے خلاف اور جذباتی کوششوں سے گریز کرنے اور جدید تہذیب وتمدن وجدید تعلیم کی طرف رجحان مبذول کرایا اس لحاظ سے سرسید کا یہ کارنامہ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ کہ انھوں نے منطقی واستدلالی طرز وطریق اپناتے ہوئے جدید معاشرے کے نشیب وفراز کو جدید تعلیم کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے عام مسلمانوں کی ذہنی بیداری کے لیے محض تخیلیت اور تصوریت کی دنیا سے نکل کر سماجی حقیقت کو عقلی دلائل کی روشنی میں سمجھنے اور جانچنے پر زور دیا ہے۔

غرض سرسید تحریک نے سیاسی ومعاشرتی تہذیبی وفکری علمی وادبی و مذہبی اقدار کی اصلاح کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیئے گرچہ سرسید تحریک کی مخالفت بھی کی گئی لیکن وہ کسی بھی عتاب سے بےخبر اپنے اصلاحی کاموں کے اغراض ومقاصد میں لگے رہے۔ ان اصلاحی کاموں کے اغراض ومقاصد کے لیے مغربی افکار وخیالات ونظریات کو مشعل راہ بنایا جن سے روشنی پاکر مغربی قومیں اس قدر طاقتور اور ترقی یافتہ ہوئی تھیں۔

سرسید کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے فکر وعمل کا رخ بہت حد تک موڑ دیا اور سماج کا ایک بہت بڑا طبقہ ان کے ساتھ ہوگیا، جس نے اصلاحی مقاصد کی تکمیل میں ان کا ساتھ دیا اور یہ انھیں کی برکتوں کا نتیجہ ہے کہ آج قوم ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے

کے قابل ہوئی ہے۔

مندرجہ بالا تحریکوں نے ہندوستان کی سماجی معاشرتی و مذہبی زندگی کی تعمیر میں نمایاں کارنامے انجام دیئے جس کے زیر اثر کئی سماجی اصلاحات بھی عمل میں آئیں ان تحریکات نے خاص طور پر نئے متوسط طبقہ کی آئینہ داری کی ہے کیوں کہ انگریزی اقتدار کے بعد متوسط طبقے کی معاشی و معاشرتی زندگی زیادہ متاثر تھی۔ اس طبقہ کے لوگ اپنی معاشی و سماجی زندگی کی فلاح و بہبود چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس طبقہ نے زندگی کے نئے سماجی رشتے اور نئی معاشی قوتوں سے ہم آہنگ ہو کر مغربی افکار و خیالات اور جدید تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے قبول کیا۔ یہ تمام تحریکیں ہندوستانیوں کے اجتماعی ذہنی رویہ کی آئینہ دار ہیں جس نے تقریباً پورے ملک کے لوگوں کو متاثر کیا۔

4.8 پریم چند پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

ترقی پسند تحریک سے پریم چند کا تعلق بہت گہرا رہا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے ترقی پسند تحریک جو کہ اپنے وقت اور حالات کی پیداوار ہے جس کا رشتہ دراصل آزادی کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اس کے وجود میں آنے کے پیچھے ملک کے سیاسی سماجی و اقتصادی حالات کارفرما رہے ہیں ان حالات کا ذکر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''ہندوستان میں قومی بیداری کی جو لہر اٹھی تھی اس میں گرچہ بنیادی طور پر یہاں کے سیاسی و اقتصادی حالات اور برطانوی سرمایہ داری کی سخت گیریوں کو دخل تھا، لیکن قومیت کے جدید تصور کے ساتھ ہی بین الاقوامی مسائل کا شعور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا.....۱۹۰۵ء کے انقلاب روس سے ساری دنیا میں عوامی تحریکوں کا دھارا پھوٹ پڑا اور ایشیا کے محکوم ممالک اپنی گہری نیند سے چونک اٹھے اور پھر ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس کے اثرات اور ہنگامہ یلقان میں ہندوستان کا ترکی سے تعاون اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اب سیاسی و سماجی مسائل کی سطح ملکی و علاقائی حدود سے نکل کر ایک وسیع تر سرحد میں داخل ہو رہی ہے.....اس سیاسی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے آثار سے پورے مغرب میں ہلچل پیدا ہوگئی اس کا اثر ہندوستانی طلباء پر خاص طور پر پڑا جو کہ یوروپ کی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔'' (خلیل الرحمٰن اعظمی: اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص:۳۱)

ان حالات و واقعات سے وہ ہندوستانی نوجوان جوان دنوں یوروپ میں مقیم تھے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، انھیں دانشوروں نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی، ہندوستان آنے کے بعد سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے یہاں پر بھی ترقی پسند مصنفین کی تنظیم شروع کی تو ہمارے ملک کے دانشوروں اور ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا، ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کو سماج کے حقیقی و بنیادی مسائل سے جوڑنا اور تہذیبی معاشرتی سیاسی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کی ترجمانی کرنا اور ساتھ ہی دولت اور محنت کے افتراق، لوٹ گھسوٹ کو ختم کر کے مساوات کا نظام قائم کرنا رہا ہے۔

پریم چند جیسا حساس اور دردمند ادیب کیسے الگ رہ سکتے تھے۔ پریم چند کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی ذہنی و نظریاتی رہی ہے کیوں کہ ترقی پسند مصنفین نے جو اعلان نامہ پیش کیا اس کے خیالات کو پریم چند اس سے قبل سے ہی اپنی تخلیقات میں پیش کر رہے تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس پریم چند کی صدارت میں ہوئی اس موقع پر جو صدارتی خطبہ انھوں نے دیا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے واضح کیا کہ ادب کیا ہے؟ اس کے فوائد اور ایک ادیب کے فرائض کیا ہیں انھوں نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ

''میرے خیال میں ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ پریم چند نے اپنے اس خطبے میں آرٹ کی افادیت، مقصد، ذوقِ حسن کی تقویت پر زور دیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا اسی کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں، رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا جھونپڑے اور کھنڈرات اس کے قابل نہ تھے انھیں انسانیت کے دامن سے وہ خارج سمجھتا تھا آرٹ نام محدود صورت پرستی کا الفاظ کی ترکیبوں کا خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔

پریم چند نے اپنے اس خطبے میں آخر میں ادب کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے ادب کے زندگی سے تعلق اور ادیبوں کے سماجی فریضے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے ایک نظام کی تکمیل کرنی ہے ہمارے لٹریچر کو اس آئیڈیل کو پیش کرنا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو تعمیر کی روح ہو زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے حالات اور وقت کے تقاضوں سے ہندوستانی ادیبوں فنکاروں اور نوجوانوں کو ادب اور زندگی رشتے ادیب کے فرائض اور ادب کے مقاصد سے واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور بگڑی ہوئی صورتِ حال کا مقابلہ کریں۔ اس طرح پریم چند نے گذشتہ صفحات میں مذکورہ تمام اصلاحی وقومی تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنی تمام تحریروں کے ذریعہ جذبہ بیداری کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اپنے فن کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا۔

4.9 پریم چند پر عدم تعاون تحریک کے اثرات

غیر ملکیوں نے اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے جو طریقہ کار اپنایا تھا ان کے اثرات پورے ملک پر خاص طور سے عام رعایا پر پڑ رہے تھے۔ حکومت کی اقتصادی ومعاشی پالیسیوں کے نتیجے میں عام بےچینی اور بیزاری پیدا ہو رہی تھی۔ وہ نوجوان جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد غیر ممالک سے واپس آتے، اپنے مشاہدات وتاثرات سے برادرانِ وطن کو متعارف کراتے۔ اس پس منظر میں سماجی ومذہبی تحریکوں نے ایک عام سیاسی بیداری کی فضا پیدا کر رکھی تھی جس کے نتیجہ میں بعض باشعور سرکاری ملازمین بھی اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ دے رہے تھے۔ پریم چند نے بھی گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہو کر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ پریم چند نے اپنے افسانہ ''لال فیتہ'' میں اس تحریک کو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔ یہ افسانہ قاری کو جنگ آزادی کی حمایت اور اس میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ ''لال فیتہ' کا ہیرو ہری بلاس جو ایک انصاف پسند ڈپٹی مجسٹریٹ ہے، اسے پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں، انگریزوں کے ساتھ پوری وفاداری کا ثبوت دینے کے صلے میں رائے بہادری کے اعزاز سے نوازا جاتا ہے اور ساتھ ہی ایک سرکاری مراسلہ بھی دیا جاتا ہے جو سرخ فیتے میں بندھا ہوتا ہے۔ مراسلے کو پڑھتے ہی ہری بلاس کے جذبات میں ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ اس کے سینے میں حب الوطنی کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور وہ اپنے ذاتی مفادات کو ترک کرتے ہوئے سرکار کو جواب لکھتا ہے۔

''میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتیٰ الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیا۔ ممکن

ہے حکام بعض موقعوں پر مجھ سے خوش نہ رہے ہوں اس لیے کہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہ سمجھا۔ جب کبھی میرے احساس قانون اور حکم حاکم میں تناقص ہوا، میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمت ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا لیکن مراسلہ۔۔میں جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں اور میرے خیال میں ان میں ناحق پروری کو اتنا دخل ہے کہ میں اپنے تئیں ان کی تکمیل کے لیے۔۔آمادہ نہیں کرسکتا۔۔لہٰذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا تاخیر اس عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔'' (پریم چند، لال فیتہ، مشمولہ ماہنامہ زمانہ، جولائی ۱۹۲۱ء، ص ۳۷)

4.10 پریم چند پر تحریکِ جنگِ آزدی کے اثرات

پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی ملک کی آزادی کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اپنے پہلے مجموعہ 'سوزِ وطن' کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

''ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حبِ وطن کی عظمت کا نشہ جمائیں۔''

پریم چند نے حالات اور وقت کے تقاضوں سے قوم کو واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہوکر غلامی اور خراب صورتِ حال کا مقابلہ کریں۔ اپنی دھرتی سے قلبی لگاؤ، آزادی کے لیے تڑپ اور لگن کا اظہار، پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تحریروں سے بھی ہوتا ہے وہ اپنے رسالہ ہنس ۱۹۳۰ء کے شمارہ میں نوجوانوں کو بڑے ہی ولولہ انگیز انداز میں جنگِ آزادی کے لیے اکساتے ہیں:

''تمھاری آنکھوں کے سامنے دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں ہوگئیں، تم نہیں جانتے؟ روس کی زار شاہی مٹ گئی۔ ایران کی کج کلاہی مٹ گئی ترکی کی شہنشاہی مٹ گئی، چین کی خاقانی مٹ گئی۔ جرمنی کی قیصر شاہی مٹ گئی۔ یہاں تک کہ اسپین نے بھی آزادی کی سانس لی، مگر بھارت کہاں ہے؟ وہیں جہاں تھا۔ دین، دکھی، دریدر۔ کیا تم جوان ہوکر بھی اس بوڑھی، کھوسٹ، شرمناک، بزدلی سے بھری ہوئی، خوشامد میں ڈوبی ہوئی نیت کا پالن کروگے؟ کبھی نہیں، تم نئے یُگ کے نام لیوا ہو، تم جوان ہو۔ ابھی نیچ سوارتھ نے تمھیں اپنے رنگ میں نہیں رنگا۔ ابھی تمھاری کمر نے جھکنا نہیں سیکھا۔ تمھارے سر نے سجدہ کرنا نہیں سیکھا تم میں جوش ہے۔ ہمیں تم سے امید ہے۔''

(بحوالہ کہانی کار، پریم چند نمبر، جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۱ء ص ۵۲)

غیر ملکیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور مذہبی قوت نے بہت سے ذہنوں کو متزلزل کر دیا تھا۔ اس پس منظر میں متعدد تحریکیں وجود میں آکر سرگرمِ عمل ہوچکی تھیں جن کا سلسلہ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید وغیرہ کی تنظیموں سے جوڑ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجنوں شاہ کی فقیری تحریک، کرم شاہ کی تحریک جو پاگل پنتھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک اور تیتو میر کی تحریک بھی قابلِ ذکر ہے۔ لیکن ان تمام تحریکوں میں شاہ ولی اللہ کی تحریکِ مجاہدین سب سے اہم ہے۔ ابتداً یہ ساری تحریکیں مذہبی رہیں مگر بعد میں ان کا دائرہ عمل وسیع ہوا۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک انگریزوں کے خلاف پوری طرح صف آرا ہوکر نعرۂ جہاد دے کر حریت کی آگ

پورے ملک میں پھیلا دی۔

ملکی سیاست کے سارے اتار چڑھاؤ جنھوں نے پوری قومی زندگی کو متاثر کر دیا تھا، دوسرے ادیبوں کی طرح پریم چند کو بھی تحریک دے رہے تھے۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات کے سہارے ہندوستانیوں کو مادرِ وطن کی عظمت کا احساس دلایا اور ان میں سرفروشی کی تمنا پیدا کی۔ وہ افسانہ 'قاتل' میں ایسے مجاہدوں سے متعارف کراتے ہیں جن کا کہنا تھا کہ یہ لڑائی انفرادی نہیں ہے۔ بلکہ انگریزوں کی مجموعی طاقت سے ہے۔ میں مروں یا میرے بدلے کوئی دوسرا مرے اس میں کوئی فرق نہیں۔ جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہے اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔

پریم چند کی تحریروں میں شاہ ولی اللہ کی تحریک کا بھی بہت کچھ اثر دکھائی پڑتا ہے۔ جہاد میں شہادت حاصل کر کے زندۂ جاوید ہو جانے کا تصور، مادرِ وطن کے لیے شہید ہو جانے کی آرزو، آزادی کی خاطر سب کچھ نثار کر دینے کی تمنا، ایک مجاہد کی نمایاں خوبیاں ہوا کرتی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں اور کردار و میں جا بجا شاہ صاحب کے مجاہدین کا عکس ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں آزادی کے لیے جو تیزی، تندی اور حرارت ملتی ہے۔ وہ بہت کچھ شاہ صاحب کے مجاہدین کی مرہونِ منت ہے۔ وہ افسانہ ''جیل'' میں اپنے احساسات کو بڑے جذباتی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ افسانہ کا ہیرو وشمبھر اپنی محبوبہ روپ متی سے کہتا ہے:

''جانتی ہو سارے ملک کے لیے سوراج، اتنے عظیم مقصد کے لیے مرجانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔''

پورے ملک میں مختلف سماجی اور سیاسی تحریکیں، اصلاحی اور فلاحی کاموں میں سرگرمِ عمل تھیں اور عوام کو دعوتِ فکر و عمل دے رہی تھیں۔ مگر ان سرگرمیوں کے مرکز شہر تھے۔ وسائل کی آسانی کے سبب شہر ایک دوسرے سے مربوط تھے اور اخبارات باخبر رکھنے کا ایک ذریعہ بن چکے تھے۔ لیکن ملک کی آبادی کی اکثریت تو دیہات پر مشتمل تھی۔ دیہات بھی ایسے، جہاں رسائی مشکل سے ممکن ہو پھر وسائل کی اس قدر کمی تھی کہ ان سے رابطہ قائم رکھنا دشوار ترین مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اسی سبب ان تحریکوں کی کاوشیں شہروں میں تو کامیابی سے ہم کنار ہو چلی تھیں مگر دیہاتوں میں ان کے اثرات مرتب نہیں ہو رہے تھے۔ پریم چند نے بحیثیت ادیب ان تحریکوں اور ان سے متعلق بعض شخصیتوں سے متاثر ہو کر دیہی عوام کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ دی اور جذبۂ بیداری کو اپنی تحریروں کے ذریعہ اور بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی جو مختلف تحریکوں کے اصل محرک تھے۔

جنگِ آزادی کی تحریک ۱۹۲۵ء تک پہنچتے پہنچتے شہروں سے نکل کر گاؤں اور دیہاتوں کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی اور اس وقت تک مہاتما گاندھی جیسے رہنما ہندوستان واس آنے کے بعد تحریک آزادی میں شامل ہو چکے تھے اس وقت کانگریس پارٹی کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھوں میں تھی گاندھی ج جدوجہدِ آزادی اور ملک کے سیاسی حالات کو گاؤں تک پہنچانا شروع کیا ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان گاؤں میں بستا ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا سیاسی شعور بیدار ہوا۔ پریم چند خود بھی گورکھپور کی قیام کے دوران گاندھی جی کے خیالات سے متاثر ہو کر عدم تعاون تحریک کی حمایت کی اور گاندھی جی کے خیالاتے کا پرچار گاؤں پھیلایات شیورانی دیوی سے گفتگو کے دوران پریم چند نے اس بات کا اعتراف کیا کہ:

> ''میں مہاتما گاندھی کا طرفدار نہیں بلکہ ان کا چیلہ تو اسی وقت ہو گیا تھا جب وہ گورکھپور میں آئے تھے۔ دنیا میں مہاتما گاندھی کو میں سب سے بڑا مانتا ہوں۔ ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ مزدور اور کاشتکار سکھی ہوں اور وہ لوگوں کو آگے بڑھانے کے لیے آندولن چلا رہے ہیں اور میں لکھ کر ان کا حوصلہ بڑھا رہا ہوں مہاتما گاندھی بھی ہندو اور

مسلم کی ایکتا چاہتے تھے میں ہندو اور اردو کو ملا کر ہندوستان بنانا چاہتا ہوں۔'' (شیورانی دیوی، پریم چند گھر میں، ص ۷۸)

پریم چند نے سیاسید میدان میں گاندھی جی کے آنے کے بعد ان کے نظریات کو قبول کیا جس کا اعتراف کرتے ہوئے پریم چند کے لڑکے امرت رائے نے بھی لکھا ہے:

''عملی میدان میں گاندھی جی اور ان کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔'' (شیورانی دیوی، پریم چند گھر میں، ص ۸۰)

اب پریم چند نے گاندھی جی کے خیالات کو دیہاتوں اور گاؤں میں پھیلانا شروع کیا اپنے آبائی گاؤں واپس آنے کے بعد گاندھی جی کے پروگرام کو فروغ دینے کے لیے چرخے کی تجارت بھی شوع کی اور دیہاتوں کے مسائل کو دور کرنے کے لیے صبح وقت مقرر کر رکھا تھا۔ روزانہ صبح کو ان کے مسائل کو سنتے اور ستیہ گرہ کی اہمیت سمجھاتے اور ملک کی آزادی کے پروگراموں سے بھی روشناس کراتے۔ انھوں نے گاؤں میں مفت چرخے بھی تقسیم کروائے اور ان کے استعمال کی تربیت اور اسکی اہمیت سے واقف کرایا۔ دیہاتوں کے حالات سے واقفیت کے لیے وہ خود بھی گاؤں کا دورہ کرتے ان کے مسائل کو سمجھتے اور اپنے خیالات لوگوں کے سامنے رکھتے پریم چند کے مہاتما گاندھی کے تصور آزادی سے متاثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گاندھی جی جن لوگوں کے لیے لڑ رہے تھے وہی کام پریم چند اپنی قلم کے ذریعہ بہت پہلے سے انجام دے رہے تھے۔

پریم چند کے خیالات میں وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلی آئی ہے اور اپنے آخری دور میں سوشلسٹ نظام کو ہی بہترین نظام قرار دیتے ہیں، اور تادم آخر اس میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ بات قابل غور ہے کہ پریم چند آزادی کے متوالے تھے اور ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے، اور اس کے لیے وہ پوری زندگی اپنی قلم کے ذریعہ انگریزی سامراج کے خلاف لڑتے رہے۔ وہ مزدور اور کسانوں کی فلاح کے لیے ہمیشہ کام کرتے رہے اور کانگریس کے ساتھ آخر وقت تک قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ کبھی بھی پریم چند نے اس جدوجہد سے دامن نہیں کھینچا اور نہ ہی ادیب کے منصب سے کبھی غافل رہے۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے اصولوں پر قائم رہے اور برطانوی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے کی کوشش کرتے رہے۔

4.11 آپ نے کیا سیکھا

- آپ نے دیکھا پریم چند سے قبل ہندوستان میں بعض مذہبی اور سماجی تحریکیں اصلاح کی غرض سے وجود میں آچکی تھیں۔ پریم چند ذہنی طور پر ان تحریکوں سے متعلق بعض شخصیتوں کے زیر اثر تھے۔ راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی غرض سے بنگال میں ''برہموسبھا'' کی بنیاد رکھی تھی۔
- آپنے پڑھا کہ برہموسبھا نے کچھ عرصہ بعد ''برہموسماج'' کے نام سے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک نے قدامت پرستی اور تنگ نظری پر مبنی بعض فرسودہ رسوم کے خلاف مورچہ قائم کیا، خدائے واحد کی طرف ہندو قوم کو رغبت دلائی، عورتوں کی زبوں حالی پر توجہ دی۔ ستی کی رسم کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا۔
- آریہ سماج تحریک کے اثرات کے تحت آپ لوگوں نے پڑھا کہ پریم چند سوامی وویکانند کی بارعب اور پروقار شخصیت کی دل نشین تصویر 'جلوۂ ایثار' میں پیش کرتے ہیں۔ پریم چند نے اس ناول میں توہم پرستی، اندھی تقلید اور فرسودہ رسم ورواج کے خلاف صدائے احتجاج

بلند کی ہے اور بیوہ کی شادی اور مختلف ذاتوں کے بیچ رشتے قائم کرنے کی تحریک کی ہے۔

- اس کے علاوہ پریم چند کی تحریروں میں ہمیں اس عہد کی مختلف تحریکوں کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ راما کرشنا تحریک، تھیوسوفیکل سوسائٹی، علی گڑھ تحریک کے اثرات ان کی تحریروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ پریم چند خود بھی ترقی پسند ادبی تحریک کے رکن تھے اور ہندوستان میں اس کے فروغ میں ان نام بنیاد گزاروں میں شامل ہے۔
- جنگِ آزادی کی تحریک کے اثرات پریم چند پر صاف نمایاں ہیں چاہے وہ گاندھیائی نقطۂ نظر کا اظہار ہو یا پھر قوم کے نوجوانوں میں جذبۂ آزادی کی چنگاری بھڑکانے کا کام ہو پریم چند نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا انھوں نے اپنے افسانوی اور غیر افسانوی دونوں ہی تحریروں کے ذریعہ یہ کام انجام دیا۔

4.12 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ پریم چند پر راما کرشنا مشن کے اثرات کا جائزہ لیجئے؟

2۔ پریم چند پر آریہ سماج تحریک کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیجئے؟

3۔ پریم چند پر تھیوسوفیکل سوسائٹی کے اثرات کیا ہیں، روشنی ڈالئے؟

4۔ پریم چند پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کا جائزہ لیجئے؟

5۔ پریم چند اور جنگِ آزادی پر ایک مفصل نوٹ قلم بند کیجئے؟

4.13 سوالات کے جوابات

جواب نمبر 1۔ برہمو سماج اور آریہ سماج تحریکوں کے علاوہ پریم چند ایک تیسری تحریک ''راما کرشنا'' کے بھی بڑے مداح تھے جو اس زمانہ میں ملک گیر حیثیت حاصل کر رہی تھی۔ راما کرشنا مشن کی بنیاد بنگال کے ایک برہمن جوگی شری رام کرشن پرم ہنس نے رکھی تھی۔ یہ تحریک جوگی جی کے نام کی مناسبت سے مشہور ہوئی۔ بنکم چندر چٹرجی اور گریش چندر گھوش جیسے ادیب اس مشن کے ہمنوا ہوئے لیکن سب سے ممتاز نام سوامی وویکانند کا ہے جو بڑے پایے کے خطیب، مفکر اور اپنے مخصوص مذہبی معاملات کے زبردست عالم تھے۔ انھون نے اپنے زورِ بیان اور زورِ استدلال سے اس تحریک میں جان ڈال دی۔ ان کے کارناموں سے پریم چند بھی نہایت متاثر تھے چنانچہ وہ ان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ماہنامہ ''زمانہ'' کے شمارہ مئی ۱۹۰۸ء میں ''سوامی وویکانند'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

''گزشتہ صدی عیسوی کے ابتدا میں مادیت نے سر اٹھایا۔ اس کا حملہ ایسا پرزور تھا کہ ہندوستان کی روحانیت کو اس کے مقابل میں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ایسی حالت میں ہندوستان کی خاک پاک سے پھر ایک بزرگ اٹھا جو روحانیت کے جوش سے معمور تھا۔ جس کا دل محبت سے لبریز تھا۔ یہ اس نفس پاک کی تعلیم کی برکت ہے کہ آج ہم اپنے قدیم معیاروں کی پرستش کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

پریم چند سوامی وویکانند کی بارعب اور پروقار شخصیت کی دل نشین تصویر 'جلوۂ ایثار' میں پیش کرتے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو سوامی جی کی طرح ''ذہین اور متین معصوم اور خوبصورت ہے۔

''سوامی جی نہایت وجیہہ و شکیل بزرگ تھے۔ آپ کی نگاہ میں برقی تاثیر تھی۔ چہرہ روحانیت کے رعب و جلال سے منور تھا۔ مزاج بہت سادہ اور روش بالکل منکسرانہ تھی۔ ان کی علمیت لامحدود تھی۔'' (بحوالہ ڈاکٹر قمر رئیس،

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص ۲۱۲۔۲۱۳)

وویکانند نے اپنے گرو کی تعلیمات کو پھیلانے کے خاطر دور دراز علاقوں کے علاوہ غیر ممالک کے بھی سفر کیے۔ ان کی تعلیمات کے زیر اثر پریم چند مذکورہ مضمون میں ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''سری سوامی وویکانند کی تعلیم روحانیت کی کرامات ہے۔۔سوامی جی کی تلقینات کا لب لباب یہ تھا کہ ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں، روحانیت حاصل کریں۔ شہ زور اور دلاور ہوں۔ نیچی ذاتوں کو ابھاریں اور انھیں اپنا بھائی سمجھیں۔ ہندو فلسفہ کے عملی پہلو پر عمل کریں اور نفس کشی اور ریاضت اور ترک ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جنھیں ایشور نے ان بلندیوں تک پہنچنے کی توفیق دی ہے۔''

جواب نمبر 2۔ برہمو سماج کے بعد ایک دوسری تحریک آریہ سماج نے ملک گیر اثرات مرتب کیے۔ آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی نے ۱۰/اپریل ۱۸۷۵ء کو بمبئی میں رکھی۔ رفتہ رفتہ دوسری جگہوں پر بھی اس تحریک کی شاخیں قائم ہوتی گئیں۔ اس تحریک نے بت پرستی کے خلاف زبردست صدائے احتجاج بلند کیا۔ اس تحریک کے رہنماؤں نے ہندوستانی معاشرہ میں ذات پات کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے سخت اقدامات اٹھائے، تعلیم کو فروغ دینے بالخصوص تعلیم نسواں کے لیے پرزور حمایت کی، مذہبی روپ دھارن کر لینے والے رسوم ورواج سے ہندو مذہب کا دامن پاک کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

پریم چند سوامی جی کی شخصیت اور ان کی تحریک کی افادیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے تنگ نظری اور پرانے رسوم پر اپنے ڈرامہ 'روحانی شادی' میں سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس ڈرامہ کے آخری منظر میں ہیروئین مس جنی کہتی ہے:

''میں نے ایک قابلِ قدر ہستی کو رسوم پر قربان کیا اور آج ان رسوم کو اس کے نام پر قربان کردوں گیا۔۔ ہمارے رسوم کتنے مہلک ہیں۔۔ جسے ہم مذہب کہتے ہیں محض رسوم کا پھندا ہے۔ ہماری روح اور ضمیر کی آزادی اس پھندے میں تڑپتی ہے۔۔ میں آج بلند آواز سے کہتی ہوں کہ انسان عقائد سے زیادہ اہم اور کہیں زیادہ بیش بہا ہے۔''

شروعات میں آریہ سماج کا مقصد مذہبی تعلیم کے فروغ تک ہی محدود تھا پھر قوم کے مفاد میں اس کا دائرہ عمل وسیع ہوتا گیا۔ آریہ سماجی تحریک سے پریم چند کو جو روحانی لگاؤ تھا اس کا اظہار ان کے ناول ''ہم خرما وہم ثواب'' میں ہوتا ہے۔ اس ناول کا ہیرو 'امرت رائے' ایک نوجوان وکیل ہے۔ وہ سناتن دھرم چھوڑ کر آریہ سماجی عقیدے کا معتقد ہو جاتا ہے اور بڑے زور وشور کے ساتھ اس راہ کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ دھرم کے مروجہ معمولات سے انحراف کے سبب اس کی شادی پریما سے نہیں ہو پاتی ہے۔ لالہ بدری پرشاد اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا ہونے والا داماد 'ادھرمی' ہو کر روایات پر تنقید کرے اور قدیم ہندو تہذیب کی بے حرمتی کا مرتکب ہو۔ امرت رائے محبت کے جذبہ کو قوم کی خدمت کے فرض پر قربان کر دیتا ہے۔

پریم چند نے اس ناول میں توہم پرستی، اندھی تقلید اور فرسودہ رسم ورواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اور بیوہ کی شادی اور مختلف ذاتوں کے بیچ رشتے قائم کرنے کی تحریک کی ہے۔

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی خود بھی برہمو سماج تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اسی سبب دونوں تحریکوں میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے اور بادی النظر میں کوئی بڑا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ آریہ سماج اور برہمو سماج، ان دونوں تحریکوں نے ہندو قوم کی تعمیر انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی بنیاد پر جدید تقاضوں کے مطابق کرنی چاہی۔ ذات پات کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی۔ تعلیمی اہمیت پر زور دیا۔ علم کی اہمیت پر دونوں تحریکوں میں یکساں زور دیا جاتا تھا۔ دونوں کے حامیوں نے متعدد مقامات پر اسکول اور کالج کھولے۔ ویدک

علوم کو جدید سائنسی تقاضوں کے مطابق پیش کیا۔

جواب نمبر 3۔ ہندوستان کی قومی اور سماجی تعمیر میں بعض غیر ملکی اداروں اور افراد کی کاوشیں بھی شامل رہی ہیں جنھوں نے ملک کو مغرب کے نئے رجحانات سے آگاہ کرایا اور ذی شعور حضرات کو مشعلِ راہ دکھائی۔ان میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس سوسائٹی کا وجود نیویارک (امریکہ) میں ۷ر دسمبر ۱۸۷۵ء کو عمل میں آیا تھا۔اس کی شاخ ۱۸۸۲ء میں کرنل اسکات اور میڈم بلاواٹسکی نے مدراس میں قائم کی تھی۔لیکن گیارہ سال بعد ۱۸۹۳ میں اینی بیسنٹ نے ہندوستان آ کر اس کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور اس کو متحرک و فعال بنا دیا۔تھیوسوفیکل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام بنارس میں سنٹرل ہندو اسکول کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں مدن موہن مالویہ کی سرکردگی میں ترقی کر کے ہندو یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔اس سوسائٹی کے کچھ اصول تھے جن کے دائرے میں رہ کر انھوں نے اپنے کام کو آگے بڑھایا۔ اس نے سماجی اصلاح کے لیے کوششیں کیں اور تعلیم کے فروغ کی پرزور حمایت اور سعی کی۔ پریم چند کو بھی ہندوستانیوں میں تعلیم کی کمی کا احساس تھا۔اور وہ بھی ہندوستانیوں میں تعلیم کے رواج کو عام کرنا چاہتے تھے۔افسانوی مجموعے زادِراہ، خاکِ پروانہ اور واردات کے اکثر افسانوں میں انھوں نے تعلیم کی قدر و قیمت پر مختلف زاویوں سے زور دیا ہے۔ناول گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی اور میدانِ عمل میں تفصیل کے ساتھ تعلیمی مسائل کی اہمیت سے بحث کی ہے۔ان کا یہ ماننا تھا کہ بہت سی معاشرتی خرابیاں صرف جہالت کے سبب ہی باقی ہیں اگر تعلیم یافتہ ہوتے تو یہ سب ختم ہو گئیں ہوتیں۔تعلیم کی طرف سے عوامی غفلت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے پریم چند نے اپنے افسانہ ''روشنی'' میں اس مسئلہ کو پوری طرح روشن کر دیا ہے۔

تھیوسوفیکل سوسائٹی کے مدد سے بنارس میں ایک بڑے تعلیمی مرکز کا قیام عمل میں آیا تھا جو پریم چند کے نصب العین کی تکمیل کے سلسلہ میں ایک جز کی حیثیت رکھتا تھا۔اس سوسائٹی نے عالمی برادری کا جو تصور اس زمانے کے سماج کو دیا تھا اس میں بھی پریم چند کے لیے بڑی جاذبِ نظر تھی۔خود پریم چند کے نزدیک اعلیٰ انسانی اقدار کسی ایک ذات/ طبقے تک محدود نہیں تھیں۔وہ تمام انسانوں کے لیے سوچتے تھے۔ان کے اندر کا فن کار عام انسانوں کی محرومی پر تڑپ اٹھتا ہے جس کی عکاسی ہمیں ان کی تخلیقات میں نظر آتی ہیں۔ پریم چند نے ذات پات، اونچ نیچ کی تفریق کے نتیجے میں اچھوتوں کی کس مپرسی کی زندگی پر بھرپور توجہ دی ہے۔

جواب نمبر 4۔ ترقی پسند تحریک سے پریم چند کا تعلق بہت گہرا رہا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے ترقی پسند تحریک جو کہ اپنے وقت اور حالات کی پیداوار ہے جس کا رشتہ دراصل آزادی کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اس کے وجود میں آنے کے پیچھے ملک کے سیاسی سماجی و اقتصادی حالات کارفرما رہے ہیں۔ان حالات و واقعات سے وہ ہندوستانی نوجوان جوان دنوں یوروپ میں مقیم تھے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، انھیں دانشوروں نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی، ہندوستان آنے کے بعد سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے یہاں پر بھی ترقی پسند مصنفین کی تنظیم شروع کی تو ہمارے ملک کے دانشوروں اور ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا، ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کو سماج کے حقیقی و بنیادی مسائل سے جوڑنا اور تہذیبی معاشرتی سیاسی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کی ترجمانی کرنا اور ساتھ ہی دولت اور محنت کے افتراق، لوٹ گھسوٹ کو ختم کر کے مساوات کا نظام قائم کرنا رہا ہے۔

پریم چند جیسا حساس اور دردمند ادیب کیسے الگ رہ سکتے تھے۔ پریم چند کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی ذہنی و نظریاتی رہی ہے کیوں کہ ترقی پسند مصنفین نے جو اعلان نامہ پیش کیا اس کے خیالات کو پریم چند اس سے قبل سے ہی اپنی تخلیقات میں پیش کر رہے تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس پریم چند کی صدارت میں ہوئی اس موقع پر جو صدارتی خطبہ انھوں نے دیا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس

میں انھوں نے واضح کیا کہ ادب کیا ہے؟ اس کے فوائد اور ایک ادیب کے فرائض کیا ہیں انھوں نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے خیال میں ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ پریم چند نے اپنے اس خطبے میں آرٹ کی افادیت، مقصد، ذوقِ حسن کی تقویت پر زور دیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا ہمارا آرٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا اسی کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں، رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا جھونپڑے اور کھنڈرات اس کے قابل نہ تھے انھیں انسانیت کے دامن سے وہ خارج سمجھتا تھا آرٹ نام محدود صورت پرستی کا الفاظ کی ترکیبوں کا خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔

پریم چند نے اپنے اس خطبے میں آخر میں ادب کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے ادب کے زندگی سے تعلق اور ادیبوں کے سماجی فریضے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے ایک نظام کی تکمیل کرنی ہے ہمارے لٹریچر کو اس آئیڈیل کو پیش کرنا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو تعمیر کی روح ہو زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے حالات اور وقت کے تقاضوں سے ہندوستانی ادیبوں فنکاروں اور نوجوانوں کو ادب اور زندگی رشتے ادیب کے فرائض اور ادب کے مقاصد سے واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور بگڑی ہوئی صورتِ حال کا مقابلہ کریں۔ اس طرح پریم چند نے گذشتہ صفحات میں مذکورہ تمام اصلاحی وقومی تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنی تمام تحریروں کے ذریعہ جذبہ بیداری کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اپنے فن کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا۔

جواب نمبر 5۔ پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی ملک کی آزادی کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اپنے پہلے مجموعہ 'سوزِ وطن' کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ ''ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حبِ وطن کی عظمت کا نشہ جمائیں۔''

پریم چند نے حالات اور وقت کے تقاضوں سے قوم کو واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور خراب صورتِ حال کا مقابلہ کریں۔ اپنی دھرتی سے قلبی لگاؤ، آزادی کے لیے تڑپ اور لگن کا اظہار، پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تحریروں سے بھی ہوتا ہے وہ اپنے رسالہ ہنس ۱۹۳۰ء کے شمارہ میں نوجوانوں کو بڑے ہی ولولہ انگیز انداز میں جنگِ آزادی کے لیے اکساتے ہیں:

> ''تمھاری آنکھوں کے سامنے دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں ہوگئیں، تم نہیں جانتے؟ روس کی زار شاہی مٹ گئی۔ ایران کی کج کلاہی مٹ گئی ترکی کی شہنشاہی مٹ گئی، چین کی خاقانی مٹ گئی۔ جرمنی کی قیصر شاہی مٹ گئی۔ یہاں تک کہ اسپین نے بھی آزادی کی سانس لی، مگر بھارت کہاں ہے؟ وہیں جہاں تھا۔ دین، دکھی، دریدر۔ کیا تم جوان ہو کر بھی اس بوڑھی، کھوسٹ، شرمناک، بزدلی سے بھری ہوئی، خوشامد میں ڈوبی ہوئی نیت کا پالن کرو گے؟ کبھی نہیں، تم نئے یُگ کے نام لیوا ہو، تم جوان ہو۔ ابھی نیچ سوارتھ نے تمھیں اپنے رنگ میں نہیں رنگا۔ ابھی تمھاری کمر نے جھکنا نہیں سیکھا۔ تمھارے سر نے سجدہ کرنا نہیں سیکھا تم میں جوش ہے۔ ہمیں تم سے امید ہے۔''

(بحوالہ کہانی کار، پریم چند نمبر، جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۱ء ص ۵۲)

غیر ملکیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور مذہبی قوت نے بہت سے ذہنوں کو متزلزل کر دیا تھا۔ اس پس منظر میں متعدد تحریکیں وجود میں آ کر سرگرمِ عمل ہو چکی تھیں جن کا سلسلہ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید وغیرہ کی تنظیموں سے جوڑ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجنوں شاہ کی فقیری تحریک، کرم شاہ کی تحریک جو پاگل پنتھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک اور تیتو میر کی تحریک بھی قابلِ ذکر ہے۔ لیکن ان تمام تحریکوں میں شاہ ولی اللہ کی تحریکِ مجاہدین سب سے اہم ہے۔ ابتداً یہ ساری تحریکیں مذہبی رہیں مگر بعد میں ان کا دائرہ عمل وسیع ہوا۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک انگریزوں کے خلاف پوری طرح صف آرا ہو کر نعرۂ جہاد دے کر حریت کی آگ پورے ملک میں پھیلا دی۔

ملکی سیاست کے سارے اتار چڑھاؤ جنھوں نے پوری قومی زندگی کو متاثر کر دیا تھا، دوسرے ادیبوں کی طرح پریم چند کو بھی تحریک دے رہے تھے۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات کے سہارے ہندوستانیوں کو مادرِ وطن کی عظمت کا احساس دلایا اور ان میں سرفروشی کی تمنا پیدا کی۔ وہ افسانہ 'قاتل' میں ایسے مجاہدوں سے متعارف کراتے ہیں جن کا کہنا تھا کہ یہ لڑائی انفرادی نہیں ہے۔ بلکہ انگریزوں کی مجموعی طاقت سے ہے۔ میں مروں یا میرے بدلے کوئی دوسرا مرے اس میں کوئی فرق نہیں۔ جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہے اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔

پریم چند کی تحریروں میں آزادی کے لیے جو تیزی، تندی اور حرارت ملتی ہے۔ وہ بہت کچھ شاہ ولی اللہ صاحب کے مجاہدین کی مرہونِ منت ہے۔ وہ افسانہ ''جیل'' میں اپنے احساسات کو بڑے جذباتی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ افسانہ کا ہیرو وشمبھر اپنی محبوبہ روپ متی سے کہتا ہے: ''جانتی ہو سارے ملک کے لیے سوراج، اتنے عظیم مقصد کے لیے مرجانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔''

پورے ملک میں مختلف سماجی اور سیاسی تحریکیں، اصلاحی اور فلاحی کاموں میں سرگرمِ عمل تھیں اور عوام کو دعوتِ فکر و عمل دے رہی تھیں۔ مگر ان سرگرمیوں کے مرکز شہر تھے۔ وسائل کی آسانی کے سبب شہر ایک دوسرے سے مربوط تھے اور اخبارات باخبر رکھنے کا ایک ذریعہ بن چکے تھے۔ لیکن ملک کی آبادی کی اکثریت تو دیہات پر مشتمل تھی۔ دیہات بھی ایسے، جہاں رسائی مشکل سے ممکن ہو پھر وسائل کی اس قدر کمی تھی کہ ان سے رابطہ قائم رکھنا دشوار ترین مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اسی سبب ان تحریکوں کی کاوشیں شہروں میں تو کامیابی سے ہم کنار ہو چلی تھیں مگر دیہاتوں میں ان کے اثرات مرتب نہیں ہو رہے تھے۔ پریم چند نے بحیثیت ادیب ان تحریکوں اور ان سے متعلق بعض شخصیتوں سے متاثر ہو کر دیہی عوام کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ دی اور جذبۂ بیداری کو اپنی تحریروں کے ذریعہ اور بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی جو مختلف تحریکوں کے اصل محرک تھے۔

جنگِ آزادی کی تحریک ۱۹۲۵ء تک پہنچتے پہنچتے شہروں سے نکل کر گاؤں اور دیہاتوں کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی اور اس وقت تک مہاتما گاندھی جیسے رہنما ہندوستان واس آنے کے بعد تحریک آزادی میں شامل ہو چکے تھے اس وقت کانگریس پارٹی کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھوں میں تھی گاندھی ج جدوجہدِ آزادی اور ملک کے سیاسی حالات کو گاؤں تک پہنچانا شروع کیا ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان گاؤں میں بستا ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا سیاسی شعور بیدار ہوا۔ پریم چند خود بھی گورکھپور کی قیام کے دوران گاندھی جی کے خیالات سے متاثر ہو کر عدم تعاون تحریک کی حمایت کی اور گاندھی جی کے خیالات کا پرچار گاؤں گاؤں پھیلایا۔ پریم چند نے سیاسیت کے میدان میں گاندھی جی کے آنے کے بعد ان کے نظریات کو قبول کیا جس کا اعتراف کرتے ہوئے پریم چند کے لڑکے امرت رائے نے بھی لکھا ہے:

''عملی میدان میں گاندھی جی اوران کے درمیان استاداورشاگردکارشتہ تھا۔''(شیورانی دیوی، پریم چندگھر میں،ص۸۰)

اب پریم چند نے گاندھی جی کے خیالات کو دیہاتوں اور گاؤں میں پھیلانا شروع کیا اپنے آبائی گاؤں واپس آنے کے بعد گاندھی جی کے پروگرام کوفروغ دینے کے لیے چرخے کی تجارت بھی شوع کی اور دیہاتوں کے مسائل کودور کرنے کے لیےصبح وقت مقرر کر رکھا تھا۔ روزانہ صبح کوان کے مسائل کو سنتے اورستیہ گرہ کی اہمیت سمجھاتے اور ملک کی آزادی کے پروگراموں سے بھی روشناس کراتے۔ انھوں نے گاؤں میں مفت چرخے بھی تقسیم کروائے اوران کے استعمال کی تربیت اوراسکی اہمیت سے واقف کرایا۔ دیہاتوں کے حالات سے واقفیت کے لیے وہ خودبھی گاؤں کا دورہ کرتے ان کے مسائل کوسمجھتے اوراپنے خیالات لوگوں کے سامنے رکھتے پریم چند کے مہاتما گاندھی کےتصورآزادی سے متاثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گاندھی جی جن لوگوں کے لیےلڑ رہے تھے وہی کام پریم چنداپنی قلم کے ذریعہ بہت پہلے سےانجام دے رہے تھے۔

پریم چند کے خیالات میں وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلی آئی ہے اوراپنے آخری دور میں سوشلسٹ نظام کو ہی بہترین نظام قرار دیتے ہیں، اورتادم آخراس میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ بات قابل غور ہے کہ پریم چندآزادی کے متوالے تھےاور ملک کوانگریزوں کی غلامی سے آزادکرانا چاہتے تھے،اوراس کے لیے وہ پوری زندگی اپنی قلم کے ذریعہ انگریزی سامراج کے خلاف لڑتے رہے۔ وہ مزدوراور کسانوں کی فلاح کے لیے ہمیشہ کام کرتے رہےاور کانگریس کے ساتھ آخروقت تک قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔کبھی بھی پریم چند نے اس جدوجہد سے دامن نہیں کھینچااور نہ ہی ادیب کے منصب سے کبھی غافل رہے۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے اصولوں پر قائم رہے اور برطانوی غلامی سے ملک کوآزادکرانے کی کوشش کرتے رہے۔

4.14 فرہنگ

الفاظ	معانی
اقتدار	حکومت،اختیار، طاقت،مرتبہ
مفاد	فائدہ،نفع، بھلائی
معاش	رزق،روزی،روزگار
معیار	کسوٹی، پرکھ، جانچ
فرسودہ	پرانا،خستہ حال
روشناس	واقف،شناسا، جان پہچان والا،صورت آشنا
توہم پرستی	وہم پوجنا،خلافِ عقل باتوں کو ماننا
نشیب وفراز	پست اور بلند مقام،پستی وبلندی
استحقاق	قانونی یااخلاقی حق،شہری حقوق کی بناپرکسی بات کا حقدار ہونا
احتجاج	حجت یادلیل پیش کرنے کاعمل، ناپسندیدگی کےخلاف آواز بلند کرنا
وحشیانہ	جانوروں کی طرح، درندوں کی مانند، وحشیوں کی طرح

جابرانہ	جابر سے منسوب، سخت گیری، ظلم روا رکھنا، ظالمانہ
استحصال	ناجائز فائدہ اٹھانا، کسی حصہ دار کا حصہ ہتھیانا،
زبوں حالی	خستہ حالی، ماشی طور پر گری ہوئی حالت، مفلسی، غریبی
موہوم	وہم کیا گیا، خیالی، تصوراتی، فرضی
انتشار	بکھراؤ، پریشاں خیالی، تفریق پیدا ہونا
فرقہ وارانہ	گروہ بندی، جماعت بندی، دو جماعتوں میں تفرقہ ڈالنا
نظم وضبط	انتظام، سرکاری یا دفتری امعر کا بندوبست
مستحکم	مضبوط، پائدار
اعتماد	بھروسا، یقین، اعتبار، ساکھ
خودمختار	بااختیار، اپنے عمل پر قادر، تابع یا ماتحتی سے آزاد
مقصود	آرزومندی، ارادہ
بورژوازی	سرمایہ دارانہ معاشرہ میں اعلیٰ طبقہ اور استحصالی طبقہ کو بورژوازی کہا جاتا ہے۔
وسعت	کشادگی،، فراخی
متوسط	درمیانی، بیچ میں واقع
تعمیرِ نو	نئے طریقے سے تعمیر کرنا، نئی تنظیم، نئی ڈھنگ سے تیار کرنا
درہم برہم	الٹ پلٹ، تہ وبالا، منتشر، مخلوط
تفریق	اختلاف، جھگڑا، نفرت، منتشر، برہم

4.15 سفارش کردہ کتابیں

1. قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009ء
2. مانک ٹالا، پریم چند حیاتِ نو، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1992ء
3. پرکاش چندر گپت، پریم چند (مونوگراف)، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1976ء
4. بپن چندرا، تحریک آزادی میں آزاد ہندوستان کا تصور، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 1998ء
5. بپن چندرا، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 1979ء
6. جعفر رضا، پریم چند کہانی کار رہنما، شبستان شاہ گنج، الہ آباد، 1999ء
7. ڈاکٹر صغیر افراہیم، پریم چند۔ ایک نقیب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987ء

اکائی: 05 پریم چند بحیثیت ناول نگار

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 پریم چند سے قبل اردو ناول نگاری (اجمالی جائزہ)

5.4 پریم چند کے ناول نگاری (اجمالی جائزہ) اسلوب اور زبان و بیان

5.4.1 اسرارِ معابد

5.4.2 جلوہ ایثار

5.4.3 بیوہ

5.4.4 بازارِ حسن

5.4.5 گوشہء عافیت

5.4.6 نرملا

5.4.7 غبن

5.4.8 چوگانِ ہستی

5.4.9 پردۂ مجاز

5.4.10 میدانِ عمل

5.4.11 گئودان

5.5 آپ نے کیا سیکھا

5.6 اپنا امتحان خود لیجیے

5.7 سوالوں کے جوابات

5.8 فرہنگ

5.9 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ

- پریم چند سے قبل اردو ناول نگاری کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے
- پریم چند کے ناولوں کا اجمالی جائزہ لے سکیں گے
- پریم چند کے ناولوں کے امتیازات، انفرادیت اور فنی خوبیوں سے واقف ہوسکیں گے
- پریم چند کے ناول کے موضوعات جان سکیں گے
- پریم چند کے اردو ناول پر اثرات سے متعلق آگاہ ہوسکیں گے

5.2 تمہید

پریم چند نے جب ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین، محمد علی طبیب، راشد الخیری وغیرہم ناول نگاری میں ہاتھ آزما رہے تھے۔ لیکن مرزا ہادی رسوا پہلے شخص ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ ناول کے اسلوب کو مکمل طور پر پہچاننے کی کوشش کی۔ ''امراؤ جان ادا'' میں رسوا نے ناول نگاری کو اسلوب، فن، تکنیک، زبان و بیان اور کرداروں کے حوالے سے بلند تر کیا۔

پریم چند اردو فکشن پر ایک سائے کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر پریم چند افسانہ نگار ہیں لیکن جب ناول کی جانب سنجیدگی سے توجہ صرف کی تو یہاں بھی مردِ میدان ثابت ہوئے۔ انہوں نے اردو فکشن کو پہلے پہل حقیقت نگاری سے روشناس کرایا

،اس بنا پر وہ ایک انفرادی مقام بنانے میں کامیاب رہے۔

پریم چند کی ناول نگاری کے ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ناول نگاری کا سفر تین ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلے دور کے ناولوں میں رومانیت حاوی ہے۔ پریم چند نے بقول ''ہم خرما وہم ثواب، کشنا ان کے ابتدائی ناول ہیں۔لیکن تحقیق کے مطابق'' اسرارِ معابد'' ان کا پہلا ناول ہے جسے پریم چند نے ۱۹۰۱ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔''جلوۂ ایثار'' اور'' بازارِ حسن'' ناولوں کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔دوسرے عہد کی تحریروں پر ٹالسٹائے کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پریم چند نے ٹالسٹائے کی کہانیوں کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔تیسرے عہد میں وہ حقیقت سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی تحریروں میں مزدوروں، کسانوں اور دبے کچلے انسانوں کی کہانیوں کو موضوع بناتے ہیں۔

اگر پلاٹ کے اعتبار سے بات کی جائے تو پریم چند کے ناول دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ پہلا سنگل یا اکہرے پلاٹ دوسرے دوہرے یا مرکب پلاٹ۔سنگل پلاٹ کے ضمن میں ''بیوہ''، ''نرملا''، ''غبن''، اور'' بازارِ حسن'' جیسے ناولوں کا شمار ہوتا ہے۔ان ناولوں میں پلاٹ ہیرو، ہیروئن کے اردگرد ہی رکھا گیا ہے اور واقعات کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔مرکب پلاٹ پر مبنی ناولوں میں دیگر کرداروں کی داستان بھی ہے۔''گوشۂ عافیت''، ''چوگان ہستی''، ''پردۂ مجاز''، ''میدان عمل''، اور''گئودان'' مرکب پلاٹ کے ناول ہیں۔

5.3 پریم چند سے قبل اردو ناول نگاری (اجمالی جائزہ)

ڈپٹی نذیر احمد سے پہلے اردو ادب کا نثری سرمایہ قصے اور داستان کی شکل میں ملتا ہے۔نظیر احمد پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اردو ادب کو فوق فطری عناصر سے آزاد کرا کر حقیقی زندگی سے قریب کیا۔مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) کو اردو کا پہلا ناول تصور کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر محمود الٰہی مولوی کریم الدین کے ناول ''خط تقدیر'' (۱۸۶۲) کو اردو کا پہلا ناول خیال کرتے ہیں۔اکثر ناقدین مولوی کریم الدین کی تصنیف ''خط تقدیر'' کو ایک تمثیلی قصہ ہی مانتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اخلاقی، مذہبی اور اصلاح نسوئی کی غرض سے ناول لکھے۔ان کے ناولوں پر ان کی مقصدیت غالب ہے لہٰذا یہ بعد کے وضع کردہ ناول نگاری کے اصول سے مطابقت نہیں رکھتے۔مراۃ العروس (۱۸۶۹ء)، بنات النعش (۱۸۷۳ء)، توبتہ النصوح (۱۸۷۷ء)، فسانہ مبتلا (۱۸۸۵ء) ابن الوقت (۱۸۸۱ء)، ایامیٰ (۱۸۹۰ء) اور رویائے صادقہ (۱۸۹۲ء) نذیر احمد کے ناول ہیں جن سبھی کے موضوعات اصلاح معاشرہ سے متعلق ہیں۔ان ناولوں کے بعد حالی اور شاد عظیم آبادی نے بھی اصلاح معاشرہ کی غرض سے ناول تحریر کیے جن پر ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ سرشار نے ایک کے بعد ایک کئی ناول لکھے۔ ان میں ''فسانہ آزاد'' (۱۸۸۵ء) سرشار کا شاہکار ہے۔ خوجی اس ناول کا زندہ کردار ہے جسے احسن فاروقی نے کردار نگاری کا اب تک کا سب سے بڑا معجزہ کہا ہے۔ آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ سرشار ''فسانہ آزاد'' کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ''فسانہ آزاد'' کے علاوہ ''جام سرشار'' (۱۸۸۷ء) ''سیر کہسار'' (۱۸۹۰ء)، ''کامنی'' (۱۸۹۴ء) ''کڑم دھڑم''، ''پی کہاں'' اور ''خدائی فوج دار'' سرشار کے اہم ناول ہیں۔

سرشار کے بعد مولانا عبدالحلیم شرر کا نام آتا ہے۔ عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے موضوعات تاریخی اور اصلاحی ہیں گو کہ ان ناولوں میں بیشتر موضوعات تاریخی ہیں۔ ان ناولوں کے پلاٹ مربوط اور چست ہیں۔ ''دلچسپ'' عبدالحلیم شرر کا پہلا ناول ہے۔ ان کے ناولوں میں ''ملک العزیز ورجینا''، ''حسن انجلینا''، ''منصور موہنا''، ''فردوس بریں''، ''فلورا فلورنڈا''، ''فتح اندلس''، ''زوال بغداد'' اہم شمار کیے جاتے ہیں۔

شرر نے اب تک چلے آرہے ناولوں میں خیالی اور فرضی قصوں کو اپنے ناولوں کے موضوعات بنانے کی بجائے اسلامی تاریخ کی گزشتہ میراث کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔

شرر اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے ناول کے فن کو سمجھ کر اردو میں ناول نگاری لکھنا شروع کیا۔ شرر نے بھی نذیر کی طرح چند اصلاحی مقاصد کے پیش نظر ناول کے موضوعات منتخب کیے لیکن انہیں اس بات کا احساس تھا کہ صرف اصلاحی مقاصد اور رفارمیشن کی بنا پر اعلیٰ ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔

شرر کے ساتھ محمد علی طیب نے اردو ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ محمد علی طیب شرر کے ہم عصروں میں ہیں۔ شرر کی تقلید میں اپنے ناول نگاری کے کارواں کو آگے بڑھایا اور تاریخی ناول تخلیق کیے۔ ان کی اہم تصانیف ''عبرت''، ''حسن سرر''، ''جعفر وعباسیہ''، ''نیل کا سانپ'' ہیں۔

اسی عہد میں منشی سجاد حسین ایڈیٹر ''اودھ پنچ'' بھی ناول لکھ رہے تھے۔ ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو ناول کو ظریفانہ اسلوب سے آشنا کرایا۔ ''حاجی بغلول''، ''طرحدار لونڈی''، ''احمق الدین'' ان کے اہم ناول ہیں۔

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں مرزا ہادی رسوا سے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ رسوا نے اردو ناول نگاری اسلوب، فن، تکنیک، زبان و بیان اور کردار نگاری کے حوالے سے اردو ناول کو بلندی عطا کی۔ انہوں نے ''شریف زادہ''، ''ذات شریف'' کے علاوہ ''امراؤ جان ادا'' جیسا شاہکار تخلیق کیا۔

رسوا نے اصلاحی، تاریخی اور سماجی ناولوں سے الگ حقیقت نگاری کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ انہوں نے اپنے عہد کے رنگ چرا کر لکھنؤ کے زوال آمادہ معاشرے کی تصویر بنائی ہے۔ انہوں نے اس ناول میں صرف ایک طوائف کی کہانی نہیں رقم کی بلکہ اس لکھنوی معاشرے کی تاریخ لکھی ہے جو زوال پذیر ہو رہا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

''امراؤ جان ادا اردو کا پہلا ناول ہے جس میں زندگی اور فن ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر

قدم بہ قدم چل رہیں ہیں۔ زندگی فن کو راہ دکھاتی ہے اور فن زندگی کو اس کی حدوں میں رکھ کر بھی اسے وہ بلندی دیتا ہے جہاں عام نظر نہیں پہنچتی۔''

(داستان سے افسانے تک: وقار عظیم)

علامہ راشد الخیری نے ڈپٹی نذیر کی روایت کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں مقصدیت کو پیش نظر رکھا۔ اصلاح معاشرہ اور اخلاقی تعلیمات ان کے ناولوں کے موضوعات ہیں۔ علامہ راشد الخیری کا لقب مصور غم تھا۔ ''صبح زندگی''، ''شام زندگی''، ''عروس کربلا''، ''سیدہ کا لال''، ''نوحہ زندگی'' ان کے مشہور ناول ہیں۔

5.4 پریم چند کی ناول نگاری

پریم چند بنیادی طور اردو ادیب اور ناول نگار ہیں۔ پریم چند سے قبل اردو ناول اصلاحی اور رفاہی مشن پر تھے۔ پریم چند نے اسے عام انسانوں کی زندگی کے برابر لا کھڑا کیا۔ انہوں نے ناول میں ذاتی زندگی کے تجربات پیش کیے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک حصہ گاؤں میں بسر ہوا، انہوں نے سب سے پہلے اردو ناول کو محلوں اور حسن و عشق کی قید سے آزاد کر گاؤں، دیہات کی سیر کرائی۔ اپنے ناولوں میں ان موضوعات کو پیش کیا جس سے اردو ناول اچھوتا تھا۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سماجی، سیاسی، معاشی اور طبقہ اشرافیہ کے ظلم و جبر اور استحصال پر روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی ملک کے مختلف مسائل کے خلاف آواز بلند کی۔ کسانوں کی بے کسی اور بدحالی کو سب سے پہلے پریم چند نے اپنی کہانی کا موضوع بنایا۔ مختصراً یہ کہ پریم چند نے انسانی زندگی کے ان تمام مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ آل احمد سرور اس حوالے سے کہتے ہیں:

''ان کا ایک تصور حیات ہے، وہ غریبوں اور مزدوروں کے بہت بڑے ہمدرد ہیں۔ جہالت، بیماری، غربت، رسم و رواج کا بھوت، دولت کی تقسیم اور مذہب کے نام پر انسانیت کا خون پریم چند سے دیکھا نہیں جاتا۔''

(آل احمد سرور: تنقیدی اشارے)

اردو ناول نگاری میں پریم چند کا شمار ایک عہد کے طور پر ہوتا ہے جنہوں نے اردو ہندی ادب کو اس قدر متاثر کیا کہ اس کے اثرات ادب میں آج تک نمایاں ہیں۔ ان کی ناول نگاری اپنے عہد کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ اس درمیان عہد بہ عہد وقت بہ وقت ان کے ناول کے موضوعات میں متنوع دیکھنے کو ملتا ہے جسے ناقدین پریم چند کا عہد بہ عہد ارتقا کہتے ہیں۔ اس طرح ہم پریم چند کے ناولوں کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ عہد ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۶ء پر محیط ہے۔ پریم چند کے بقول ''ہم خرما وہم ثواب''، ''کشنا'' ان کی ابتدائی تصانیف ہیں۔ پریم چند کے احباب نے ''ہم خرما وہم ثواب'' کو ہی ان کا پہلا ناول قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر لکھتے ہیں کہ:

''پرتکیا پریما کا بدلا ہوا روپ ہے جو پہلے اردو میں ''ہم خرما وہم ثواب'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔اس کا سن تصنیف ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ ہے۔''

پریم چند (ہندی) ص۔۵۳

5.4.1 اسرارمعابد

ان تمام مباحث سے قطع نظر پریم چند کا پہلا ناول ''اسرار معابد'' قرار پایا ہے جو کہ بنارس کے ہفتہ وار ''آواز خلق'' میں اکتوبر ۱۹۰۳ء سے فروری ۱۹۰۵ء تک قسط وار شائع ہوا۔

اس عہد میں پریم چند کا ذہن مصلحانہ تھا۔ناول نگاری کی فنی باریکیوں پر بہت توجہ نہ تھی۔اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ان کی اولین کاوش تھی لہٰذا کچھ خامیاں رہ جانا عجیب بات نہیں ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اس عہد میں پریم چند کا رویہ مصلحانہ تھا، وہ سماج کی برائیوں اور ناہمواریوں کے خلاف قلم سے احتجاج کر رہے تھے۔اس ناول میں انہوں نے عبادت گاہوں، مٹھوں، ہندوؤں میں سیاہ کاریوں اور بدکاریوں پر قلم اٹھایا ہے۔سوامی ترلوکی ناتھ، مہنت نسیودھانند، رام کلی (نسیودھانند کی محبوبہ) اور للو (رام کلی کا شوہر) اس ناول کے کردار ہیں۔

5.4.2 جلوہ ایثار

یہ ناول تین افراد پر مشتمل ہے۔اس کا پلاٹ love Triangle پر بنا گیا ہے۔پرتاپ چندر جو کہ برجن نام کی لڑکی کو بچپن سے محبت کرتا ہے۔دونوں ساتھ ہی بڑے ہوتے ہیں۔لیکن برجی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کملاچرن سے ہوجاتی ہے۔کملاچرن ایک کھلنڈر، اوباش صفت انسان ہے جو سارا وقت سیر وتفریح میں گزارنا پسند کرتا ہے۔برجن اسے سمجھا بجھا کر راہ راست پر لانے کی کوشش کرتی ہے وہ بھی اچھا انسان بننے کی کوشش کرتا ہے، تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے الہ آباد چلا جاتا ہے اور وہاں بری صحبت کا شکار ہوجاتا ہے اور پھر ندامت کی وجہ سے ٹرین سے کود کر جان دے دیتا ہے۔شوہر کے غم میں برجن شاعرہ بن جاتی ہے۔

پرتاپ یوگ سادھنا کے ذریعہ روحانی قوت حاصل کر لیتا ہے قوم اور ہندو مذہب کی اصلاح کرنا شروع کر دیتا ہے۔اس طرح وہ اپنی محبت کو بھول جاتا ہے۔سبھا مابرسوں کی ریاضت (تپسیا) کے بعد دیوی سے وردان میں ایسا بیٹا مانگتی ہے جو ملک کے لئے بھلائی کا کام کرے، اس کے نتیجہ میں اسے پرتاپ جیسا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔

اس ناول میں پریم چند نے دیہاتی زندگی کی عکاسی کی ہے اور اس کے آلام ومصائب کو بھی بیان کیا ہے، ساتھ ہی گاؤں کے

افراد تک قومی بیداری کی لہر کا نمونہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

5.4.3 بیوہ

پہلے پہل یہ ناول پرتکیا کے نام سے شائع ہوا جو پریما کا بدلا ہوا روپ ہے جو ''ہم خرما وہم ثواب'' پر مبنی تھا۔ امرت رائے ایک آدرش وادی شخص اس ناول کا ہیرو ہے جو انسانیت کا علمبردار ہے۔ امرت رائے اپنی مرحوم بیوی کی بہن سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور پریما بھی ایسا ہی چاہتی ہے۔ لیکن ایک مصلح کی بات سن کر وہ اس کی بجائے اپنی زندگی اصلاحی کاموں کے لیے وقف کرنے کی سوچنے لگتا ہے۔ اس ضمن میں وہ بیوہ آشرم کی تعمیر کرواتا ہے۔

اس ناول کا ایک اہم کردار سمترا ہے جو اپنے شوہر کملا چرن سے بے پناہ محبت کرتی ہے لیکن کملا چرن اس کی قطعی پرواہ نہیں کرتا۔ اس طرح پریم چند دکھاتے ہیں کہ شوہر کی محبت کے بنا سمترا کی زندگی ایک بیوہ کی زندگی سے بہتر نہیں ہے۔ اس طرح زندگی سے تنگ آ کر سمترا گھر چھوڑ دیتی ہے اور آشرم کی پناہ لے لیتی ہے۔ پریم چند نے بیوہ آشرم کو بیواؤں کے مسئلے کے روپ میں دکھایا ہے۔ پریم چند کا یہ ناول ان کی فنی پختگی کی جانب اگلا قدم خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس ناول کے دیگر اہم کردار پریما، کملا پرشاد اور پورنما ہیں۔

5.4.4 بازارِ حسن

فحاشی اور اس کے تدارک کے موضوع پر لکھا گیا ناول دو حصوں پر مشتمل ہے، ہندی میں یہ ناول ''سیوا سدن'' کے نام سے چھپا تھا۔ یہ ناول چار خاندانوں کی کہانی پر مبنی ہے جس میں کردار کی بہتات ہے۔ مزکورہ چار خاندانوں کے سربراہ داروغہ کرشن چند، رما ناتھ، جانہوی اور سمن سنگھ ہیں۔ داروگہ کرشن چند پولیس محکمہ میں ملازم ہے اور لالچی شخص ہے۔ اس کی دو بیٹیاں (سمن اور سانتا) ہیں۔ بے لاگ اخراجات کے سبب سمن کی شادی کے پیسے نہ جمع کر پانے کا افسوس انہیں نہایت پریشان کرتا ہے اس لئے وہ رشوت لینے لگتا ہے اور نتیجے میں پانچ برس کی جیل ہو جاتی ہے۔ گجادھرا اپنی جوان بیوی کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری نہیں کر سکتا اور اسے ہر وقت بے عزت کرتا رہتا ہے اور آخر میں اسے گھر سے نکال دیتا ہے۔

پنڈت پدم سنگھ شرما کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ یہ خاندان شہر میں رہتا ہے لیکن اپنی مٹی سے جڑا ہوا رہتا ہے۔ اس ناول کے حوالے سے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''بازارِ حسن پہلا ناول ہے جس میں پریم چند نے معاشرتی خرابی کو ایک وسیع سماجی، اخلاقی اور اقتصادی پس منظر میں دکھایا ہے۔ اس کے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی زور دیا ہے۔ اور پھر اپنے مشاہدے اور مطالعے کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے''
>
> (پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، بحیثیت ناول نگار، ص۔ ۱۴۶)

5.4.5 گوشہ عافیت (۱۹۲۲)

اس ناول میں پریم چند نے پہلی مرتبہ گاؤں کے مناظر اور مسائل کی عکاسی کی ہے۔ناول کے بیشتر حصوں پر گاؤں کے مناظر ،معاشرت ،مسائل اور تہذیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ناول کی شروعات لکھن پور سے ہوتی ہے جہاں پر کسانوں اور وہاں کے زمیندار گیان شنکر کے مابین تنازعہ ہو رہا ہوتا ہے۔گیان شنکر اور پریم شنکر آپس میں بھائی ہیں۔پریم شنکر نے امریکہ سے تعلیم حاصل کی ہے۔وہ شائستہ،مہذب اور غریب پرور شخص ہے اور بھائی کے ظلم کے خلاف کسانوں کے ساتھ کھڑا رہتا ہے اور عوام کو اپنے حق کے تئیں بیدار کرتا ہے اور آخر میں لکھن پور کو ایک مثالی گاؤں بنا دیتا ہے۔

اس ناول کا شمار پریم چند کے اہم ناولوں میں ہوتا ہے اور پلاٹ اس طرح بنا گیا ہے کہ اس کے اثرات کا دائرہ صرف گاؤں دیہات تک ہی محدود نہیں رہ جاتا ہے۔کملا نند،سکھوں چودھری،بسیر ساہ،بلراج،منوہر،قادر خاں،غوث خاں،گائتری اس ناول کے دیگر کردار ہیں۔

5.4.6 نرملا

اس ناول میں پریم چند نے ان مشکلات کا جائزہ پیش کیا ہے جو کسی لڑکی کو جہیز نہ مل سکنے کی صورت میں پیش آتی ہیں۔اس ناول میں پریم چند نے عورتوں کے مسائل کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔صرف پیسوں کی تنگی کی وجہ سے پندرہ سال کی نرملا غربت کی وجہ سے ایک چالیس سال کے شخص کے ساتھ بیاہ دی جاتی ہے۔عمر کی وجہ سے نرملا اپنے شوہر کی عزت تو کرتی ہے لیکن اپنے شوہر کے تئیں محبت کا جذبہ اس کے دل میں بیدار نہیں ہو پاتا ہے۔ناول یہ دکھاتا ہے کہ بے میل کی شادی کا انجام خوشگوار نہیں ہوتا ہے۔

رکمنی،طوطا رام،ڈاکٹر سنہا،منسا رام،اودے بھان،کلیانی اس ناول کے دیگر کردار ہیں۔پریم چند کے تمام ناولوں میں یہ ناول سب سے زیادہ المناک ناول قرار پاتا ہے جہاں کچھ پیچیدگی اور کرداروں پر پکڑ مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے کہانی درمیان میں بکھرتی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی حقیقت نگاری کو آخر آخر تک تھامے رکھا ہے۔

5.4.7 غبن

غبن میں پریم چند پہلی مرتبہ شہری زندگی کے متوسط طبقے کے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔تیس روپیہ کمانے والا ملازم اچھی پوشاک پہنتا ہے،قرض لے کر بیوی کے لئے زیورات خریدتا ہے،چوری کرتا ہے اور پھر شہر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

دوسری کہانی میں رتن نام کی لڑکی کی بے جوڑ شادی ہو جاتی ہے۔اس کے وکیل شوہر پنڈت اندر بھوشن کے انتقال کے بعد رتن کا بھتیجہ اس کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے اور اس کی دولت پر قبضہ کر لیتا ہے جو غبن کی صورت دکھایا گیا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے جس میں دو کہانیاں ہیں۔ زیورات کا شوق اور رسم ورواج کو ناول کا محرک بنانے کی کوشش کی گئی ہے، قمر رئیس نے بھی زیورات کے شوق کو ناول کی اساس بتایا ہے لیکن دراصل یہ دل کے گوشے میں پڑی ایک دیرینہ خواہش ہے جسے ایک لڑکی (جالپا) ایک مدت سے اپنے دل میں دبائے ہوئے تھی۔

5.4.8 چوگان ہستی (۱۹۲۷)

یہ کہانی بنارس کے ایک گاؤں پانڈے پور کی ہے جہاں کی زیادہ تر عوام کا تعلق نچلے طبقے سے ہے اور سبھی باہمی اتحاد اور میل جول کے ساتھ رہتے ہیں۔ ایک اندھا بھیکاری سڑکوں پر آتی جاتی گاڑیوں والوں اور انگریزوں سے بھیک مانگ کر اپنا جیون چلاتا ہے۔ گاؤں میں سورداس کی زمین ہے جسے وہ اپنے اجداد کی میراث سمجھ کر بیچنے سے انکار کر دیتا ہے اور اس پر مندر بنوانا چاہتا ہے لیکن جان سیوک اسے خریدنا چاہتا ہے مگر سورداس اس سے انکار کر دیتا ہے۔ بعد میں سورداس پولیس کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کی زمین پر اس کا مجسمہ نصب کرا دیا جاتا ہے۔

سورداس کے کردار کی شکل میں پریم چند نے بھارت کی جدوجہد آزادی کی کشمکش کا خاکہ کھینچا ہے۔ جس میں سورداس پانڈے پور کے سرمایہ داروں کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور ان کے بے جا قبضے سے گاؤں والوں کو آزاد کراتا ہے۔

5.4.9 پردۂ مجاز (۱۹۲۸ء)

پردۂ مجاز کا یا کلپ کے نام سے ۱۹۲۸ء میں ذاتی پریس (سرسوتی پریس، بنارس) سے شائع کرایا۔ ناول کا پلاٹ آواگون (دوبارہ جنم) کے عقیدہ پر مبنی ہے۔ اس ناول میں راجہ مہیندر کمار اور دیوپری کے تین بار جنم لینے کے باوجود ان کی محبت ادھوری رہ جاتی ہے۔ ناول کی کہانی چکر دھر اور منورما کی محبت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی ہے۔ منورما کا کردار ایک باشعور ذہن اور باعلم خاتون کا کردار ہے۔

ناول کا مرکزی کردار چکر دھر روشن خیال شخصیت کا حامل ہے جو رسم ورواج ذات پات کی قید سے آزاد ہے۔ اپنے والدین کی مرضی سے شادی کے لئے راضی ہو جاتا ہے مگر ذات پات کے بندھن کو توڑ کر والدین کی مرضی کے خلاف اہلیا نام کی ایک غیر ذات کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ چکر دھر ملک کا سچا سپاہی ہے جس کا دل خدمت خلق اور وطن کی خدمت کے جذبے سے مالا مال ہے۔ پردۂ مجاز پریم چند کا ایسا ناول ہے جس کے متعلق ناقدین میں اختلاف رائے ہے جہاں ایک طبقہ اس ناول کو پریم چند کے کامیاب ناولوں میں شمار کرتا ہے وہیں دوسرا طبقہ اس کے برعکس رائے رکھتا ہے۔

5.4.10 میدان عمل (۱۹۳۲ء)

پریم چند کے بیشتر ناول اخلاق فاضلہ کی تعلیم و تدریس پر ہیں۔ اس ناول میں انہوں نے حقیقت پسندی سے کام لیا

ہے۔میدان عمل کے ذریعہ انسانی زندگی میں قول سے زیادہ عمل کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔یہ ناول پریم چند کے سیاسی نظریات کی وضاحت کرتا ہے جس کا مرکزی خیال مزدور طبقہ کی محنت وکاوش ہے جس سے وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے آلہ کے طور پر دیکھا تا ہے۔

''میدان عمل'' کا پلاٹ سادہ،صاف ستھرا اور پیچیدگی سے خالی ہے۔لالہ سمرکانت کا بیٹ امرکانت اپنے والد کی مرضی کے خلاف تعلیم حاصل کرتا ہے۔لالہ سمرکانت اپنے بیٹے کی شادی ایک مالدار گھر میں (سکھدا) سے کرادیتے ہیں۔مغرور اور ماڈرن سکھدا چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اپنے باپ کے کاروبار کو سنبھالے لیکن وہ اپنے باپ کے کاروبار میں دلچسپی لینے کی بجائے اپنے استاد پروفیسر کمار کی صحبت میں فلاحی کاموں میں حصہ لینے لگتا ہے اور میونسپلی کارکن منتخب ہو جاتا ہے اور اسی اثنا اسے سکینہ نام کی ایک غریب لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے،رسوائی سے پریشان ہو کر دہلی چھوڑ ہری دوار کے پاس پہاڑی گاؤں میں بس جاتا ہے۔یہاں گودڑ چودھری،سلونی اور منی کی محبت وشفقت کی بنا پر گاؤں کے اچھوت بچوں کی تعلیم کا نظم پیدا کرتا ہے۔غریبوں اور مظلوموں کو ظالم زمینداروں اور حکومت کی غلط پالیسی کے خلاف متحد کرتا ہے جس کے نتیجے میں اسے جیل بھی جانا پڑتا ہے اور اس کی بہن نینا کو شہادت بھی دینی پڑتی ہے۔تمام اتھل پتھل کے بعد ناول سمجھوتے پر ختم ہوتا ہے جو اس زمانے میں کانگریس کی پالیسی تھی۔

فنی اعتبار سے پریم چند کا یہ ناول ان کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ناول میں دیکھایا گیا ہے کہ غربت گاؤں اور شہر دونوں جگہ رہنے والوں کا مسئلہ ہے۔غریب چاہے گاؤں کا ہو یا شہر کا،مظلوم ہے،انسانیت کو تاراج کرنے والے ان کا استحصال کرتے ہیں۔

5.4.11 گئودان (۱۹۳۶ء)

گئودان پریم چند کا شاہکار ہے جو ان کے آخری ایام کی یادگار ہے۔ناول کا اصل موضوع کسانوں کی بدحالی،دیہات کی زندگی کے مسائل کے اردگرد تعمیر ہوا ہے۔زمین دارانہ نظام کی سفاکیت کس طرح غریبوں کی زندگی کے مسائل کو بڑھاتی ہے اور ان کی معمولی خواہشات کا گلا گھونٹتی ہے۔یہ ناول اس کی کامیاب مرقع کشی کرتا ہے۔

گئودان دراصل بیلاری گاؤں کے دو مرکزی کردار ہوری اور اس کی بیوی دھنیا کی زندگی کے تہہ در تہہ پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے وہیں دوسری جانب ناول شہری زندگی کی عیش وعشرت اور ان کے ذاتی مسائل کو بھی اجاگر کرتا ہے۔مہاجنون کی چالبازیوں اور عیاری کو بھی ناول میں جگہ دی گئی ہے۔

پریم چند کا یہ ناول ۱۱ ابواب میں منقسم ہے۔ابتدائی آٹھ ابواب میں پریم چند مختلف طبقات کی نمائندگی کرنے والے کرداروں سے قاری کو متعارف کراتے ہیں۔ہوری اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو جاگیردارانہ نظام کو قسمت کا لکھا مان کر قبول کر چکا ہے۔مہاجن کے قرض تلے دبے ہوری آخری ایام تک اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام ہوتا ہے اور بالآخر جان دے دیتا ہے مگر قرض سے چھٹکارا نہیں مل پاتا ہے۔

دھنیا ایک سمجھدار اور زمانہ شناس عورت ہے۔گوبر جو اس کا بیٹا ہے جھنیا کے ساتھ آشنائی کرتا ہے اور اسے حاملہ کر دیتا ہے جو

ناراضگی کے باوجود وہ جھنیا کو اپنے گھر لے آتی ہے۔

گوبر گاؤں کی غربت بھری زندگی سے تنگ آ کر شہر جا کر مزدوری کرتا ہے اور رقم جمع کر کے اپنے گاؤں لوٹتا ہے جس سے اس کے ماں باپ (ہوری اور دھنیا) بہت خوش ہوتے ہیں۔ یہاں پریم چند دکھاتے ہیں کہ شہر کی زندگی میں رہ کر گوبر سمجھدار اور اپنے حق کے تئیں ایک بیدار ذہن نوجوان بن جاتا ہے۔

ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ جگہ جگہ کرداروں سے وہی لفظ بلوایا گیا ہے جیسا کہ وہ ذاتی زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ تصنع اور بناوٹ سے کرداروں کو پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''گئودان کا فن زندگی سے بھرپور ہے۔ جہاں تک ایک خاص طرح کی زندگی کا ہے پہلو ہے اور ہر پہلو کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی ہے۔ جہاں تک جس زندگی کو ہم نے دیکھا تک نہیں وہ ہمارے لئے مدتوں دیکھی بھالی اور مانوس زندگی بن جاتی ہے۔''
>
> (وقار عظیم: داستان سے افسانے تک)

5.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں

- آپ کو پریم چند سے قبل اردو ناول نگاری کا علم ہوا
- پریم چند کے ناولوں کے موضوعات سے واقفیت ہوئی
- آپ کو پریم چند کے ناولوں کی خصوصیات سے آگاہی ہوسکی
- آپ کو پریم چند کے اہم ناولوں کے موضوعات اور ان کے زبان و بیان سے واقفیت حاصل ہوئی
- اصلاحی ناولوں کے بعد پریم چند نے کس طرح اردو ناول کا رخ موڑا، آپ اس اکائی کے ذریعہ جان سکے
- نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ اور راشد الخیری کے اہم ناولوں اور ان کے موضوعات کا علم ہوا۔

5.6 اپنا امتحان خود لیجئے

۱- اردو کا پہلا ناول کس نے اور کس سن میں لکھا

۲- رتن ناتھ سرشار کے دو ناولوں کے نام بتایئے

۳- خوجی کس ناول کا کردار ہے

۴- پریم چند کا پہلا ناول کون سا ہے

۵- پریم چند کا آخری مکمل ناول کون سا ہے اور کس سن میں شائع ہوا

5.7 جوابات

۱۔ اردو کا پہلا ناول ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں مراۃ العروس کے نام سے لکھا۔

۲۔ رتن ناتھ سرشار کے دو ناول ہیں: فسانۂ آزاد اور خدائی فوجدار۔

۳۔ خوجی رتن ناتھ سرشار کے شاہکار ناول ''فسانہ آزاد'' کا مزاحیہ کردار ہے۔

۴۔ پریم چند کا پہلا ناول اسرار معابد ہے۔

۵۔ پریم چند کا آخری (مکمل) ناول گؤدان ہے جس کی اشاعت ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

5.8 فرہنگ

لفظ	معنی
اسرار	راز
معابد	عبادت گاہیں، آتش کدے
مراۃ العروس	دلہن کا آئینہ
غبن	امانت میں خیانت کرنا، بے ایمانی کرنا
بیوہ	ایسی عورت جس کا شوہر انتقال کر چکا ہو
توبتہ النصوح	سچی توبہ
ایامیٰ	جس کا شوہر مر چکا ہو
مرقع کشی	لفظوں کے ذریعہ کسی منظر کی ہو بہو تصویر پیش کرنا
ابن الوقت	وقت کا بیٹا (لفظی معنی) چالاک، موقع شناس، موقع

	پرست
تصنع	بناوٹ
سلیس	آسان

5.9 کتب برائے مطالعہ

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار پروفیسر قمر رئیس، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ

پریم چند شناسی: میر آفاق احمد مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

پریم چند کی ناول نگاری ڈاکٹر یوسف سرمست، الیاس ٹریڈرس، پبلشر اینڈ بک ہاؤس

داستان سے افسانے تک: وقار عظیم ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ

بیسویں صدی میں اردو ناول: ڈاکٹر یوصف سرمست، نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد

اکائی: 6 نرملا کا تنقیدی مطالعہ

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 پریم چند کی ناول نگاری

6.4 نرملا کا خلاصہ

6.5 نرملا کا تنقیدی مطالعہ

6.6 آپ نے کیا سیکھا

6.7 اپنا امتحان خود لیجیے

6.8 سوالوں کے جوابات

6.9 فرہنگ

6.10 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ

- پریم چند کی ناول نگاری کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے
- پریم چند کی ناول نگاری کے متعلق واقف ہوسکیں گے
- پریم چند کے ناولوں کے فنی امتیازات واوصاف سے واقف ہوسکیں گے
- پریم چند کے ناول ''نرملا'' سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرسکیں گے
- پریم چند کے ناول ''نرملا'' کے اسلوب کردار اور زبان وبیان سے واقف ہوسکیں گے

6.2 تمہید

پریم چند نے جب ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین، محمد علی طبیب، راشد الخیری وغیرہم ناول نگاری میں ہاتھ آزما رہے تھے۔ لیکن صرف ہادی رسوا پہلے شخص ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ ناول کے اسلوب کو مکمل طور پر پہچاننے کی کوشش کی۔ ''امراؤ جان ادا'' میں رسوا نے ناول نگاری کو سلوب، فن، تکنیک، زبان و بیان اور کرداروں کے حوالے سے بلند تر کیا۔

6.3 پریم چند کی ناول نگاری

پریم چند اردو فکشن پر ایک سائے کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر پریم چند افسانہ نگار ہیں لیکن جب ناول کی جانب سنجیدگی سے توجہ صرف کی تو یہاں بھی مردِ میدان ثابت ہوئے۔ انہوں نے اردو فکشن کو پہلے پہل حقیقت نگاری سے روشناس کرایا ،اس بنا پر وہ ایک انفرادی مقام بنانے میں کامیاب رہے۔

پریم چند کی ناول نگاری کے ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ناول نگاری کا سفر تین ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلے دور کے ناولوں میں رومانیت حاوی ہے۔ پریم چند نے بقول ''ہم خرما وہم ثواب، کشنا ان کے ابتدائی ناول ہیں۔ لیکن تحقیق کے مطابق'' اسرارِ معابد'' ان کا پہلا ناول ہے جسے پریم چند نے ۱۹۰۱ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ''جلوۂ ایثار'' اور ''بازارِ حسن'' ناولوں کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ دوسرے عہد کی تحریروں پر ٹالسٹائے کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پریم چند نے ٹالسٹائے کی کہانیوں کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ تیسرے عہد میں وہ حقیقت سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی تحریروں میں مزدوروں، کسانوں اور دبے کچلے انسانوں کی کہانیوں کو موضوع بناتے ہیں۔

اگر پلاٹ کے اعتبار سے بات کی جائے تو پریم چند کے ناول دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ پہلا سنگل یا اکہرے پلاٹ دوسرے دوہرے یا مرکب پلاٹ۔ سنگل پلاٹ کے ضمن میں ''بیوہ''، ''نرملا''، ''غبن''، اور ''بازارِ حسن'' جیسے ناولوں کا شمار ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں پلاٹ ہیرو، ہیروئن کے اردگرد ہی رکھا گیا ہے اور واقعات کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ مرکب پلاٹ پر مبنی ناولوں میں دیگر کرداروں کی داستان بھی ہے۔ ''گوشۂ عافیت''، ''چوگانِ ہستی''، ''پردۂ مجاز''، ''میدانِ عمل''، اور ''گئودان'' مرکب پلاٹ کے ناول ہیں۔

6.4 نرملا کا خلاصہ

''نرملا'' پریم چند کا ایک اہم ناول ہے۔اس ناول میں پریم چند نے سماج میں پھیلی برائیوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔اس ناول میں پریم چند نے متوسط طبقہ کی لڑکیوں کے جذبات اجاگر کیے ہیں جو کہ والدین کی غربت کی وجہ سے اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہیں۔نرملا کا سن اشاعت ۱۹۲۳ء ہے۔حجم کے اعتبار سے یہ ناول اوسط ناول کے زمرے میں آتا ہے جو ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اسے پریم چند نے سب سے پہلے اردو میں لکھا تھا لیکن پہلے پہل یہ ہندی میں شائع ہوا اردو میں اس کی اشاعت ۱۹۲۹ میں گیلونی اسکٹرک پریس بکڈپو لاہور سے ہوئی۔

پریم چند کا ناول ''نرملا'' اردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔اس ناول میں پریم چند نے نفسیاتی پہلوؤں پر کافی توجہ صرف کی ہے۔ناول کے کرداروں کے تعارف میں بھی پریم چند نے بڑی فنکاری کا ثبوت فراہم کرایا ہے۔ناول میں بنیادی طور پر عورتوں کے متعلق سماجی اور نفسیاتی مسائل بیان ہوئے ہیں جیسے ہندوستانی عورتوں پر ظلم اور زیادتی،ان کی معصومیت و مظلومیت،جہیز کی بڑھتی ہوئی لعنت جس کے سبب لڑکیوں اور ان کے والدین کو بہت سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں،اسی سبب سے بے جوڑ شادی کو فروغ ملتا ہے۔معمر لوگوں کی ہوس پرستی کے ساتھ ساتھ دوسری شادی کے برے انجام پر بھی یہ ناول بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔کم عمر خاتون سے شادی کے سبب گھر میں رہ رہے جوان ہوتے لڑکے کی جنسیاتی اور نفسیاتی کیفیات پر بھی پریم چند نے روشنی ڈالی ہے۔غرض اس ناول میں پریم چند نے سماجی برائیوں کا نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔پریم نرائن نندن کے بقول:

> ''نرملا ایک معاشرتی ناول ہے جس میں ان مشکلات کا تجزیہ ہے جو لڑکی کی شادی میں جہیز نہ دے سکنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔پندرہ برس کی نرملا کو جس کی جوانی کا کنول ابھی کھلا بھی نہیں ہے ایک چالیس سال کے ادھیڑ شخص سے بیاہ دینا کتنا بھیانک پاپ ہے،یہی دکھانا اس ناول کا سماجی مقصد ہے۔''
>
> (کرتیاں اور کلا: ہندی ص:۸۲)

اودے بھان نام کے ایک مشہور وکیل کے چار بچوں میں نرملا سب سے بڑی بیٹی ہے۔دیگر تین بچوں میں نرملا کی چھوٹی بہن کرشنا اور دو چھوٹے بھائی چندر بھان اور سورج بھان ہیں۔نرملا کی شادی بھان چندر نام کے ایک وکیل کے بڑے بیٹے بھون چندر سے قرار رہتی ہے۔بدقسمتی سے نرملا کے والد اودے بھان پر ایک سزا یافتہ قاتلانہ حملہ کرتا ہے اور کچھ دنوں بعد وہ اس دنیا سے رحلت کر جاتے ہیں۔سماجی برائی کے سبب نرملا کی شادی التوا میں پڑ جاتی ہے۔اب یہاں جہیز کی لعنت سے بھی سامنا ہوتا ہے۔نرملا کا منگیتر بھون چندر جہیز کے لالچ میں پڑ کر نرملا سے رشتہ توڑ دیتا ہے۔اس کا سب سے زیادہ اثر نرملا کی بیوہ ماں کلیانی پر ہوتا ہے۔اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا ہے۔لہٰذا ایک پنڈت کی تجویز پر وہ نرملا کی شادی ایک چالیس برس کے وکیل سے کر دیتی ہے۔

نرملا کا شوہر طوطا رام ہے،جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور جس کے پہلی بیوی سے تین بیٹے ہیں۔ایک بیوہ بہن جس کا نام رکمنی ہے وہ اسی گھر میں اپنے بھائی کے ہمراہ رہتی ہے۔کمسن بیوی پا کر جنسیت میں چور طوطا رام اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو جاتا ہے۔دوسری جانب طوطا رام کی بہن اپنے بھائی کو نرملا سے بدظن کر دیتی ہے۔طوطا رام کا بڑا بیٹا منسا رام جو کی عمر کی تبدیلی کے باعث خودسر ہونے لگتا ہے لہٰذا طوطا رام اسے ہاسٹل میں داخل کرا دیتا ہے مگر اس کے لئے یہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ہاسٹل میں تپ دق جیسے

موذی مرض میں مبتلا ہوکر آخر کار وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔دوسرا بیٹا غنڈوں کے ذریعہ اغوا ہو جاتا ہے اور تیسرا بیٹا جیارام بری سنگت کے سبب گھر چھوڑ دیتا ہے۔

ان تمام تر مصائب کا سامنا کرتے کرتے طوطارام معاشی طور پر ٹوٹ جاتا ہے۔اس کا آبائی گھر نیلام ہو جاتا ہے جس وجہ سے طوطارام ذہنی انتشار کا شکار رہنے لگتا ہے اور گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔اسی درمیان نرملا ایک بیٹی کو جنم دیتی ہے۔

نرملا کی پڑوسن سدھا ایک نیک دل لڑکی ہے۔قسمت نرملا کو پھر ماضی سے ملواتی ہے۔اس کا شوہر بھون چندر ہے جو کہ پہلے نرملا کا منگیتر رہ چکا ہے اور اب وہ ایک ڈاکٹر ہے۔سدھا کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے شوہر نے جہیز کے لالچ میں نرملا کا رشتہ منع کیا تھا۔یہ بات سدھا کو بہت پریشان کرتی ہے لہٰذا تلافی کی غرض سے وہ نرملا کی چھوٹی بہن کی شادی اپنے دیور سے کرا دیتی ہے۔نرملا اور سدھا ایک دوسرے کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔اسی اثنا میں ایک دن سدھا کا شوہر نرملا کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش میں پکڑا جاتا ہے اور شرمندگی کے باعث خودکشی کر لیتا ہے۔سدھا کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔سدھا کی تباہ حالی نرملا کو نڈھال کر دیتی ہے اور آخر کار وہ موت کو گلے لگا لیتی ہے۔طوطارام ذہنی انتشار کے باوجود نرملا کی چتا کو آگ دیتا ہے۔اس طرح یہ ناول المناک موڑ پر اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

6.5 نرملا کا تنقیدی مطالعہ

نرملا ناول میں پریم چند نے عورت کو مرد کے مقابلے زیادہ باہمت اور حوصلہ مند دکھایا ہے۔ناول کا مرکزی کردار نرملا ہے جب کہ سدھا بھی ایک باحوصلہ اور مضبوط عورت کے کردار میں نظر آتی ہے۔پریم چند نے ناول کا پلاٹ مربوط اور کسا ہوا لکھا ہے۔بے جوڑ شادی اور جہیز کی لعنت کس قدر سماج اور رشتوں کو برباد کر دیتی ہے اس ناول میں پریم چند نے بخوبی دکھانے کی کوشش کی ہے۔والدین لڑکیوں کو بوجھ سمجھتے ہیں اس غرض سے وہ جلد از جلد ان کی شادی کر کے اپنا بوجھ اتار دینا چاہتے ہیں۔

کردار نگاری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو پریم چند نے تمام کرداروں کے پس پشت ان کی نفسیات کو بہت باریکی سے پیش کیا ہے۔نرملا کی ماں ہو یا اس کا باپ سب اپنی اپنی خصوصیات کے دائرے میں قید ہیں۔

نرملا ایک کمسن اور الہڑ لڑکی ہے جو وقت کے ستم کے باعث کم عمری میں ہی زندگی کے نشیب و فراز اور باریکیوں سے واقف ہو جاتی ہے۔وہ کم عمری میں ہی ایک ذمہ دار گرہستن بن جاتی ہے۔اس کے کردار میں سادگی اور بھولا پن ہے۔اس کے برعکس رکمنی کے کردار میں وہ سادگی اور معصومیت نظر نہیں آتی۔مزاجاً تیز اور ترکش ہے۔اس ناول میں ہیرو کا کردار وکیل طوطارام نبھاتا ہے۔کم عمر کی لڑکی سے شادی کرتا ہے اور اس پر شک بھی کرتا ہے۔منسارام جو کہ طوطارام کا بڑا بیٹا ہے ایک معصوم اور نیک دل لڑکا ہے مگر اس کا باپ اس پر شک کرتا ہے اور اسے ہاسٹل بھیج دیتا ہے۔اس کی ذہنی کیفیت ہونے لگتی ہے۔آخر کار وہ ہاسٹل میں جاتا ہے اور پھر تپ دق میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے۔ڈاکٹر سنہا کا کردار ایک غلط شخص کا کردار ہے اس کے برعکس سدھا ایک سلجھی ہوئی انصاف پسند خاتون ہے۔

پریم چند نے کرداروں کے انتخاب اور انہیں لکھنے میں نہایت باریک بینی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ہر کردار اپنی جگہ مناسب اور

موزوں معلوم ہوتا ہے۔انسان ہونے کی حیثیت سے انسانی جبلت سے چھٹکارا حاصل کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے، یہ ناول اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔مثال کے طور پر طوطا رام جس کی عمر اپنی بیوی کے مقابلے زیادہ ہے اور اس کا بیٹا اس کی بیوی کی عمر کے قریب ہے لہٰذا وہ اپنے بیٹے پر ہی شک کرنے لگتا ہے۔یہ کردار اس نفسیات کو دکھاتا ہے جو انسانی جبلت ہی کا حصہ ہے۔

ناول کے چند کردار ہمیں مطمئن نہیں کر پاتے ہیں۔مثال کے طور پر وکیل اودے بھان جو تھوڑی سی تلخ کلامی کے بعد گھر چھوڑ دیتا ہے اور کلیانی کو سزا دینے کی غرض سے ایک پلان بناتا ہے کہ وہ کپڑے چھوڑ کر چلا جائے گا اور جب اس کی بیوی (کلیانی) یہ کپڑے دیکھے گی تو اسے مرا ہوا سمجھ کر اپنے کیے پر نادم ہوگی اور روئے گی، اس طرح اس کی عقل ٹھکانے آجائے گی مگر اس کے برعکس ہوجاتا ہے اور ایک سزا یافتہ مجرم اس کا قتل کر دیتا ہے۔یہ سارے واقعات بالکل ڈرامائی انداز میں رونما ہوتے ہیں۔اس کی ایک چھوٹی سی غلطی سے پورا گھر بکھر جاتا ہے اور نرملا کی زندگی اسی ایک واقعہ سے متاثر ہوکر بکھر جاتی ہے۔اس ناول کے کرداروں کے متعلق قمر رئیس کہتے ہیں:

> ''نفسیاتی اعتبار سے نرملا اور طوطا رام کے کرداروں کا مطالعہ سب سے زیادہ کامیاب کہا جا سکتا ہے۔نرملا کا کردار ''بازار حسن'' کی شانتا کی یاد دلاتا ہے، سمن کی نہیں۔سمن خوددار ہی نہیں خودسر اور سرکش بھی ہے۔وہ ظلم اور بے انصافی کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔نرملا اور شانتا طبقاً متحمل اور منکسر ہیں۔ظلم و جبر کو بڑی خاموشی سے برداشت کرتی ہیں۔نرملا کو ایک دائم المریض بوڑھے وکیل سے بیاہ دیا جاتا ہے۔اس کے خوابوں کا رنگ محل مسمار ہوجاتا ہے۔وہ ساری زندگی محرومیوں کی آگ میں سلگتی رہتی ہے لیکن کبھی شکوہ زبان پر نہیں لاتی۔طوطا رام اپنی نفس پروری کے ہاتھوں جب نرملا کو اپنی دلیری اور بانکپن کے فرضی قصے سناتا ہے اور ادھیڑ عمر میں نوجوانی کے سوانگ بھرتا ہے تو اس کی حالت پر رحم آنے لگتا ہے۔وہ یہ سوچتی ہے کہ بیچارہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہا ہے.....وہ شوہر کو خوش رکھنے کی خاطر منسا رام سے گریز کرتی ہے۔وہ شوہر کے سامنے اس کے ساتھ سختی سے پیش آتی ہے لیکن اس کی غیر موجودگی میں نرملا کی مامتا اور محبت امڈ آتی ہے..... پریم چند نے اس کے طرز عمل کا یہ تضاد اور ذہنی کشمکش بڑی کامیابی سے دکھایا ہے''
>
> (پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار، ص،۲۶۳)

پلاٹ کے لحاظ سے یہ ناول پریم چند کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔معاشی اور سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل اور معاملات کو پریم چند نے جس طرح پیش کیا ہے وہ پریم چند کی ذہنی پختگی اور سماج کی نبض پر ان کی پکڑ کو دکھاتا ہے۔نرملا کی نفسیاتی کشمکش اور طوطا رام کے ذہنی کیفیات کو پریم چند نے نہایت سلیقے سے نبھایا ہے۔اس حوالے سے یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''پلاٹ کی تعمیر کے لحاظ سے یہ ناول پریم چند کے ناولوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔پریم چند نے کردار نگاری، معاشی اور سماجی مسائل کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے پہلے یہ فنی پختگی ان کے دوسرے کسی بھی سماجی موضوع پر لکھے گئے ناول میں نہیں ملتی اصل میں ہندوستان کے سیاسی اور سماجی ناول میں معاشی

حالات کے غائر مطالعہ سے ان کے ناول میں یہ فنی پختگی پیدا ہوئی۔ یہ فنی پختگی نرملا کے کردار کی نفسیاتی پیش کش کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول: یوصف سرمست: ص:۲۰۶)

پریم چند نے ڈاکٹر اور سدھا کی ازدواجی زندگی کے ذریعہ یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ امور خانہ داری کے لئے صرف معاشی آسودگی کافی نہیں ہے۔ اس کے نزدیک امارت کے آگے اخلاق، کردار سادگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سدھا جیسی پاکباز اور نیک لڑکی کا ساتھ پاکر بھی وہ مطمئن نہیں ہونے پاتا ہے۔ صرف جہیز کے چکر میں نرملا کو چھوڑ کر سدھا سے شادی کرتا ہے اور پھر افسوس کرتا ہے۔ اسے رشتوں کے تقدس کا بھی لحاظ نہیں ہوتا کہ اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے اپنی گزشتہ منگیتر سے عشق کا اظہار کرتا ہے کیوں کہ وہ سدھا سے زیادہ خوبصورت ہے۔ شوہر کی اس نازیبا حرکت سے سدھا اپنے شوہر سے بدظن اور متنفر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خودکشی کر لینے سے سدھا کو کوئی خاص ملال نہیں ہوتا ہے اور اس کی باتوں سے اس کا اظہار یوں ہوتا ہے:

''ویسے سہاگ سے تو میں ودھوا ہو جانا برا نہیں سمجھتی۔ غریب اس امیر سے کہیں زیادہ سکھی ہے جسے اس کی دولت سانپ بن کر کاٹنے دوڑے۔''

(نرملا: پریم چند، ص:۲۴۵)

ناقدین کا خیال ہے کہ نرملا پریم چند کا سب سے زیادہ المیہ ناول ہے۔ اس میں تمام کردار نفسیاتی کشمکش کا شکار ہیں۔ یہ پریم چند کی مایوسی یا قنوطی طبیعت پر دلائل نہیں کرتا بلکہ یہ اس حقیقت اور سچائی سے منسلک ہے جو پریم چند کے حساس ذہن نے معاشرے میں دیکھا اور ان کے بد اثرات انہیں دیکھنے کو ملے۔ اس میں ایک کردار جیا رام کا ہے۔ جیا رام ایک سمجھدار شخص ہے لیکن وہ بھی بدترین انسانی جبلت کا شکار ہے۔ اس کی اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی ماں کے گہنے چرا لیتا ہے، لیکن اس کے اندر کا اچھا انسان اور اس کی سمجھداری اسے چین سے نہیں رہنے دیتی ہے۔ معاشرے میں ذلیل و رسوا ہونے اور پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا ڈر اس کے ذہن کو اس قدر متاثر کرتا ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ رام بلاس شرما نے اس ناول کے حوالے سے لکھا ہے:

''نرملا پریم چند کے افسانوی ادب کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پہلا ناول ہے جس میں انہوں نے کسی سیوا سدن یا گوشۂ عافیت کی تعمیر کر کے قاری کو جھوٹی تسلی نہیں دی۔ کہانی اپنے فطری انجام کی طرف روانی سے بڑھتی ہے۔ انہوں نے کہانی لکھنے میں حقیقت نگاری کو پوری طرح نبھایا ہے۔''

(پریم چند اور ان کا یگ (ہندی): رام بلاس شرما، ص ۶۷)

پریم چند کی ناول نگاری کی ایک بڑی کمی یہ ہے کہ وہ پلاٹ اور کردار کے تعارف میں خاصا وقت صرف کرتے ہیں۔ اس طوالت کی وجہ سے قاری بوجھل پن کا شکار ہونے لگتا۔ نرملا میں بھی پریم چند کی یہ خامی ابھر کر آتی ہے۔ ناول کی ابتدا میں کئی واقعات کی پیش کش نے ناول کو بلاوجہ گنجلک کر دیا ہے۔ مثلاً گھریلو معاملات میں ایک ہلکی سی بحث پر اودے بھان کا گھر چھوڑ کر بھاگ جانا اور پھر بیوی کو سبق سکھانے کی غرض سے ندی کے کنارے پر کپڑے چھوڑ دینا بالکل ناسمجھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر بھی پریم چند نے مکالمہ

نگاری، جزئیات نگاری، جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ واقعہ نگاری کا بھی حق ادا کیا ہے۔لہٰذا چند کمزویوں کے باوجود یہ ناول پریم چند کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔

6.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ نے سیکھا کہ

- پریم چند کی ناول نگاری کی کیا خصوصیات ہیں
- پریم چند نے ابتدا میں اصلاحی اور معاشرتی ناول تخلیق کیے
- ناول ''نرملا'' کی خصوصیات کیا ہیں
- ناول ''نرملا'' کے موضوعات کیا ہیں
- ناول ''نرملا'' پر معاشرے کے کیا اثرات ہیں
- ''نرملا'' میں کیا کیا خامیاں ہیں

6.7 اپنا امتحان خود لیجیے

۱- پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات بتائیے۔

۲- پریم چند کے ناولوں کے نام بتائیے۔

۳- پریم چند کے ناولوں کے پلاٹ کی خصوصیات بتائیے۔

۴- ناول نرملا کے موضوعات کیا ہیں؟

۵- ناول نرملا کے نسوانی کرداروں کے نام بتائیے۔

6.8 سوالات کے جوابات

۱۔ پریم چند اردو فکشن پر ایک سائے کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔بنیادی طور پر پریم چند افسانہ نگار ہیں لیکن جب ناول کی جانب سنجیدگی سے توجہ صرف کی تو یہاں بھی مردِ میدان ثابت ہوئے۔انہوں نے اردو فکشن کو پہلے پہل حقیقت نگاری سے روشناس کرایا،اس بنا پر وہ ایک انفرادی مقام بنانے میں کامیاب رہے۔ان کے ابتدائی ناولوں پر رومانیت حاوی ہے۔اس کے

بعد کے ناولوں میں وہ حقیقت سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی تحریروں میں مزدوروں، کسانوں اور دبے کچلے انسانوں کی کہانیوں کو موضوع بناتے ہیں۔

۲۔ پریم چند کے ناولوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)۔اسرارمعابد (۲)۔ہم خرماوہم ثواب (۳)جلوۂ ایثار (۴)۔بازارحسن (۵)۔بیوہ (۶)۔نرملا (۷)۔غبن (۸)۔گوشہ عافیت (۹)۔چوگان ہستی (۱۰)۔پردۂ مجاز (۱۱)۔میدان عمل (۱۲)۔گؤدان (۱۳)۔منگل سوتر (نامکمل)

۳۔ پلاٹ کے اعتبار سے بات کی جائے تو پریم چند کے ناول دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ پہلا سنگل یا اکہرے پلاٹ دوسرے دوہرے یا مرکب پلاٹ۔ سنگل پلاٹ کے ضمن میں ''بیوہ''، ''نرملا''، ''غبن''، اور ''بازارِحسن'' جیسے ناولوں کا شمار ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں پلاٹ ہیرو، ہیروئن کے اردگرد ہی رکھا گیا ہے اور واقعات کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ مرکب پلاٹ پر مبنی ناولوں میں دیگر کرداروں کی داستان بھی ہے۔ ''گوشۂ عافیت''، ''چوگان ہستی''، ''پردۂ مجاز''، ''میدان عمل''، اور ''گؤدان'' مرکب پلاٹ کے ناول ہیں۔

۴۔ پریم چند کا ناول ''نرملا'' اردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے نفسیاتی پہلوؤں پر کافی توجہ صرف کی ہے۔ ناول کے کرداروں کے تعارف میں بھی پریم چند نے بڑی فنکاری کا ثبوت فراہم کرایا ہے۔ ناول میں بنیادی طور پر عورتوں کے متعلق سماجی اور نفسیاتی مسائل بیان ہوئے ہیں جیسے ہندوستانی عورتوں پر ظلم اور زیادتی، ان کی معصومیت و مظلومیت، جہیز کی بڑھتی ہوئی لعنت جس کے سبب لڑکیوں وران کے والدین کو بہت سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں، اسی سبب سے بے جوڑ شادی کو فروغ ملتا ہے۔ معمر لوگوں کی ہوس پرستی کے ساتھ ساتھ دوسری شادی کے برے انجام پر بھی یہ ناول بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ کم عمر خاتون سے شادی کے سبب گھر میں رہ رہے جوان ہوتے لڑکے کی جنسیاتی اور نفسیاتی کیفیات پر بھی پریم چند نے روشنی ڈالی ہے۔ غرض اس ناول میں پریم چند نے سماجی برائیوں کا نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔

۵۔ ناول نرملا میں کئی نسوانی کردار ہیں جو مرد کے مقابلے زیادہ باہمت اور حوصلہ مند ہیں۔ نرملا جو کی ناول کی ہیروئن ہے۔ اس کی پڑوسن سدھا جو کہ ایک مضبوط کردار میں نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ کلیانی (نرملا کی ماں)، رکمنی (نرملا کی نند) بھی اپنی الگ خصوصیت رکھتے ہیں۔

6.9 فرہنگ

لفظ	معنی

گشت کرنا	گھومنا،ٹہلنا
تفکرات	(تفکر کی جمع) سوچ بچار،غور وخوض،فکرمندی
خاطرمدارات	مہمان نوازی کرنا،عزت افزائی کرنا
زہرا گلنا	نہایت سخت الفاظ کہنا
شب دیجور	اندھیری رات
بیوہ	ایسی عورت جس کا شوہر انتقال کر چکا ہو
بدھی (ہندی)	عقل
مہورت (ہندی)	اجرا،ابتدا،کسی کام کو کرنے کے لئے ستاروں کی چال کے موافق مناسب وقت معلوم کرنا
شکم سیر ہونا	جی بھر کر کھانا
متحیر	حیرت زدہ
منتر	وظیفہ،عمل
آنکھیں لال پیلی کرنا	غصہ کرنا
خجل	شرمسار،نادم،احساس کمتری میں مبتلا
عقل سلیم	سنجیدہ،سلجھا ہوا،صحیح سوچ وفکر کا مادہ
منقود ہونا	گم،کھویا ہوا،ناپید
شگفتہ	کِھلا ہوا
مضمحل	کمزور،نڈھال،ناتواں
حجت	دلیل،بحث،تکرار
برق رفتاری	بجلی سی تیزی
سینہ کوبی	سینہ پیٹنے کا عمل

6.10 کتب برائے مطالعہ

نرملا منشی پریم چند،آزاد بک ڈپو امرتسر

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار ڈاکٹر قمر رئیس،کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

پریم چند شناسی		مرتبہ پروفیسر آفاق احمد
پریم چند اور تصانیف پریم چند کچھ نئے		مانک ٹالا، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گول مارکیٹ، دریا گنج
تحقیقی گوشے		نئی دہلی
پریم چند کی ناول نگاری		ڈاکٹر یوسف سرمست، الیاس ٹریڈرس، پبلیشر بک سیلر، شاہ
علی بنڈہ روڈ، حیدرآباد، اے پی
سہ ماہی نیا ورق		مدیر ساجد رشید، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۱۱، نومبر تا جون ۲۰۰۱
پریم چند، ہندوستانی ادب کے معمار		ل احمد اکبرآبادی (مترجم) ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۷۶

اکائی: 07 گئودان کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

ساخت

7.1 اغراض و مقاصد

7.2 تمہید

7.3 گئودان کا خلاصہ

7.4 گئودان کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

7.5 آپ نے کیا سیکھا

7.6 اپنا امتحان خود لیجیے

7.7 سوالوں کے جوابات

7.8 فرہنگ

7.9 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ

- پریم چند کی ناول نگاری کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے
- پریم چند کی ناول نگاری کے متعلق واقف ہو سکیں گے
- پریم چند کے ناولوں کے فنی امتیازات و اوصاف سے واقف ہو سکیں گے
- پریم چند کے ناول ''گئودان'' سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کر سکیں گے
- پریم چند کے ناول ''گئودان'' کے اسلوب کردار اور زبان و بیان سے واقف ہو سکیں گے

7.2 تمہید

پریم چند نے جب ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین، محمد علی طبیب، راشد الخیری وغیرہم ناول نگاری میں ہاتھ آزما رہے تھے۔ لیکن مرزا ہادی رسوا پہلے شخص ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ ناول کے اسلوب کو مکمل طور پر پہچاننے کی کوشش کی۔ ''امراؤ جان ادا'' میں رسوا نے ناول نگاری کو اسلوب، فن، تکنیک، زبان و بیان اور کرداروں کے حوالے سے بلند تر کیا۔

پریم چند اردو فکشن پر ایک سائے کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر پریم چند افسانہ نگار ہیں لیکن جب ناول کی جانب سنجیدگی سے توجہ صرف کی تو یہاں بھی مردِ میدان ثابت ہوئے۔ انہوں نے اردو فکشن کو پہلے پہل حقیقت نگاری سے روشناس کرایا، اس بنا پر وہ ایک انفرادی مقام بنانے میں کامیاب رہے۔

پریم چند کی ناول نگاری کے ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ناول نگاری کا سفر تین ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلے دور کے ناولوں میں رومانیت حاوی ہے۔ پریم چند نے بقول ''ہم خرما و ہم ثواب، کشنا ان کے ابتدائی ناول ہیں۔ لیکن تحقیق کے مطابق'' اسرارِ معابد'' ان کا پہلا ناول ہے جسے پریم چند نے ۱۹۰۱ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ''جلوۂ ایثار'' اور ''بازارِ حسن'' ناولوں کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ دوسرے عہد کی تحریروں پر ٹالسٹائے کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پریم چند نے ٹالسٹائے کی کہانیوں کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ تیسرے عہد میں وہ حقیقت سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی تحریروں میں مزدوروں، کسانوں اور دبے کچلے انسانوں کی کہانیوں کو موضوع بناتے ہیں۔

اگر پلاٹ کے اعتبار سے بات کی جائے تو پریم چند کے ناول دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ پہلا سنگل یا اکہرے پلاٹ دوسرے دوہرے یا مرکب پلاٹ۔ سنگل پلاٹ کے ضمن میں ''بیوہ''، ''نرملا''، ''غبن''، اور ''بازارِ حسن'' جیسے ناولوں کا شمار ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں پلاٹ ہیرو، ہیروئن کے اردگرد ہی رکھا گیا ہے اور واقعات کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ مرکب پلاٹ پر مبنی ناولوں میں دیگر کرداروں کی داستان بھی ہے۔ ''گوشۂ عافیت''، ''چوگانِ ہستی''، ''پردۂ مجاز''، ''میدانِ عمل''، اور ''گئودان'' مرکب پلاٹ کے ناول ہیں۔

7.3 پریم چند اور گئودان کا خلاصہ

گئودان پریم چند کا شاہکار ہے جسے پریم چند نے اپنے ذاتی پریس ''سرسوتی پریس'' سے ۱۹۳۶ میں شائع کیا۔ یہ ناول انھوں نے ۱۹۳۲ میں لکھنا شروع کیا اور غالباً یہ ناول لکھنے میں پریم چند نے سب سے زیادہ وقت لیا۔ اسے مکمل کرنے میں تقریباً چار سال وقت لگا اس طرح یہ ناول سب سے پہلے ہندی زبان میں ۱۹۳۶ میں شائع ہوا۔ اقبال بہادر ورما ساحر نے اس ناول کو سب سے

پہلے زبان میں پیش کیا۔ یہ ناول پریم چند کی دیہی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔انھوں نے دیہات میں کسانوں، مزدوروں کے درمیان ایک عمر بسر کی ،انھوں نے اس ماحول کو قریب سے دیکھا اور اپنے اس ناول میں حقیقت بنا کر پیش کر دیا۔

ناول گئودان کا پلاٹ اور کہانی بیلاری گاؤں جو کہ لکھنؤ کے قریب کا ایک گاؤں ہے پر بُنا گیا ہے۔اس گاؤں میں ہوری نام کا ایک کسان ہے جس کے دو بھائی ہیرا اور سوبھا ہیں۔ بھائیوں کی شادی کے لئے ہوری نے قرض لیا تھا جس میں سود مل کر قرض رقم کئی گنا ہو جاتی ہے۔اسی کشمکش میں وہ زندگی کی دیگر ضروریات کے لئے قرض لیتا رہتا ہے اور اس طرح اس کا قرض دن بہ دن بڑھتا ہی رہتا ہے۔ہوری کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا (گوبر) ہے۔بیٹیوں کے نام سونا اور روپا ہیں۔ہوری کی ایک دیرینہ خواہش ہے کہ اس کی اپنی چوکھٹ پر خود کی گائے ہو جس سے وہ دودھ، دہی، مکھن، ملائی حاصل کر سکے، وہ اور اس کے بیوی بچے اس سے فیضیاب ہو سکیں۔لیکن گائے خریدنے کے پیسے نہیں ہونے پاتے لہٰذا وہ اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے۔اسی اثنا میں بھولا نامی شخص ہوری سے کہتا ہے کہ اس کی ایک بیٹی کو چھوڑ کر سبھی بچوں کی شادی ہو چکی ہے اور یہ لڑکی بھی اب بیاہنے کی عمر کو پہنچ چکی ہے، اب اگر وہ اپنی بیٹی کی شادی کر دے گا تو جوں کہ اس کی بیوی نہیں ہے تو اس کا کون خیال رکھے گا۔اس طرح وہ ہوری سے اپنی شادی کرانے کی بات کرتا ہے۔ہوری اس کی شادی کرا دے اس لئے وہ اسے گائے لے جانے کا لالچ بھی دیتا ہے اور اس بات کی سہولت بھی کہ وہ جب جی چاہے اس کے پیسے ادا کر دے۔

ہوری کا بیٹا گوبر ایک سیدھا سادہ نوجوان ہے۔بھولا کی بیٹی جھنیا جس کی منگنی ٹوٹ جاتی ہے اور اب کوئی رشتہ بھی نہیں آتا ہے وہ گوبر کو پسند کرنے لگتی ہے اور یہ سمجھ جاتی ہے کہ وہ شادی شدہ زندگی میں یقین رکھنے والا مرد ہے لہٰذا وہ گوبر کو اپنے دام میں پھنسا لیتی ہے۔

اسی گاؤں میں رائے صاحب ہیں جو گاؤں کے مکھیا ہیں اور گاؤں کے لوگوں کے ساتھ بڑی محبت اور اخلاص سے پیش آتے ہیں۔اس محبت اور خلوص کا فائدہ انہیں انتخاب کے دوران ملتا ہے۔ان کے امیر دوست گاؤں کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی بات کرتے ہیں مگر یہ صرف بات ہی تک محدود ہے۔رائے صاحب کے دوست ایک اور رائے صاحب ہیں جو اسی طرز کے انسان ہیں یعنی وہ بھی زبانی باتیں کرتے ہیں مگر عملاً غریبوں کے لئے کچھ نہیں کر پاتے۔

مسٹر مہتا ایک آزاد منش فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔وہ یکسر شادی کے خلاف ہیں۔مرزا صاحب بھی کوتاہ عمل شخص ہیں۔یوں تو غریبوں کے بہت ہمدرد ہیں لیکن عملی طور پر وہ غریبوں کے لئے کچھ کرنے کی بجائے ان کے غریب ہونے میں انھیں کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔

مسز مالتی ایک مارڈن خاتون ہیں جن کے بڑے بڑے لوگوں سے مراسم ہیں مگر وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جو ہر طرح سے مکمل شخصیت کا مالک ہو۔مسٹر کھنا مسز مالتی کو دیوانوں کی طرح چاہتے ہیں لیکن اس کے پس پشت ان کی یہ ہوشیاری ہے کہ وہ مسز مالتی کے ذریعہ وزرا اور روؤسا سے تعلقات استوار کر سکیں۔

ہوری کی گائے پر ہر کسی کی نظر رہتی ہے۔ان میں ٹھاکر صاحب پیش پیش ہیں۔ٹھاکر صاحب نے ہوری کو ادھار دیتے ہوئے

کہا کہ وہ انہیں ادھار کے بدلے ۳۰ روپئے میں گائے دے دے مگر ہوری کے لئے گائے دیوی کا روپ تھی اور دیوی کا سودا نہیں کیا جاتا ہے لہٰذا وہ گائے دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اسی بغض میں ایک شام کوئی گائے کو زہر دے دیتا ہے اور گائے تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہے۔ سبھی ہوری کے بھائی ہیرا پر شک کرتے ہیں کیوں کہ کچھ دن پہلے ہی ہوری کی بیوی دھنیا کی اس سے لڑائی ہوئی تھی۔ پولیس کیس ہوتا ہے، داروغہ ہیرا کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں لیکن ہوری اپنے بھائی کی عزت کی خاطر ایسا نہیں ہونے دیتا۔ ہوری کو مقروض رکھنے کے لئے گاؤں کے لوگ ایک چال چلتے ہیں اور داروغہ کو رشوت کے بطور تیس روپئے دیتے ہیں مگر ہوری کی بیوی دھنیا جو کہ ایک متحرک، فعال اور باعمل کردار ہے، پیسہ چھین کر ان افراد کی خوب بے عزتی کرتی ہے۔

ہوری کا بیٹا گوبر جس کا معاملہ بھولا کی بیٹی جھنیا سے ہو جاتا ہے تعلقات اتنے زیادہ بڑھ جاتے ہیں کہ جھنیا حاملہ ہو جاتی ہے۔ اور پھر جھنیا اپنا حمل لے کر ہوری کے گھر آ دھمکتی ہے۔ گوبر جو ڈر سے پہلے ہی گاؤں چھوڑ چکا ہے، ساری مصیبت اس کے والدین (ہوری اور دھنیا) پر آ گرتی ہے مگر دھنیا جھنیا کو اپنی بہو تسلیم کر لیتی ہے۔ بھولا اور اس کے لوگ ہوری سے دشمنی نکالنا چاہتے ہیں۔ اس نتیجے میں برادری فیصلہ کرتی ہے کہ اس بار کی ہوری کی تمام فصل ضبط کر لی جائے گی اور اس پر ۱۰۰ روپئے کا محصول الگ سے لگایا جائے گا۔ یہ سب ہوری کی استطاعت میں نہیں تھا مگر وہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جاتا ہے اور جرمانہ ادا کرتا ہے۔ اسی درمیان جھنیا نے بیٹے کو جنم دیا۔ ہوری کے گھر میں کچھ اناج نہ تھا۔ بچے کھانے کو مانگتے تھے تبھی ہیرا کی بیوی (پنیا) نے دو من اناج لا کر دیا اور کہا کہ یہ سب ہوری بھیا کی محنت کی وجہ سے ہے ورنہ ہیرا تو کب کا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور اب تک نہیں لوٹا۔

بھولا جس نے ہوری کو گائے دیا تھا اس سے پیسہ چکانے کو کہتا ہے جس کے جواب میں ہوری کہتا ہے کہ وہ چاہے تو گھر کی تلاشی لے لے، گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر بھولا ہوری سے اپنی بیٹی جھنیا کو گھر بدر کرنے کو کہتا ہے کیوں کہ اس نے اس کی عزت خاک میں ملائی ہے لہٰذا وہ بھی اسے در بدر دیکھنا چاہتا ہے، لیکن ہوری ایسا کرنے سے انکار کر دیتا ہے جس کے بدلے میں بھولا ہوری کا آخری سہارا اس کا بیل کھول لے جاتا ہے۔

بیلوں کے بنا کھیتی کرنا امر محال تھا مگر پھر بھی برہمن چاچا کی مہربانی سے آدھے فصل کی قیمت پر کھیتی کی۔ فصل فروخت ہوتے ہی قرض دینے والے آن کھڑے ہو گئے اور اس طرح ہوری سارا پیسہ قرض میں دے کر پھر خالی ہاتھ ہو گیا۔

گوبر نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ شہر سے کما کر اپنے گھر کے حالات بدل دے گا، گاؤں واپسی کرتا ہے اور دنیاداری کی سمجھ اسے باشعور اور پختہ مرد بنا دیتی ہے۔ گھر آ کر دیکھتا ہے کہ گھر کے حالات نہایت بوسیدہ ہیں، باپ پر قرض پہلے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ وہ سب کچھ ٹھیک کرنا چاہتا ہے مگر اپنے باپ کی بزدلی دیکھ کر اپنے والدین سے لڑ جھگڑ کر واپس شہر چلا جاتا ہے۔

ہوری کا قرض بڑھتا جا رہا تھا کہ اس کی بیٹی سونا سترہ برس کی ہو جاتی ہے، اب اسے اس کی شادی کی فکر ستانے لگتی ہے۔ شادی کے لئے دلاری سے قرض مانگتا ہے مگر دلاری جو کہ ایک کیرانہ اسٹور چلاتی ہے کہہ کر مکر جاتی ہے۔ گوبر کی بدتمیزی کی سزا ہوری کو مہنگی پڑنے لگی تھی۔ مگر ایسے مشکل وقت میں ایک داشتہ مہتری ہوری کے کام آتی ہے اور سو روپئے ادھار بلا سود کے ہوری کو دے دیتی ہے۔ مہتری سماج میں عزت پانا چاہتی ہے اسی غرض سے وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرتی ہے۔

مسٹر کھنا جو کہ غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں، جوں ہی مزدوروں نے پیسہ بڑھانے کے لئے احتجاج کیا۔مسٹر کھنا نے پولیس کے ذریعہ مزدوروں کی خوب پٹائی کرائی جن میں کچھ مزدوروں کو جان سے ہاتھ گنوانی پڑی۔

گوبر اپنی فیملی کے ساتھ لکھنؤ پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے مرزا صاحب نے اس کی چائے بیچنے والی جگہ کسی اور کو دے دی اور اب اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔اپنی بیوی جھنیا کو دکھائے سارے خواب ٹوٹنے لگے۔لہٰذا تھک ہار کر مزدوری کرنے لگا۔دن بھر مزدوری کرتا اور کمائے پیسے شام کو نشے اور جوئے میں اڑا دیتا۔بیوی بچہ بھوک سے بلکنے لگے اور آخر کار اس کا بچہ چنو مر جاتا ہے۔جھنیا دوسرا بچہ جنتی ہے۔اسی دوران گوبر مار کھا کر آتا ہے اور چارپائی پر پڑ جاتا ہے اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔مجبوراً جھنیا کو کمانے نکلنا پڑتا ہے۔

مالتی گوبر کو اپنے گھر نوکر رکھ لیتی ہے اور اس کے بچے کا علاج کراتی ہے جس کے لئے وہ مالتی کا احسان مند ہوتا ہے کہ اس نے اس کے چیچک سے متاثر بچے کی دن رات خدمت کی اور گوبر اور جھنیا کو اپنے گھر میں پنکھے والے کمرے میں جگہ دی۔

ہوری کو روپا کی شادی کرنے کے لئے زمین بیچنے کی نوبت آجاتی ہے مگر وہ ایسا نہ کر کے اپنی بیٹی روپا کو ہی ایک معمر شخص کو بیچ دیتا ہے۔روپا کو وہ دل و جان سے عزیز رکھتا تھا،اس عمل نے اسے اندر سے توڑ دیا اور آخر کار ایک دن وہ مر جاتا ہے۔ہوری کی آخری رسومات ادا کرنے کے لئے پنڈت گئودان مانگتا ہے،ایک ایسا شخص جس کی عمر بھر اپنی چوکھٹ پر گائے دیکھنے کی خواہش رہی ہو اور وہ اسے انجام نہ دے پایا ہو اس کی بیوی کیونکر ایسا کر سکتی تھی۔اس طرح ناول کا اختتام ایک المیہ پر ہوتا ہے۔اس ناول کی کہانی سے متعلق پروفیسر قمر رئیس کہتے ہیں:

> ''ہوری کی یہ کہانی فنی اعتبار سے اتنی مربوط اور مکمل ہے کہ کرداروں کا ارتقا اور واقعات کا سلسلہ اتنا رواں اور فطری ہے کہ قاری کی دلچسپی ایک پل کے لئے بھی کم نہیں ہوتی۔پریم چند کا کمال یہ ہے کہ اس میں وہ کسی مثالی نوجوان کے بجائے گاؤں کے ایک ادنیٰ اور بوڑھے کسان کو ہیرو بناتے ہیں۔جس میں ہر طرح کی کمزوریاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔''

7.4 گئودان کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

گئودان پریم چند کا ضخیم ناول ہے جو ۵۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ناول میں ۳۶ ابواب ہیں،ابتدائی آٹھ ابواب کرداروں کے تعارف سے متعلق ہیں۔یہ تمام کردار اپنے ارد گرد کے ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔اگر پال سنگھ، ہوری، دھنیا، گوبر، جھنیا، بھولا، داتا دین، جھنگری، مہتری، مرزا خورشید، مسٹر مہتا، مسز مالتی، رائے صاحب وغیرہ کرداروں کو پریم چند نے بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔ہوری کا کردار کسانوں کے سماج اور زندگی کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔اس کی بیوی دھنیا بھی دیہی علاقے کے کسان مزدور کی زندگی کی پریشانیوں اور تنگدستی میں اپنے شوہر کا ساتھ نبھانے والی مثالی عورت کا خوبصورت کردار ہے۔

گئودان میں پریم چند نے ہندوستان کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ہوری کا کردار ایک ایسے انسان کا کردار ہے جس میں تمام

اچھائیاں اور خامیاں موجود ہیں۔انہوں نے دیہات کی حقیقت اتنی سفاکی سے پیش کی ہے جس کی مثال اس عہد کے ناولوں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔اس ناول میں ہندوستانی کھیت اور باغات لہلہاتے اور پھلتے پھولتے دکھائی دیتے ہیں۔

گئودان میں ایک طرف مہاجنوں کی چالبازیاں، مکاریاں اور ریاکاریاں ہیں تو دوسری جانب کسانوں، مزدوروں کی سادگی اور معصومیت بھی ہے۔ظالموں کا ظلم ہے تو بھائی کی بھائی سے حسد اور محبت وشفقت بھی اس ناول کا حصہ ہے۔اس ناول کے بیشتر کردار استحصال کرنے والے افراد ہیں، غریبوں اور مزدوروں کا حق سلب کرنے والے کردار ہیں۔گاؤں کی زندگی میں یہ کسانوں کو اپنا شکار بناتے ہیں جب کہ شہری زندگی میں مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں۔

ناول دیہاتی اور شہری زندگیوں اور اس کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتا ہے۔اگر یہ ناول شہر اور دیہات کی زندگیوں اور پلاٹ کو لے کر الگ الگ لکھا جاتا تو دو ناول ہو سکتے تھے۔ایک ناول شہری زندگی کے مسائل اور دشواریوں کو دکھاتا، وہاں کی زندگی کی بھاگ دوڑ ،گلا کاٹ مقابلے کی نمائندگی کرتا تو دیہات والا ناول کسانوں کی زندگیوں کی دشواریاں مہاجنوں کی زیادتیوں، چھوٹی موٹی خواہشات کی تکمیل کے ہر لمحہ زندگی کو سسکیوں سے بھر رہنے والے مناظر کی عکاسی کرتا ہے۔

ناول بنیادی طور پر گاؤں کے اور اس کے لوگوں کے لئے لکھا گیا ہے جس میں شہری زندگی کی ناہمواریوں کو بھی شامل کیا گیا ہے مگر شہری زندگی کی تفصیلات میں نسبتاً کمی ہے۔پریم چند کی زندگی کا خاصا حصہ شہر میں بھی گزرا لہٰذا ان کرداروں اور پلاٹ میں ان کی شہری زندگی کے تجربات دیکھے جاسکتے ہیں۔

پریم چند نے اپنے ناول کے ذریعہ سماج کے ان پہلوؤں کی عکاسی کی ہے جو منفی اور بد کردار ہیں۔جب کہ سماج کی جتنی خامیاں (خواہ وہ دیہی سماج ہو یا شہری سماج) پریم چند نے دکھائی ہیں اس سے ناول پٹا پڑا ہے۔اس طرح یہ ناول سماج کے انہیں حصوں پر نظر کرتا ہے جہاں صرف عیب ہیں۔اچھائیاں پریم چند نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے یا اس سے یکسر نظر پھیر لیا ہے۔

کردار نگاری: جہاں تک کردار نگاری کا سوال ہے تو اس ناول میں مرکزی اور ضمنی دو طرح کے کردار ہیں۔ہوری اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو ایک مظلوم اور مفلس کسان کی نمائندگی کرتا ہے اور روایت پرست اور رشتوں کا خیال کرنے والا ایک ہمدرد اور انسان دوست شخص ہے لیکن اس کے اندر انسانی جبلت اور اس کی تمام ترکمیاں بھی موجود ہیں۔اس کردار کے متعلق علی سردار جعفری کہتے ہیں کہ:

''ہوری ہمارے ادب کا پہلا عظیم کردار ہے۔''

(ترقی پسند ادب، علی سردار جعفری، ص ۱۲۵)

دھنیا اس ناول کی ہیروئن ہے جو ایک وفادار اور سمجھدار خاتون ہے۔مشکل میں ہمت نہیں ہارتی اور فیصلہ لینے میں کوتاہ بھی نہیں ہے۔وہ ایک نڈر اور بے باک خاتون ہے جو داروغہ کے سامنے بھی ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور مکھیا کے سامنے بھی۔دھنیا کے کردار کے متعلق عقیل رضوی لکھتے ہیں:

''دھنیا کے خون میں ہندوستان کی تڑپتی ہوئی انسانیت ہے جو اس نظام کی سختیوں سے ہار کر بے ہوش

ہوکر گر پڑتی ہے مگر کسی میں ہمت نہیں کہ اس آہنی حلقے کو توڑ سکے۔''

(پریم چند ایک سماجی حقیقت نگار۔ڈاکٹر عقیل رضوی،ص ۱۰۹)

اسی طرح گوبر نوجوان نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔وہ اپنی آنکھوں سے ظلم وزیادتی کو دیکھتا ہے۔ایک غلطی کی پاداش میں گاؤں چھوڑ کر چلا جاتا ہے مگر وہ اپنے ارادے کا پکا ہے۔خود سے واعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو ایک اچھی زندگی دے گا اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب ہوگا ؤں لوٹتا ہے۔

اس کے علاوہ جھنیا رائے صاحب،مرزا خورشید،مسز مالتی جیسے کردار ہمارے اردگرد دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔پریم چند نے یہ سارے کردار ہمارے اپنے اردگرد سے اٹھائیں ہیں۔اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ پریم چند نے گؤدان میں کئی جیتے جاگتے کردار پیش کیے ہیں۔

منظر نگاری : گئودان میں پریم چند نے گاؤں اور شہر دونوں جگہوں کے مناظر بڑی چابکدستی سے پیش کیے ہیں۔قدرت کے حسن اور انسانی فن کاری کے مناظر ان کے ناول میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔یہاں ایک جانب انسانی احوال و کشمکش کی تصویر کھینچتے ہیں تو دوسری جانب گاؤں کے کھیت کھلیان،باغات کے خوبصورت مناظر اور رات کے وقت چاندنی کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔اس حوالے سے یہ اقتباس ملاحضہ کیجئے:

''کاتک کی روپہلی چاندنی ساری فضا پر کسی میٹھے راگ کی طرح چھائی ہوئی تھی۔سلیا گھر سے نکلی۔وہ سونا کے پاس جا کر اسے یہ مژدہ سنائے گی کہ اب اس سے نہیں رہا جاتا۔ابھی تو شام ہوئی ہے۔ڈونگی اس پار تھی اور ملاح کا کہیں پتہ نہ تھا۔چاند گھل کر جیسے ندی میں بہا جا رہا تھا۔وہ ایک لمحہ کھڑی سوچتی رہی پھر ندی میں گھس پڑی۔ندی میں کچھ ایسا زیادہ پانی تو کیا ہوگا اس خوشی کے سمندر کے آگے ندی کیا چیز ہے۔''

تشبیہات: پریم چند کی تشبیہات بہت پر اثر اور موثر ہیں۔یہ تشبیہات پریم چند کے ذاتی تجربات کی دین ہیں جو اردو زبان وادب کی روایت سے قطعاً مختلف اور حقیقت کی سفاک آئینہ دار بھی ہیں۔مثلاً

''اس کے چہرے پر ایسا جھوٹا عاجزانہ انداز تھا جو بھیک مانگتے وقت بھکاریوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔''

''ہوری کے کھیت کسی بے کس عورت کی طرح سونے پڑے تھے۔''

مکالمہ نگاری: پریم چند نے گؤدان میں مکالمے بڑے فطری انداز میں پیش کیے ہیں۔کردار جس ماحول سے تعلق رکھتے ہیں وہ وہی زبان استعمال کرتے ہیں۔دیہاتی محاورے،الفاظ اور لہجہ گؤدان کے مکالموں کی خاصیت ہے۔واقعات وجذبات کتنے ہی گنجلک کیوں نہ ہوں پریم چند نے نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔گاؤں کی زندگی کی تجربات کو پریم چند نے اپنی قدرت کمال سے بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ذیل مکالمہ دیکھیے۔

ہوری کہتا ہے، ''بھگوان کہیں ٹھیک ٹھاک برکھا کر دیں اور میڑ بھی ٹھیک سے رہیں تو ایک گائے جرور (ضرور) لے گا۔

ہوری بھولا سے کہتا ہے-''دھنیا تمہارے سبھاؤ سے بڑی کھس (خوش) رہتی ہے۔''

غرض کہ پریم چند نے گئودان کے ذریعہ ہوری جیسے معمولی کسان کو ناول کا مرکزی کردار عطا کیا اور پلاٹ کے لئے ایک گاؤں کو منتخب کر اردو ناول میں چلے آرہے اس رسم سے خلاف بغاوت کی بنیاد ڈالی جس میں امرا اور وؤساء ہی ہیرو، ہیروئن ہوتے تھے اور جہاں عیش وعشرت کی کہانیاں ہی پیش کی جاتی تھیں۔ گؤ دان کو پریم چند نے ایک مدت میں بڑی محنت سے تخلیق کیا جو حقیقت نگاری اور اپنی سادگی کی بنا پر اردو ناول کا روشن مینارہ ہے۔

7.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ نے سیکھا

- اردو ناول کی ابتدا کس طرح اور کس ناول سے ہوئی
- ابتدائی ناولوں کے موضوعات کیا تھے
- ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کے موضوعات کیا تھے
- پریم چند تک آتے آتے اردو ناول کے موضوعات اور زبان و بیان میں کس قدر تبدیلی ہوئی
- پریم چند کے ناولوں کی خصوصیات کیا ہیں
- ناول گئودان کیونکر پریم چند کا شاہکار ہے

7.6 اپنا امتحان خود لیجیے

۱- پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات بتائیے۔

۲- پریم چند کے ناولوں کے نام بتائیے۔

۳- پریم چند کے ناولوں کے پلاٹ کی خصوصیات بتائیے۔

۴- ناول ''گئودان'' کا موضوع کیا ہے؟

۵- ناول ''گئودان'' کے کردار نگاری کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

7.7 سوالات کے جواب

۱۔ پریم چند اردو فکشن پر ایک سائے کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر پریم چند افسانہ نگار ہیں لیکن جب ناول کی جانب سنجیدگی سے توجہ صرف کی تو یہاں بھی مردِ میدان ثابت ہوئے۔ انہوں نے اردو فکشن کو پہلے پہل حقیقت نگاری سے روشناس کرایا، اس بنا پر وہ ایک انفرادی مقام بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کے ابتدائی ناولوں پر رومانیت حاوی ہے۔ اس کے بعد کے ناولوں میں وہ حقیقت سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی تحریروں میں مزدوروں، کسانوں اور دبے کچلے انسانوں کی کہانیوں کو موضوع بناتے ہیں۔

۲۔ پریم چند کے ناولوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)۔ اسرارِ معابد (۲)۔ ہم خرما و ہم ثواب (۳)۔ جلوۂ ایثار (۴)۔ بازارِ حسن (۵)۔ بیوہ (۶)۔ نرملا (۷)۔ غبن (۸)۔ گوشۂ عافیت (۹)۔ چوگانِ ہستی (۱۰)۔ پردۂ مجاز (۱۱)۔ میدانِ عمل (۱۲)۔ گئودان (۱۳)۔ منگل سوتر (نامکمل)

۳۔ پلاٹ کے اعتبار سے بات کی جائے تو پریم چند کے ناول دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ پہلا سنگل یا اکہرے پلاٹ دوسرے دوہرے یا مرکب پلاٹ۔ سنگل پلاٹ کے ضمن میں ''بیوہ''، ''نرملا''، ''غبن''، اور ''بازارِ حسن'' جیسے ناولوں کا شمار ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں پلاٹ ہیرو، ہیروئن کے اردگرد ہی رکھا گیا ہے اور واقعات کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ مرکب پلاٹ پر مبنی ناولوں میں دیگر کرداروں کی داستان بھی ہے۔ ''گوشۂ عافیت''، ''چوگانِ ہستی''، ''پردۂ مجاز''، ''میدانِ عمل''، اور ''گئودان''، مرکب پلاٹ کے ناول ہیں۔

۴۔ گئودان پریم چند کا شاہکار ہے جسے پریم چند نے اپنے ذاتی پریس ''سرسوتی پریس'' سے ۱۹۳۶ میں شائع کیا۔ یہ ناول انھوں نے ۱۹۳۲ میں لکھنا شروع کیا اور غالباً یہ ناول لکھنے میں پریم چند نے سب سے زیادہ وقت لیا۔ اسے مکمل کرنے میں تقریباً چار سال وقت لگا اس طرح یہ ناول سب سے پہلے ہندی زبان میں ۱۹۳۶ میں شائع ہوا۔ اقبال بہادر ورما ساحر نے اس ناول کو سب سے پہلے زبان میں پیش کیا۔ یہ ناول پریم چند کی دیہی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ انھوں نے دیہات میں کسانوں، مزدوروں کے درمیان ایک عمر بسر کی، انھوں نے اس ماحول کو قریب سے دیکھا اور اپنے اس ناول میں حقیقت بنا کر پیش کر دیا۔ گئودان میں پریم چند نے ہندوستان کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ ہوری کا کردار ایک ایسے انسان کا کردار ہے جس میں تمام اچھائیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ انہوں نے دیہات کی حقیقت اتنی سفاکی سے پیش کی ہے جس کی مثال اس عہد کے ناولوں میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس ناول میں ہندوستانی کھیت اور باغات لہلہاتے اور پھلتے پھولتے دکھائی دیتے ہیں۔

گئودان میں ایک طرف مہاجنوں کی چالبازیاں، مکاریاں اور ریاکاریاں ہیں تو دوسری جانب کسانوں، مزدوروں کی سادگی اور معصومیت بھی ہے۔ ظالموں کا ظلم ہے تا بھائی کی بھائی سے حسد اور محبت وشفقت بھی اس ناول کا حصہ ہے۔ اس ناول کے بیشتر کردار استحصال کرنے والے افراد ہیں، غریبوں اور مزدوروں کا حق سلب کرنے والے کردار ہیں۔ گاؤں کی زندگی میں یہ کسانوں کو اپنا شکار بناتے ہیں جب کہ شہری زندگی میں مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں۔

ناول دیہاتی اور شہری زندگیوں اور اس کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتا ہے۔ اگر یہ ناول شہر اور دیہات کی زندگیوں اور پلاٹ کو لے کر الگ الگ لکھا جاتا تو دو ناول ہو سکتے تھے۔ ایک ناول شہری زندگی کے مسائل اور دشواریوں کو دکھاتا، وہاں کی زندگی کی بھاگ دوڑ، گلا کاٹ مقابلے کی نمائندگی کرتا تو دیہات والا ناول کسانوں کی زندگیوں کی دشواریاں مہاجنوں کی زیادتیوں، چھوٹی موٹی خواہشات کی تکمیل کے ہر لمحہ زندگی کو سسکیوں سے بھر رہنے والے مناظر کی عکاسی کرتا ہے۔

۵۔ جہاں تک کردار نگاری کا سوال ہے تو اس ناول میں مرکزی اور ضمنی دو طرح کے کردار ہیں۔ ہوری اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو ایک مظلوم اور مفلس کسان کی نمائندگی کرتا ہے اور روایت پرست اور رشتوں کا خیال کرنے والا ایک ہمدرد اور انسان دوست شخص ہے لیکن اس کے اندر انسانی جبلت اور اس کی تمام تر کمیاں بھی موجود ہیں۔ دھنیا اس ناول کی ہیروئن ہے جو ایک وفا دار اور سمجھدار خاتون ہے۔ مشکل میں ہمت نہیں ہارتی اور فیصلہ لینے میں کوتاہ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک نڈر اور بے باک خاتون ہے جو داروغہ کے سامنے بھی ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور مکھیا کے سامنے بھی۔ اسی طرح گوبر نوجوان نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے ظلم وزیادتی کو دیکھتا ہے۔ ایک غلطی کی میں گاؤں چھوڑ کر چلا جاتا ہے مگر وہ اپنے ارادے کا پکا ہے۔ خود سے واعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو ایک اچھی زندگی دے گا اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب ہو گاؤں لوٹتا ہے۔

اس کے علاوہ جھنیا، رائے صاحب، مرزا خورشید، مسز مالتی جیسے کردار ہمارے اردگرد دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ پریم چند نے یہ سارے کردار ہمارے اپنے اردگرد سے اٹھائیں ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ پریم چند نے گئودان میں کئی جیتے جاگتے کردار پیش کیے ہیں۔

7.8 فرہنگ

لفظ	معنی
گئو	گائے
دان	خیرات (خدا، ایشور کی راہ میں خرچ کرنا)
جاگیرداری	زمین یا گاؤں وغیرہ جو کسی کو سرکاری طور پر عطا کی گئی
بانکپن	چھب، تیکھاپن، معشوقانہ ادا، دل موہ لینے والی ادا

دھن	دولت، روپیہ پیسہ
جگت نکالنا	راہ نکالنا
بچھیا	گائے کا بچہ
سوراج	خود کی حکومت (جمہوری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے)
مکھیا	سرپنچ، سردار
کڑکی (قرقی)	سرکاری طور پر کسی کی جائیداد لے لینا
کلنکی	منحوس، بدکردار
بلیدان	قربانی

7.9 کتب برائے مطالعہ

گئودان : منشی پریم چند، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

بیسویں صدی میں اردو ناول: یوصف سرمست، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار: پروفیسر قمر رئیس، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ

پریم چند کی ناول نگاری: ڈاکٹر یوسف سرمست الیاس ٹریڈرس، حیدرآباد

گئودان کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، سلسلہ فیض المصنفین نمبر ۴

اکائی: 8 پریم چند بحیثیت افسانہ نگار اور ان کی افسانہ نگاری کے مختلف ادوار

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 پریم چند کے حالات زندگی

8.4 پریم چند بہ حیثیت افسانہ نگار اور ان کی افسانہ نگاری کے مختلف ادوار

8.4.1 افسانہ نگاری کا پہلا دور

8.4.2 افسانہ نگاری کا دوسرا دور

8.4.3 افسانہ نگاری کا تیسرا دور

8.5 آپ نے کیا سیکھا

8.6 اپنا امتحان خود لیجیے

8.7 سوالات کے جوابات

8.8 فرہنگ

8.9 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ☆ پریم چند کے حالات زندگی کا مطالعہ کرسکیں گے۔
- ☆ پریم چند کو بہ حیثیت افسانہ نگار جانیں گے۔
- ☆ پریم چند کی افسانہ نگاری کا جائزہ دیکھیں گے۔
- ☆ پریم چند کی افسانہ نگاری کے مختلف ادوار سے واقفیت حاصل کریں گے۔

8.2 تمہید

اردو ادب میں افسانہ نگاری کی باضابطہ ابتدا پریم چند سے ہوتی ہے۔ حالاں کہ ان سے پہلے بھی کئی تخلیق کاروں نے افسانے لکھے لیکن ان کے افسانے فن کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکے۔ اسی لیے ان افسانوں کی حیثیت محض ابتدائی نقوش کی حد تک ہی سمٹ کر رہ گئی اور پریم چند کو اردو کا باقاعدہ افسانہ نگار تسلیم کیا گیا۔ پریم چند کے افسانوں میں غریبوں، مفلسوں، مظلوموں، کسانوں، زمینداروں، محنت کش طبقوں کے ساتھ ہی دیہی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ پریم چند کی حیثیت ایک مصلح کی تھی۔ وہ سماج میں رائج ان تمام برائیوں اور خرابیوں کو دور کرنا چاہتے تھے جو انسانی سماج اور ملک کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ وہ اپنے ملک کو ایک اچھا اور مثالی نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کے کئی

افسانوں میں اس نظریے کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

پریم چند کے تمام افسانے مجموعوں کی شکل میں وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہے جن میں پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد پریم پچیسی، پریم بتیسی، خاک پروانہ، خواب وخیال، فردوس خیال، پریم چالیسی، زادراہ اور واردات وغیرہ شائع ہوئے۔ اس اکائی میں ہم ان کی افسانہ نگاری اور افسانہ نگاری کے مختلف ادوار کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

8.3 پریم چند کے حالات زندگی

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ ان کی ولادت ۱۸۸۰ء میں بنارس کے لمہی گاؤں ہوئی۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا جو ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ انھیں کی تنخواہ پر پورا گھر منحصر تھا۔ گھر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کھیتی باڑی بھی کی جاتی تھی۔ والدہ کا نام آنندی دیوی تھا جو نہایت نیک خاتون تھیں۔ پریم چند کے تایا دھنپت رائے کو نواب کہہ کر پکارتے تھے۔ پریم چند پانچ برس کے ہوئے تو پڑوسی گاؤں لال پور میں انھیں اردو اور فارسی کی تعلیم کے لیے ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا گیا۔ یہ گاؤں لمہی سے تقریباً دو کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ پریم چند کو سیر سپاٹے کے شوقین تھے۔ بچپن میں بہت شرارتی تھے۔ کبھی کبھی اسکول نہ جا کر ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے اور دوسروں کے کھیتوں سے مٹر وغیرہ توڑ کر کھاتے۔ پریم چند کا بچپن ہنسی خوشی گزر رہا تھا کہ اچانک انھیں ایک بڑے سانحے کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی وہ محض آٹھ برس کے ہوئے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور وہ ماں کی ممتا سے محروم ہو گئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد دادی نے ان کی پرورش کی۔ وہ پریم چند کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔ والدہ کی وفات کے بعد والد نے دوسری شادی کر لی۔ پریم چند سوتیلی ماں کو چاچی کہتے تھے۔ سوتیلی ماں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ دادی بھی کچھ عرصے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ایک طرف ماں کی رحلت اور دوسری طرف دادی کے انتقال کے باعث وہ شفقت و محبت اور ممتا سے محروم ہو گئے۔ سوتیلی ماں کے سلوک نے انھیں ہمیشہ ماں کی محرومی کا احساس دلایا جس کا اثر نہ صرف ان کی زندگی پر پڑا بلکہ ان کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

منشی عجائب لال کا ملازمت کے سلسلے میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں گورکھپور جانا پڑا تو وہ اپنے ساتھ پریم چند کو بھی لے گئے اور یہیں ان کا ایک اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ گورکھپور کا قیام پریم چند کے لیے کافی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اسی شہر میں رہتے ہوئے ان کے اندر ادبی ذوق وشعور بیدار ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے کئی ضخیم داستانیں اور ناول پڑھ ڈالیں۔ گورکھپور میں درجہ آٹھ تک کی تعلیم مکمل کر کے وہ بنارس آ گئے اور یہاں کوئنس کالج میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی ضلع بستی کے ایک زمیندار گھرانے میں کر دی گئی۔ اس شادی سے پریم چند خوش نہیں تھے۔ اس لیے یہ شادی زیادہ عرصے تک کامیاب نہ رہ سکی۔ بعد ازاں دونوں میں علاحدگی ہو گئی۔ ۱۸۹۷ء میں والد منشی عجائب لال علالت میں مبتلا ہونے کے باعث اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لہٰذا گھر کی تمام ذمہ داریاں پریم چند کے سر آ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنی پڑھائی کا خرچ بھی خود کو ہی اٹھانا پڑا۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں ضلع مرزا پور کے ایک قصبہ چنار کے ایک اسکول میں بہ حیثیت اسسٹنٹ ماسٹر کے ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد ۱۹۰۰ء میں بہرائچ میں بطور اسسٹنٹ ٹیچر اپنی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں فرسٹ ایڈ شنل ماسٹر کی حیثیت سے پرتاپ گڑھ آ گئے۔ ۱۹۰۲ء میں الہ آباد کے ٹریننگ کالج کے ماڈل اسکول میں بطور صدر مدرس کام کیا۔ ۱۹۰۵ء میں پریم چند نے شیورانی دیوی سے دوسری شادی کی جن کی عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں مہوبہ ضلع ہمیر پور میں سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول مقرر ہوئے۔ ملازمت اختیار کرنے کے کافی عرصے بعد انھوں

نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کی تعلیم انگریزی، تاریخ اور فارسی مضامین کے ساتھ مکمل کی۔ پریم چند دوران ملازمت پابندی سے لکھتے رہے۔ان کے ناول، افسانے اور مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔مشہور زمانہ رسالہ ''زمانہ'' جو کانپور سے نکلتا تھا اس میں ان کی تحریریں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے صحافتی خدمات بھی انجام دیں۔رسالہ اور اخبار جاری کیا اور پریس بھی قائم کیا۔

اکثر ادبا اور شعرا کی طرح پریم چند کی زندگی بھی ہمیشہ پریشانیوں کا شکار رہی۔ان پریشانیوں کی نوعیت مختلف تھیں۔کبھی معاشی پریشانی میں مبتلا رہے تو کبھی گھریلو مسائل سے دوچار رہے اور کبھی بیماریوں سے گھرے رہے۔لیکن ان سب کے باوجود وہ غم کو اپنے اوپر اوڑھتے نہیں تھے۔وہ ایک خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور ان کے ساتھ خوب ہنستے اور انھیں بھی ہنساتے تھے۔ان کے اندر انسانی ہمدردی اور بھائی چارگی کا جذبہ تھا۔ وہ دوسروں کے جذبات کا بھی خیال رکھتے تھے۔کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔وہ حق وصداقت اور انصاف کا دامن تھام کر چلتے تھے۔فرسودہ و کورانہ تقلید اور ضعیف الاعتقادی کے خلاف تھے۔وہ سماج میں لوگوں کو جوڑنے کا کام کرتے تھے۔اپنے ملک میں بسنے والے مختلف مذاہب اور تہذیب وتمدن کے لوگوں کو اخوت و ہمدردی کے دھاگے میں باندھنا ان کا مقصد اور مشن تھا۔ان کی زندگی ریاکاری، مفاد پرستی اور خودغرضی سے پاک تھی۔وہ ایک حقیقت پسند انسان تھے۔انھوں نے حقائق کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا جسے ہم ان کی تحریروں میں بہ خوبی دیکھ سکتے ہیں۔حقائق کی تبلیغ کرنے والا یہ مبلغ ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اس دنیا سے ہمیشہ ہمیش کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن اپنے کارناموں کی ایسی امٹ چھاپ چھوڑ گیا کہ اردو فکشن کی تاریخ اس کے نام کے بغیر ادھوری رہے گی۔

8.4 پریم چند بہ حیثیت افسانہ نگار اور ان کی افسانہ نگاری کے مختلف ادوار

پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کی آغاز ناول سے کیا۔افسانوں کی طرف وہ بعد میں آئے مگر اس صنف میں بھی اپنے کمالات فن کے جوہر دکھائے۔افسانوی دنیا میں ان کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔انھوں نے اس میدان میں ایک نئے طرز کی بنا ڈالی۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں عام طور پر غریب، کسان، مزدور اور حاشیے پر زندگی بسر کرنے والے اشخاص کو موضوع بنایا ہے۔ان کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے جس میں دلکشی، جاذبیت اور فطری بہاؤ ہے۔بیسویں صدی کے آغاز میں جب پورے ہندوستان میں آزادی کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی، عوام و خواص میں انگریزوں کے خلاف جذبہ بیدار کیا جا رہا تھا۔ادب نے بھی اس مشن میں کردار ادا کیا۔اس وقت کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ پریم چند نے بھی اس مہم میں حصہ لیا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس کام کو بخوبی انجام دیا۔زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے انسان کی سوچ، علم اور تجربہ میں اضافہ ہوتا ہے۔یہ اضافہ کسی فنکار کے فن کو پختہ سے پختہ تر بناتا ہے۔فکر وفن مرور ایام کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔اس لیے پریم چند کے فکر وفن کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کی افسانہ نگاری کا عہد بہ عہد جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ماہرین پریم چند نے ان کی افسانہ نگاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ہر دور میں الگ الگ رجحان اور فکر کا پتہ چلتا ہے۔جن کو تفصیل سے آگے بیان کیا جا رہا ہے۔

8.4.1 افسانہ نگاری کا پہلا دور

پریم چند کی افسانہ نگاری کا پہلا دور ابتدا تا ۱۹۱۷ کو محیط ہے۔ان کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' کے نام سے ۱۹۰۸ء میں

شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ابتدا میں پریم چند نے نواب رائے کے نام سے لکھنا شروع کیا۔''سوز وطن'' میں پریم چند کا قلمی نام نواب رائے چھپا تھا۔اس میں پانچ افسانے بعنوان ''دنیا کا سب سے انمول رتن، شیخ مخمور، یہی میرا وطن ہے، صلۂ ماتم، عشق دنیا اور حب وطن'' شامل تھے۔ان میں سب سے پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ہے۔اسی افسانے سے ان کی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔''سوز وطن'' کا موضوع انگریزوں کے خلاف آزادی کے جذبے سے معمور تھا۔اس لیے انگریزی سرکار نے اس مجموعے کو ضبط کرلیا۔اس کے بعد انھوں نے دوسرے نام (پریم چند) سے لکھنا شروع کردیا۔یہ نام منشی دیانرائن نگم مدیر ''زمانہ'' کے مشورہ پر اختیار کیا اور تادم آخر اسی نام سے لکھتے رہے۔

اس کے بعد پریم پچیسی حصہ اول اور پریم پچیسی حصہ دوم شائع ہوئے۔پریم پچیسی اول میں کل (۱۲) بارہ افسانے شامل تھے جن کے عنوانات اس طرح تھے: ''مامتا، وکرمادت، بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، راج ہٹ، راجہ ہردول، نمک کا داروغہ، عالم بے عمل، گناہ کا اگن کنڈ، بے غرض محسن، آہ بے کس اور آلھا''۔پریم پچیسی دوم میں (۱۳) تیرہ افسانے شامل تھے۔ان کے عنوانات ''خون سفید، صرف ایک آواز، اندھیر، بانکا زمین دار، تریا چرتر، امرت، شکاری راجکمار، کرموں کا پھول، مناون، مرہم، اماوس کی رات، غیرت کی کٹاری اور منزل مقصود'' تھے۔

اس دور میں ہندوستان میں ایک طرف قومی جذبہ لوگوں کے دل میں ابھر رہا تھا تو دوسری طرف اصلاحی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔پریم چند بھی ان سے متاثر ہوئے۔جس کا اثر ان کے ابتدائی دور کے افسانوں پر پڑا۔''سوز وطن'' کے افسانوں پر حب الوطنی اور اصلاحی جذبہ غالب ہے۔حب الوطنی کے جذبے سے سرشار پریم چند کی تحریروں کی ایک جھلک افسانہ ''یہی میرا وطن ہے'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس افسانے سے ایک اقتباس سپرد تحریر ہے:

> ''مگر جس وقت بمبئی میں جہاز سے اترا اور کالے کالے کوٹ پتلون پہنے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے ملاح دیکھے۔پھر انگریزی دکانیں۔ٹراموے اور موٹر گاڑیاں نظر آئیں پھر ربڑ والے پہیوں اور چرٹ والے آدمیوں سے مٹ بھیڑ ہوئی۔پھر ریل کا اسٹیشن دیکھا اور ریل پر سوار ہوکر اپنے گاؤں کو چلا۔پیارے گاؤں کو جو ہری بھری پہاڑیوں کے بیچ میں واقع تھا۔تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔میں خوب رویا۔کیوں کہ یہ میرا پیارا دیس نہ تھا۔یہ وہ دیس نہ تھا جس کے دیدار کی آرزو ہمیشہ میرے دل میں موجیں مارا کرتی تھی۔یہ کوئی اور دیس تھا۔یہ امریکہ تھا۔انگلستان تھا۔مگر پیارا بھارت نہیں!''

اسی افسانے کے آخر کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں انتہائی سرور کے عالم میں تھا۔میں نے اپنا پرانا کوٹ اور پتلون اتار پھینکا اور جا کر گنگا ماتا کے گود میں گر پڑا۔جیسے کوئی بے سمجھ بھولا بھالا بچہ دن بھر نا ہمدرد لوگوں کے ساتھ رہنے کے بعد شام کو اپنی پیاری ماں کے گود میں دوڑ کر چلا آئے اور اس کی چھاتی سے چمٹ جائے۔ہاں اب اپنے دیس میں ہوں۔یہ میرا پیارا وطن ہے۔یہ لوگ میرے بھائی ہیں۔گنگا میری ماتا ہیں!!!''

درج بالا تحریریں وطن سے انسیت، محبت، ہمدردی اور جوش سے بھری ہیں جو اہل وطن کو بیدار کرنے کے لیے شعوری طور پر لکھی گئی ہیں۔ایک ہندوستانی کس طرح اپنے ملک میں تبدیلی پر کرب اور بے چینی محسوس کر رہا ہے، اسے کس قدر اپنے وطن سے محبت ہے، منقولہ اقتباسات میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

تاریخی اور اصلاحی افسانے بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔اس عہد کے افسانوں میں وطن سے محبت کے جذبے کو دیگر جذبوں پر مقدم بتایا

گیا ہے۔اس زمانے میں انھوں نے ایسے افسانے بھی لکھے جن میں اصلاحی نقطۂ نظر واضح طور پر عیاں ہے۔مثلاً بڑے گھر کی بیٹی، نمک کا داروغہ اور بے غرض محسن اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ان افسانوں میں جہاں ایک طرف دیہات کی حقیقی زندگی کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے وہیں دوسری جانب اسے ذریعۂ اصلاح بھی بنایا گیا ہے۔

فنی اعتبار سے اس دور کے افسانوں پر داستانی اور تمثیلی رنگ حاوی ہے۔تمثیل کے پیرائے میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیتے ہوئے انھوں نے اپنے ملک اور قوم کے لوگوں کے دلوں میں وطن سے محبت اور ہمدردی کے جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

8.4.2 افسانہ نگاری کا دوسرا دور

پریم چند کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک کے زمانے کو پھیلا ہوا ہے۔اس عہد میں افسانوی مجموعے ''پریم بتیسی حصہ اول، پریم بتیسی حصہ دوم، خاک پروانہ، خواب وخیال، فردوس خیال، پریم چالیسی حصہ اول اور پریم چالیسی حصہ دوم'' منظر عام پر آئے۔''پریم بتیسی حصہ اول'' میں سولہ (۱۶) افسانے شامل تھے۔اس مجموعے میں ''اناتھ لڑکی، بانگ سحر، دھوکا، راجپوت کی بیٹی، سوتیلی ماں، قربانی، دو بھائی، نگاہ ناز اور مرض مبارک اہم افسانے ہیں۔''پریم بتیسی حصہ دوم'' میں بھی سولہ (۱۶) افسانے تھے۔ان میں ''اصلاح، ایمان کا فیصلہ، بوڑھی کا کی، حج اکبر، راہِ خدمت، بیٹی کا دھن، خون حرمت اور خنجر وفا'' قابل ذکر ہیں۔''خاک پروانہ'' سولہ (۱۶) افسانوں کا مجموعہ تھا۔اس میں ''نادان دوست، نغمۂ روح، فکر دنیا، خودی، تحریک، عجیب ہولی، ستیا گرہ، خاک پروانہ، مرزا آتشیں، بڑے بابو، دعوت، مستعار گھڑی، تالیف، کپتان، ملاپ اور علاحدگی'' افسانے شامل تھے۔''خواب وخیال'' چودہ (۱۴) افسانوں پر مشتمل مجموعہ تھا۔جس میں ''دست غیب، شطرنج کی بازی، فلسفی کی محبت، نوک جھونک، عبرت اور شدھی اہم افسانے ہیں۔''فردوس خیال'' بارہ (۱۲) افسانوں کا مجموعہ تھا۔اس کے اہم افسانوں میں ''توبہ، عفو، مریدی، راہ نجات، نیک بختی کے تازیانے، سواسیر گیہوں اور بھاڑے کا ٹٹو'' وغیرہ ہیں۔''پریم چالیسی حصہ اول'' میں بیس (۲۰) افسانے ہیں۔ان میں ''انتقام، قوم کا خادم، آنسوؤں کی ہولی، داروغہ کی سرگزشت، دین داری، سہاگ کا جنازہ، مندر، قزاقی اور کش مکش'' قابل ذکر ہیں۔''پریم چالیسی حصہ دوم'' میں بھی بیس (۲۰) افسانے ہیں۔جن میں ''بند دروازہ، پوس کی رات، چکمہ، ماں، دیوی، سزا، حسرت، مجبوری، بیوی سے شوہر'' وغیرہ اہم ہیں۔

اس دور میں قومی اور عالمی سطح پر بعض ایسے واقعات رونما ہوئے، مثلاً روس کا انقلاب، جلیاں والا باغ کا سانحہ اور رولٹ ایکٹ کا پاس ہونا وغیرہ جس کے نتیجے میں ہندوستان میں ستیہ گرہ، عدم تعاون اور خلافت تحریک کا آغاز ہوا۔ملک بھر میں لوگوں نے انگریزوں کے خلاف آواز بلند کر دیا۔پریم چند بھی ان تحریکات سے بہت متاثر ہوئے۔اس دور کے افسانوں میں اس عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی زندگی کی سچی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔عدم تعاون تحریک سے متاثر ہو کر پریم چند نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔''ستیہ گرہ، بھاڑے کا ٹٹو اور عجیب ہولی'' جیسے افسانوں میں سیاسی بیداری کا ماحول صاف دکھائی دیتا ہے۔اس عہد میں کئی ایسے افسانے لکھے گئے جن میں اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر کارفرما ہے۔مثلاً بوڑھی کا کی، حج اکبر، اصلاح کا نام لیا جا سکتا ہے۔افسانہ ''بوڑھی کا کی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''روپا کو اپنی خود غرضی اور بے انصافی آج تک کبھی اتنی صفائی سے نظر نہ آئی تھی۔ ہائے میں کتنی بے رحم ہوں۔جس کی جائداد سے مجھے دو سو روپے سال کی آمدنی ہو رہی ہے۔اس کی یہ درگت اور میرے کارن۔اے ایشور مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے، مجھے معاف کرو۔آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا۔ میں

ان کے اشارے کی غلام بنی ہوئی تھی۔ اپنے نام کے لیے، اپنی بڑائی کے لیے سیکڑوں روپئے خرچ کر دیئے۔ لیکن جس کی بدولت ہزاروں روپئے کھائے اسے اس تقریب کے دن بھی پیٹ بھر کر کھانا نہ دے سکی۔ محض اس لیے نہ کہ وہ بڑھیا ہے۔ بے کس ہے۔ بے زبان ہے۔

اس نے چراغ جلایا۔ اپنے بھنڈارے کا دروازہ کھولا اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجا کر لیے ہوئے بوڑھی کا کی کی طرف چلی۔''

اس اقتباس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ لوگوں کو ظلم، ناانصافی اور بے رحمی جیسے برے اعمال سے روکنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی خطا سرزد ہوگئی ہے تو اسے اپنے کیے پر پچھتاوا ہورہا ہے۔ اور آئندہ ایسے اعمال سے بچنے کی بھی ترغیب دی جارہی ہے۔

اس دور میں فنی نقطۂ نظر سے جو افسانے اہمیت کے حامل ہیں ان کی فضا اور موضوعات بیشتر گاؤں اور دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً بوڑھی کا کی، پوس کی رات، سوا سیر گیہوں، راہ نجات اور علاحدگی وغیرہ ہیں۔ پوس کی رات میں ایسا لگتا ہے کہ فطرت نے اپنے وجود کو ہلکو کسان کے وجود سے مکمل طور پر ہم آہنگ کرلیا ہے۔ ہلکو کسان کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جو سیکڑوں سال سے مظلومی، مجبوری اور افلاس کا شکار ہے۔ لیکن پھر بھی عوام وخواص کا پیٹ بھرنے کے لیے اناج اگاتا ہے۔ ہر طرح کی پریشانیوں کا سامنا بھی کرتا ہے۔ اسے موسم کی سختیاں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ ''پوس کی رات'' سے جاڑے کا ایک منظر پریم چند نے یوں پیش کیا ہے:

''پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کی پتیوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھ کتا ''جبرا'' پیٹ میں منھ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا۔ دونوں میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا۔'' کیوں جبرا جاڑا لگتا ہے۔ کہا تو تھا کہ گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔ تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اب کھا سردی۔ میں کیا کروں۔ جانتے تھے کہ میں حلوہ پوری کھانے جارہا ہوں۔ دوڑتے ہوئے آگے آگے چلے آئے۔ اب روؤ اپنی نانی کے نام کو۔''

8.4.3 افسانہ نگاری کا تیسرا دور

پریم چند کی افسانہ نگاری کا تیسرا دور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس دوران ''آخری تحفہ، زادراہ، دودھ کی قیمت اور واردات'' نام سے افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ ''آخری تحفہ'' میں کل تیرہ (۱۳) افسانے شامل تھے۔ اس مجموعے میں افسانہ ''قاتل، شکار، آخری تحفہ، طلوع محبت، وفا کی دیوی، نجات، دو بیل، جیل، برات، ادیب کی عزت، آخری حیلہ، ڈیمانسٹریشن، اور ستی'' کو جگہ دی گئی تھی۔ مجموعہ ''زادراہ'' میں کل پندرہ (۱۵) افسانے تھے۔ اس میں ''زیور کا ڈبہ، آشیاں برباد، خانہ داماد، قہر کا خدا، لعنت، بڑے بھائی صاحب، مس پدما، زادراہ، حقیقت اور ہولی کی چھٹی'' اہم افسانے ہیں۔ مجموعہ ''دودھ کی قیمت'' میں محض نو (۹) افسانے تھے۔ جن میں کسم، اکسیر، دودھ کی قیمت، عیدگاہ، سکون قلب، ریاست کا دیوان، وفا کا دیوتا، دو بہنیں اور زاویۂ نگاہ'' شامل تھے۔ آخری افسانوی مجموعہ ''واردات'' ہے جو ۱۹۳۸ء میں پریم چند کی وفات کے بعد شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس میں تیرہ (۱۳) افسانے ''شکوہ شکایت، معصوم بچہ، بدنصیب ماں،

شانتی، روشنی، مالکن، نئی بیوی، گلی ڈنڈا، سوانگ، انصاف کی پولیس، غم نداری بز بخر، مفت کرم داشتن اور قاتل کی ماں'' شامل تھے۔ پریم چند کا ایک شاہکار افسانہ ''کفن'' کے نام سے شائع ہوا جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ آخری دور کی تخلیق ہے۔ یہ ایسی تخلیق ہے کہ پریم چند کی افسانہ نگاری کا نام لیتے ہی ''کفن'' کا نام ذہن میں آجاتا ہے۔

اس دور میں پریم چند کے خیالات میں کافی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اب وہ کسی مسائل کو اصلاحی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے مادی حقائق کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں مثالیت یا آدرش واد کا زور کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام، زمینداری، نجی ملکیت، سیٹھ ساہوکار اور مہاجنوں کو ظلم واستحصال اور سماجی ناانصافیوں کا سبب مانتے ہیں۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک سماجی اور اقتصادی نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کی جائیں گی تب تک یہ ظلم واستحصال کا سلسلہ جاری رہے گا۔ وہ فرقہ پرستانہ تحریکوں کے خلاف تھے۔ زبان وادب اور تہذیب وتمدن کو کسی مذہب سے جوڑنا بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ زبانیں خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہیں ان کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پریم چند کا افسانہ ''نجات'' جب شائع ہوا تو ہندی رسالہ ''سرسوتی'' کے ایک مضمون میں ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں خاص طور پر پنڈتوں کے خلاف نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں پریم چند نے ایک مضمون بعنوان ''زندگی میں نفرت کا مقام'' لکھا جو رسالہ ''ہنس'' میں شائع ہوا، جس میں غریبوں اور مظلوموں کے خون چوسنے والے افراد کے خلاف نفرت کے جذبے کو عام کرنا جائز ٹھہرایا۔ انھوں نے ظلم اور ظالم دونوں کے خلاف آواز بلند کرنے اور غریبی کو دور کرنے کے لیے مظلوموں کے ضمیر کو بیدار کرنا ضروری سمجھا۔ ان کے کچھ افسانے ایسے ہیں جن میں انھوں نے حقیقت پسندی کی المناک سچائیوں کو برہنہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس ضمن میں ''دودھ کی قیمت اور نجات'' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں جو کردار پیش کیے ہیں ان کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ اس تعلق سے افسانہ ''نجات'' کی مندرجہ ذیل عبارت قابل غور ہے:

> ''دکھی اپنے ہوش میں تھا نہ معلوم کون سی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی، تکان، بھوک، پیاس، کمزوری سب کے سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے قوت بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی، آدھ گھنٹے تک وہ اسی طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا، حتیٰ کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی اور دکھی کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی چکر کھا کر گر پڑا۔ بھوکا، پیاسا، تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔''
>
> پنڈت جی نے پکارا اٹھ کر دو ہاتھ اور لگا دے، پتلی پتلی چیلیاں ہو جائیں، دکھی نہ اٹھا، پنڈت جی نے اب اسے دق کرنا مناسب نہیں سمجھا اندر جا کر بوٹی چھانی، حاجات ضروری سے فارغ ہوئے، نہایا اور پنڈتوں کا لباس پہن کر باہر نکلے۔ دکھی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا زور سے پکارا اسے دکھی کیا پڑے ہی رہو گے؟ چلو تمھارے ہی گھر چل رہا ہوں، سب ٹھیک ہے نہ؟ دکھی پھر بھی نہ اٹھا۔
>
> اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہوئی۔ پاس جا کر دیکھا تو دکھی اکڑا ہوا پڑا تھا، بدحواس ہو کر بھاگے اور پنڈتانی سے بولے، دکھیا تو جیسے مر گیا۔''

وہ دکھیا جو ہمیشہ پنڈت جی کی خدمت میں لگا رہتا تھا آج انھیں کا کام کرتے کرتے اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ اس کے مرجانے کے بعد

پنڈت جی اس کے پیروں میں رسی باندھ کر اسے دور پھینک دیتے ہیں۔اس کے ساتھ زندہ رہنے پر بھی جانوروں جیسا برتاؤ کرتے ہیں اور اب جب کہ وہ مر چکا ہے تب بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں۔ پریم چند اس منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

''رات تو کسی طرح کٹی، مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا، چمارنی بھی روپیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی، پنڈت جی نے ایک رسی نکالی، اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا، ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گاؤں کے باہر گھسیٹ لے گئے وہاں سے آ کر فوراً نہائے درگا پاٹ پڑھا اور گھر میں گنگا جل چھڑکا۔

ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔''

پریم چند کا نقطۂ نگاہ سماجی اور مذہبی معاملات میں اب عقلی اور حقیقت پسندانہ ہو گیا ہے۔ وہ توہمات، فرسودہ روایتوں، ضعیف الاعتقادی، خیالی اور بے سروپا کی باتوں میں یقین نہیں رکھتے۔ وہ عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ انسانیت، ہمدردی، بھائی چارا، محبت و اخوت، آپسی میل جول پر زور دیتے ہیں۔

فنی اعتبار سے انھوں نے اپنے افسانوں میں سادہ، سلیس، شفاف اور عام فہم زبان استعمال کیا ہے۔ فکر و اظہار کا سادہ اور حقیقت پسندانہ اسلوب ان کی شناخت بن گئی ہے۔ ان کی تحریریں لفظی آرائش، تصنع، تکلف سے اکثر پاک ہیں۔ وہ اپنی بات کو براہ راست اور سادگی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ کا تخلیقی استعمال ملتا ہے۔

8.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

پریم چند کے حالات زندگی سے واقف ہوئے۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کے بارے میں جانا۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کے مختلف ادوار کا مطالعہ کیا۔

8.6 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ پریم چند کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

سوال:2۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے پہلے دور کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

سوال:3۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے تیسرے دور کا خلاصہ پیش کیجیے۔

8.7 سوالات کے جوابات

جواب نمبر1۔ پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ ان کی ولادت ۱۸۸۰ء میں بنارس کے لمہی گاؤں ہوئی۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ والدہ کا نام آنندی دیوی تھا جو نہایت نیک خاتون تھیں۔ پریم چند کے تایا دھنپت رائے کو نواب کہہ کر پکارتے تھے۔ پریم چند پانچ برس کے ہوئے تو پڑوسی گاؤں لال پور میں انھیں اردو اور فارسی کی تعلیم کے لیے ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا گیا۔ یہ گاؤں لمہی

سے تقریباً دوکلومیٹر کی دوری پر تھا۔ پریم چند کا بچپن ہنسی خوشی گزر رہا تھا کہ اچانک انھیں ایک بڑے سانحے کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی وہ محض آٹھ برس کے ہوئے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور وہ ماں کی ممتا سے محروم ہوگئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد دادی نے ان کی پرورش کی۔ وہ پریم چند کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔ والدہ کی وفات کے بعد والد نے دوسری شادی کر لی۔ پریم چند سوتیلی ماں کو چاچی کہتے تھے۔ سوتیلی ماں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ دادی بھی کچھ عرصے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ ایک طرف ماں کی رحلت اور دوسری طرف دادی کے انتقال کے باعث وہ شفقت و محبت اور ممتا سے محروم ہوگئے۔ سوتیلی ماں کے سلوک نے انھیں ہمیشہ ماں کی محرومی کا احساس دلایا جس کا اثر نہ صرف ان کی زندگی پر پڑا بلکہ ان کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

منشی عجائب لال کا ملازمت کے سلسلے میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں گورکھپور جانا پڑا تو وہ اپنے ساتھ پریم چند کو بھی لے گئے اور یہیں ان کا ایک اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ گورکھپور کا قیام پریم چند کے لیے کافی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اسی شہر میں رہتے ہوئے ان کے اندر ادبی ذوق و شعور بیدار ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے کئی ضخیم داستانیں اور ناول پڑھ ڈالیں۔ گورکھپور میں درجہ آٹھ تک کی تعلیم مکمل کر کے وہ بنارس آ گئے اور یہاں کوئنس کالج میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی ضلع بستی کے ایک زمیندار گھرانے میں کر دی گئی۔ اس شادی سے پریم چند خوش نہیں تھے۔ اس لیے یہ شادی زیادہ عرصے تک کامیاب نہ رہ سکی۔ ۱۸۹۷ء میں والد منشی عجائب لال علالت میں مبتلا ہونے کے باعث اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ لہٰذا گھر کی تمام ذمہ داریاں پریم چند کے سر آ گئیں۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں ضلع مرزا پور کے ایک قصبہ چنار کے ایک اسکول میں بہ حیثیت اسسٹنٹ ماسٹر کے ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد ۱۹۰۰ء میں بہرائچ میں بطور اسسٹنٹ ٹیچر اپنی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں فرسٹ ایڈشنل ماسٹر کی حیثیت سے پرتاپ گڑھ آ گئے۔ ۱۹۰۲ء میں الہ آباد کے ٹریننگ کالج کے ماڈل اسکول میں بطور صدر مدرس کام کیا۔ ۱۹۰۵ء میں پریم چند نے شیورانی دیوی سے دوسری شادی کی جن کی عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں مہوبہ ضلع ہمیر پور میں سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول مقرر ہوئے۔ ملازمت اختیار کرنے کے کافی عرصے بعد انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی تعلیم انگریزی، تاریخ اور فارسی مضامین کے ساتھ مکمل کی۔

پریم چند ایک خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور ان کے ساتھ خوب ہنستے اور انھیں بھی ہنساتے تھے۔ وہ دوسروں کے جذبات کا بھی خیال رکھتے تھے۔ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔ وہ ایک حقیقت پسند انسان تھے۔ حق و صداقت اور انصاف کا دامن تھام کر چلتے تھے۔ حقائق کی تبلیغ کرنے والا یہ مبلغ ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اس دنیا سے ہمیشہ ہمیش کے لیے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

جواب نمبر۲۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کا پہلا دور ابتدا تا ۱۹۱۷ اور بعض کے نزدیک ۱۹۱۸ کو محیط ہے۔ ان کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ابتدا میں پریم چند نے نواب رائے کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ ''سوز وطن'' میں پریم چند کا قلمی نام نواب رائے چھپا تھا۔ اس میں پانچ افسانے بعنوان ''دنیا کا سب سے انمول رتن، شیخ مخمور، یہی میرا وطن ہے، صلۂ ماتم، عشق دنیا اور حب وطن'' شامل تھے۔ ان میں سب سے پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ہے۔ اسی افسانے سے ان کی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ ''سوز وطن'' کا موضوع انگریزوں کے خلاف آزادی کے جذبے سے معمور تھا۔ اس لیے انگریزی سرکار نے اس مجموعے کو ضبط کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرے نام (پریم چند) سے لکھنا شروع کر دیا۔ یہ نام منشی دیا نرائن نگم مدیر ''زمانہ'' کے مشورہ

پر اختیار کیا اور تادم آخر اسی نام سے لکھتے رہے۔

اس کے بعد پریم پچیسی حصہ اول اور پریم پچیسی حصہ دوم شائع ہوئے۔ پریم پچیسی اول میں کل (۱۲) بارہ افسانے شامل تھے جن کے عنوانات اس طرح تھے: ''مامتا، وکرمادت، بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، راج ہٹ، راجہ ہردول، نمک کا داروغہ، عالم بے عمل، گناہ کا اگن کنڈ، بے غرض محسن، آہ بے کس اور آلھا''۔ پریم پچیسی دوم میں (۱۳) تیرہ افسانے شامل تھے۔ ان کے عنوانات ''خون سفید، صرف ایک آواز، اندھیر، بانکا زمین دار، تریا چرتر، امرت، شکاری راجکمار، کرموں کا پھول، مناون، مرہم، اماوس کی رات، غیرت کی کٹاری اور منزل مقصود'' تھے۔

اس دور میں ہندوستان میں ایک طرف قومی جذبہ لوگوں کے دل میں ابھر رہا تھا تو دوسری طرف اصلاحی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ پریم چند بھی ان سے متاثر ہوئے۔ جس کا اثر ان کے ابتدائی دور کے افسانوں پر پڑا۔ ''سوز وطن'' کے افسانوں پر حب الوطنی اور اصلاحی جذبہ غالب ہے۔

تاریخی اور اصلاحی افسانے بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس عہد کے افسانوں میں وطن سے محبت کے جذبے کو دیگر جذبوں پر مقدم بتایا گیا ہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ایسے افسانے بھی لکھے جن میں اصلاحی نقطۂ نظر واضح طور پر عیاں ہے۔ مثلاً بڑے گھر کی بیٹی، نمک کا داروغہ اور بے غرض محسن اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان افسانوں میں جہاں ایک طرف دیہات کی حقیقی زندگی کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے وہیں دوسری جانب اسے ذریعۂ اصلاح بھی بنایا گیا ہے۔

جواب نمبر۳۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کا تیسرا دور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس دوران ''آخری تحفہ، زادراہ، دودھ کی قیمت اور واردات'' نام سے افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ ''آخری تحفہ'' میں کل تیرہ (۱۳) افسانے شامل تھے۔ اس مجموعے میں افسانہ ''قاتل، شکار، آخری تحفہ، طلوع محبت، وفا کی دیوی، نجات، دوبیل، جیل، برات، ادیب کی عزت، آخری حیلہ، ڈیمانسٹریشن، اور ستی'' کو جگہ دی گئی تھی۔ مجموعہ ''زادراہ'' میں کل پندرہ (۱۵) افسانے تھے۔ اس میں ''زیور کا ڈبہ، آشیاں برباد، خانہ داماد، قہر کا خدا، لعنت، بڑے بھائی صاحب، مس پدما، زادراہ، حقیقت اور ہولی کی چھٹی'' اہم افسانے ہیں۔ مجموعہ ''دودھ کی قیمت'' میں محض نو (۹) افسانے تھے۔ جن میں کسم، اکسیر، دودھ کی قیمت، عیدگاہ، سکون قلب، ریاست کا دیوان، وفا کا دیوتا، دو بہنیں اور زاویۂ نگاہ'' شامل تھے۔ آخری افسانوی مجموعہ ''واردات'' ہے جو ۱۹۳۸ء میں پریم چند کی وفات کے بعد شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس میں تیرہ (۱۳) افسانے ''شکوہ شکایت، معصوم بچہ، بدنصیب ماں، شانتی، روشنی، مالکن، نئی بیوی، گلی ڈنڈا، سوانگ، انصاف کی پولیس، غم نداری بزنجر، مفت کرم داشتن اور قاتل کی ماں'' شامل تھے۔ پریم چند کا ایک شاہکار افسانہ ''کفن'' کے نام سے شائع ہوا جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ آخری دور کی تخلیق ہے۔ یہ ایسی تخلیق ہے کہ پریم چند کی افسانہ نگاری کا نام لیتے ہی ''کفن'' کا نام ذہن میں آجاتا ہے۔

اس دور میں پریم چند کے خیالات میں کافی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اب وہ کسی مسائل کو اصلاحی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے مادی حقائق کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں مثالیت یا آدرش واد کا زور کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام، زمینداری، نجی ملکیت، سیٹھ ساہوکار اور مہاجنوں کو ظلم و استحصال اور سماجی ناانصافیوں کا سبب مانتے ہیں۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک سماجی اور اقتصادی نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کی جائیں گی تب تک یہ ظلم و استحصال کا سلسلہ جاری رہے گا۔ وہ فرقہ پرستانہ تحریکوں کے خلاف تھے۔ زبان و ادب اور تہذیب و تمدن کو کسی مذہب سے جوڑنا بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ زبانیں خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہیں ان کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پریم چند کا افسانہ ''نجات'' جب شائع ہوا تو ہندی رسالہ'' سرسوتی'' کے ایک مضمون میں ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں خاص طور پر پنڈتوں کے خلاف نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں۔اس کے جواب میں پریم چند نے ایک مضمون بعنوان'' زندگی میں نفرت کا مقام'' لکھا جو رسالہ ''ہنس'' میں شائع ہوا، جس میں غریبوں اور مظلوموں کے خون چوسنے والے افراد کے خلاف نفرت کے جذبے کو عام کرنا جائز ٹھہرایا۔انھوں نے ظلم اور ظالم دونوں کے خلاف آواز بلند کرنے اور غریبی کو دور کرنے کے لیے مظلوموں کے ضمیر کو بیدار کرنا ضروری سمجھا۔ ان کے کچھ افسانے ایسے ہیں جن میں انھوں نے حقیقت پسندی کی المناک سچائیوں کو برہنہ کر کے رکھ دیا ہے۔اس ضمن میں'' دودھ کی قیمت اور نجات'' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ان میں جو کردار پیش کیے ہیں ان کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے۔افسانہ ''نجات'' میں 'دکھیا' نام کا کردار جو ہمیشہ پنڈت جی کی خدمت میں لگا رہتا تھا آج انھیں کا کام کرتے کرتے اپنی جان گنوا دیتا ہے۔اس کے مرجانے کے بعد پنڈت جی اس کے پیروں میں رسی باندھ کر اسے دور پھینک دیتے ہیں۔اس کے ساتھ زندہ رہنے پر بھی جانوروں جیسا برتاؤ کرتے ہیں اور اب جب کہ وہ مر چکا ہے تب بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں۔

پریم چند کا نقطۂ نگاہ سماجی اور مذہبی معاملات میں اب عقلی اور حقیقت پسندانہ ہو گیا ہے۔وہ توہمات، فرسودہ روایتوں، ضعیف الاعتقادی، خیالی اور بے سروپا کی باتوں میں یقین نہیں رکھتے۔وہ عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

8.8 فرہنگ

لفظ	:	معنی
مظلوم		ستایا ہوا
سانحہ		حادثہ
مفلس		غریب
خطا		غلطی
مصلح		برائیاں دور کرنے والا
نجات		رہائی، چھٹکارا
مثالی		آئیڈیل، معیاری
تکان خوردہ جسم		تھکا ہوا جسم
وقتاً فوقتاً		کبھی کبھی، حسب موقع
بدحواس		جس کے حواس کام نہ کرتے ہوں
منحصر		گھرا ہوا، وابستہ
توہمات		وہم، شک
رحلت		انتقال
فرسودہ		پرانا

محروم	نامراد، جس سے زندگی کا سہارا چھینا گیا ہو
ضعیف الاعتقادی	اعتقاد کی کمزوری، توہم پرستی
بیدار	ہوشیار جو سویا ہوا یا مدہوش نہ ہو
روایتی	قدیم، رسمی
جدوجہد	کوشش
تصنع	بناوٹ
مرورایام	وقت کا گزرنا، زمانے کا بیت جانا
آرائش	سجاوٹ
ہمدرد	دکھ درد کا ساتھی
آرزو	امید، خواہش
دیدار	دیکھنے کا عمل
منقولہ	نقل کیا ہوا
مقدم	پہلے وارد ہونے والا، افضل
برتر	بہت بلند
انتقام	بدلہ

8.9 کتب برائے مطالعہ

پریم چند فن اور فن کار : پروفیسر جعفر رضا، شبستان، شاہ گنج، الہ آباد، ۱۹۹۹

پریم چند شناسی : پروفیسر آفاق احمد، مدھیہ پردیش اردو اکادیمی، بھوپال، ۱۹۹۴

پریم چند کے نمائندہ افسانے : ڈاکٹر قمر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۰

پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی کے مسائل): خالد حیدر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹

پریم چند کہانی کار ہنما : ڈاکٹر جعفر رضا، لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، ۱۹۶۹ء

پریم چند حیات اور فن : اصغر علی انجینئر، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، دہلی، ۱۹۸۱ء

اکائی: 9 اردوافسانے پر پریم چند کے اثرات

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 اردوافسانے پر پریم چند کے اثرات

9.3.1 سدرشن

9.3.2 اعظم کریوی

9.3.3 علی عباس حسینی

9.3.4 اختر اورینوی

9.4 آپ نے کیا سیکھا

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

9.6 سوالات کے جوابات

9.7 فرہنگ

9.8 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ☆ اردوافسانے پر پریم چند کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔
- ☆ پنڈت بدری ناتھ سدرشن کی افسانہ نگاری سے واقف ہوں گے۔
- ☆ اعظم کریوی کی افسانہ نگاری کے بارے میں جانیں گے۔
- ☆ علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- ☆ اختر اورینوی کے ادبی کارناموں اور ان کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کریں گے۔
- ☆ آخر میں سوالات اور ان کے جوابات کے نمونے بھی ملیں گے۔

9.2 تمہید

اردوادب میں افسانہ نگاری کی باضابطہ ابتدا پریم چند سے ہوتی ہے۔حالاں کہ ان سے پہلے بھی کئی تخلیق کاروں نے افسانے لکھے لیکن ان کے افسانے فن کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکے۔اسی لیے ان افسانوں کی حیثیت محض ابتدائی نقوش کی حد تک ہی سمٹ کر رہ گئی۔لہٰذا پریم چند کو اردو کا باقاعدہ افسانہ نگار تسلیم کیا گیا۔ان کے افسانوں میں غریبوں، مفلسوں، مظلوموں، کسانوں، زمینداروں، محنت کش طبقوں کے ساتھ ہی

دیہی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ پریم چند کی حیثیت ایک مصلح کی تھی۔ وہ سماج میں رائج ان تمام برائیوں اور خرابیوں کو دور کرنا چاہتے تھے جو انسانی سماج اور ملک کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ وہ اپنے ملک کو ایک اچھا اور مثالی نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کے اکثر افسانوں میں اس نظریے کی جھلک ملتی ہے۔ پریم چند کی اتباع ان کے عہد میں اور بعد میں بھی کی گئی۔ کئی افسانہ نگاروں نے ان کی روش اختیار کی۔ اس اکائی میں ہم ان اہم افسانہ نگاروں کا مطالعہ کریں گے جنھوں نے پریم چند کا طرز اپنا اور ان کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس ضمن میں پنڈت سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور اختر اورینوی کا خصوصی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

9.3 اردو افسانے پر پریم چند کے اثرات

جو فن پارہ حقائق سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے، اسے عوام و خواص میں اتنی ہی زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور اسے نظر تحسین سے دیکھا جاتا ہے اور متاخرین بھی اس کی روش اختیار کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ پریم چند ایک حقیقت پسند افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنی اکثر تخلیقات میں زمینی حقائق کو جگہ دی ہے۔ دیہی زندگی کی ایسی سچی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے کہ جیسے قاری افسانہ نہیں پڑھ رہا ہو بلکہ وہ اس دیہی مناظر کے درمیان موجود ہو۔ پریم چند نے دیہی سماج کے طرز معاشرت، سیاسی و سماجی، معاشی و اخلاقی، تہذیبی و ثقافتی اور اس زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ پریم چند کی اس روش کو ان کے معاصر افسانہ نگار اور بعد کے افسانہ نگاروں نے بھی اپنانے کی کوشش کی ہے اور پریم چند نے جس روایت کی بنا ڈالی تھی اس روایت کو بعد میں آنے والے کئی فنکاروں نے آگے بڑھایا۔ انھیں میں سے یہاں چند اہم افسانہ نگاروں کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

9.3.1 پنڈت بدری ناتھ سدرشن

پریم چند کا اثر قبول کرنے والے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام پنڈت بدری ناتھ سدرشن کا ہے۔ سدرشن نومبر ۱۸۹۶ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پنڈت گوردتا مل اور والدہ کا نام یمنا دیوی تھا۔ سدرشن کی بیوی لیلاوتی تھیں۔ ان کے اجداد کشمیری برہمن تھے۔ سدرشن بچپن سے ہی شوخ اور چنچل تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ نہایت ذہین بھی تھے۔ سدرشن نے ابتدائی تعلیم مکتب سے حاصل کی۔ اس کے بعد 'اینگلو ورنا کولر اسکول' سیال کوٹ سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ آگے کی تعلیم کے لیے 'مشن ہائی اسکول' میں داخلہ لیا جہاں سے انھوں نے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ بعد ازاں 'مشن کالج' سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ مطالعے کا بڑا شوق تھا، کثرت سے کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد معاش کی فکر ہوئی، اس سلسلے میں پہلے انھوں تجارت کا پیشہ اختیار کیا مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک چل نہ سکا۔ لہٰذا انھوں نے صحافتی میدان میں قدم رکھا اور دینا ناتھ کے اخبار 'دیش' کی مجلس ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد اخبار 'ہندوستان' سے منسلک ہو گئے۔ پھر مشہور اخبار 'بھارت' کے مدیر کے طور پر تقرری ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں ایک ہفتہ وار اخبار ''چندر'' نکالنا شروع کیا لیکن یہ بھی لمبے عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد نکلنا بند ہو گیا۔ اس کے بعد سدرشن نے ''جاٹ گزٹ'' کی ادارت قبول کر لی۔ ۱۹۲۶ء میں حکیم احمد شجاع کے اخبار ''حق'' کے مدیر کے طور پر کام کیا۔ پھر کچھ وقت کے لیے انھوں نے معاش کے دوسرے ذرائع اپنائے لیکن وہاں بھی وہ مستقل طور پر ٹھہر نہ سکے اور پھر لاہور آ کر ایک ادبی رسالہ ''چندن'' جاری کیا مگر یہ بھی مالی پریشانیوں کے باعث دو برس بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد سدرشن بمبئی آ گئے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے جہاں انھوں نے ڈرامے، مکالمے، کہانیاں اور گیت لکھے۔ بمبئی میں ہی مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور آخر کار ۱۶/دسمبر ۱۹۶۷ء کو بمبئی کے ہرکشن داس اسپتال میں آخری سانس لی۔

سدرشن نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے کیا۔حالاں کہ بعد میں انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی مگر افسانوں دنیا میں انھوں نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ان کا پہلا افسانہ ''پھول'' ۱۹۱۶ء میں ''مخزن'' میں شائع ہوا جو افسانوی مجموعہ ''سدا بہار پھول'' میں شامل ہے۔اس مجموعے میں کل اٹھارہ افسانے شامل تھے۔ان میں ''انتقام، لوہے کا دل، غریب کی آہ اور انصاف کی کرسی'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان افسانوں میں پریم چند کا اصلاحی نقطۂ نظر صاف طور پر ظاہر ہے۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''بہارستان'' ہے جسے انھوں نے ۱۹۲۴ء میں لکھا اور ۱۹۲۵ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔اس میں شامل افسانے ''تیرتھ یاترا، ایک اندھی لڑکی کی سرگزشت، شاعر کی بیوی، گناہِ عظیم، گردشِ زمانہ، محبت کی موت، منزل مقصود، سزائے اعمال، فرعون کی معشوقہ، نشیب و فراز، چشم بصیرت'' وغیرہ ہیں۔ان افسانوں میں بھی پریم چند کا اصلاحی نقطۂ نظر حاوی ہے۔تیسرا مجموعہ ''چشم و چراغ'' اور چوتھا مجموعہ ''طائر خیال'' ہے۔''طائر خیال'' میں شامل افسانے ''عروس شاعری، مصور کی زندگی، صدا سکھ، باپ، دو خدا، جب لاش نے شہادت دی، کایا پلٹ، دوسروں کی طرف دیکھ کر، شعلۂ مضطر، بچپن کا ایک واقعہ'' وغیرہ ہیں۔پانچواں افسانوی مجموعہ ''سولہ سنگار'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں ''شاعر کا انتخاب، سورداس، مزدور، دو داکٹر، ایک تصویر کے دو رخ، دلہن کی ڈائری، نخل محبت، دو دوست، جب دولت آتی ہے، کلجگ نہیں کرجگ ہے، راجپوت کی شکست، ثروت کا نشہ'' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ان میں ''مزدور، ثروت کا نشہ، دلہن کی ڈائری اور دو دوست'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔چھٹا افسانوی مجموعہ ''چندن'' ہے۔اس میں شامل افسانے وزیر عدالت، شاعر، خانہ داری کا سبق، مہر مادری، کنول کی بیٹی، عورت کا دل، فریب دولت، صدائے جگر خراش '' وغیرہ ہیں۔ساتواں مجموعہ ''آزمائش'' ہے۔اس مجموعے میں ''آزمائش، رشوت کا روپیہ، بدلہ، گناہ کی قیمت، جنس صداقت، محبت کا گنہ گار'' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔آٹھواں مجموعہ ''صبح وطن'' کے نام سے افسانوی دنیا میں متعارف ہوا۔اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں۔نواں مجموعہ ''قوسِ قزح'' کے نام سے شائع ہوا، اس میں نو افسانے ہیں۔

سدرشن نے افسانوں کے علاوہ ناول، ناولٹ، ڈرامے اور گیت بھی لکھے ہیں۔ان کا سب سے پہلا ناول ''کنج عافیت'' ہے۔اس کے علاوہ ''قدرت کے کھیل، بے گناہ مجرم، راج سنگھ، خوش انجام، عورت کی محبت، گناہ کی بیٹی، پتھروں کا سوداگر اور پریم پجارن'' قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے جن میں ''گاندھی جی، مزدور، رامائن چھایا، ودیادھرمی، کنواری ودھوا، دھوپ چھاؤں، انجنا، گراموفون، دشمن، اندھے کی دنیا'' وغیرہ ہیں۔شعری مجموعہ ''دل کے تار'' نام سے چھپ کر آیا۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''چٹکیاں'' کے نام سے شائع ہوا۔اس میں بائیس مضامین تھے لیکن بعد کے ایڈیشن میں اضافے کے ساتھ انتیس مضامین شامل ہیں۔

سدرشن پریم چند سے کافی متاثر تھے۔سدرشن نے جب افسانوی دنیا میں قدم رکھا اس وقت کئی افسانہ نگار اور ان کے افسانے موجود تھے لیکن ان کے سامنے پریم چند کے علاوہ ایسا کوئی نمونہ نہیں تھا جس کی وہ تقلید کر سکیں۔لہٰذا انھوں نے پریم چند کی روش کو اپنایا اور اسی ڈگر پر چلنا شروع کر دیا۔کہیں کہیں تو وہ پریم کے نظریات کی بھی اتباع کرتے نظر آتے ہیں۔جس طرح پریم چند ایک قوم پرست انسان تھے اسی طرح سدرشن بھی ایک سچے قوم پرست تھے۔وہ گاندھی جی سے بھی بہت متاثر تھے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں عوامی مسائل کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔غربت و افلاس، عسرت و تنگی اور جبر و استحصال کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جو پریم چند کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ سدرشن نے دیہات اور شہر میں بسنے والے انسانوں کے مسائل کو اپنے افسانوں میں خاص جگہ دی ہے۔سدرشن نے شہر کے متوسط ہندو گھرانوں کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔جبکہ پریم چند کے یہاں دیہی زندگی پر مشتمل افسانوں اور ناولوں کی کثرت ہے۔سدرشن نے بھی دیہی معاشرت پر قلم اٹھایا لیکن وہ پریم چند کی طرح کامیاب نہیں ہو پاتے۔موضوعات کو تو نبھالے جاتے ہیں لیکن جب وہ دیہات کی تصویر کشی

کرنے لگتے ہیں تو ان کا قلم اکتسابی مشاہدے سے زیادہ ان کی مدد نہیں کر پاتا۔ بہ نسبت دیہات کے شہر کے معاشرتی موضوع پر جہاں قلم اٹھایا ہے وہاں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔لیکن پھر بھی ان کا قلم دیہی زندگی پر اٹھتا رہا اور کے اندرونی کرب کو پیش کرتا رہا۔

سدرشن ایک حقیقت پسند افسانہ نگار تھے۔انھوں نے سماج کے حقائق کی سچی تصویر قاری کے سامنے پیش کی ہے۔وہ ایک سچے محبّ وطن تھے۔اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ہر ممکن ہمارا ملک غربت اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو، اور تمام ہندوستان میں چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، سب ایک دوسرے سے مل جل کر رہیں، لوگ ایک دوسرے کے لیے بھائی چارگی اور ہمدردی کا جذبہ رکھیں، اپنے وطن کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کریں۔ان کی کہانیوں میں مذکورہ نقطۂ نظر کو دیکھا جا سکتا ہے۔انھوں نے جذبۂ حب الوطنی سے معمور افسانے بھی لکھے ہیں۔جس میں اپنے وطن پر قربان ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔سدرشن کا زمانہ وہ ہے جب ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے دوچار تھا۔ایسے میں اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ انگریزوں کے خلاف تمام ہندوستانی آپس میں ایک جٹ ہو جائیں اور انھیں حدود ہندوستان سے باہر نکال کر ہی دم لیں۔سدرشن کے اکثر افسانوں میں اصلاحی نقطۂ نظر عیاں ہے۔

پریم چند اور سدرشن کے یہاں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔دونوں کے یہاں ہندوستانی فضا، جذبۂ حب الوطنی، جواں مردی، جذبۂ ایثار، بھائی چارگی اور اصلاحی نقطۂ نظر کی کارفرما ہے۔زبان و اسلوب کی سطح پر دونوں ایک دوسرے سے قریب نظر آتے ہیں۔ہندوستانی معاشرت کی منظر کشی بڑے دلکش و پر اثر انداز میں کرتے ہیں۔مختصراً یہ کہ فنی اور فکری دونوں اعتبار سے سدرشن پریم چند کی اتباع کرتے نظر آتے ہیں۔

9.3.2 اعظم کریوی

پریم چند کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ایک نام اعظم کریوی کا ہے۔اعظم کریوی صوبہ اتر پردیش کے ضلع الہ آباد میں ۱۸۹۸ کو پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۱۹۵۵ میں ہوا۔انھوں نے افسانوں ادب میں گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔اعظم کریوی کا افسانوی مجموعہ ''پریم کی چوڑیاں'' نام سے ۱۹۴۲ میں شائع ہوا۔جن میں ''پریم کی چوڑیاں، نرملا، محبت کی ٹھوکر، ہولی، کھویا ہوا پیار، سیندور والا، دل کی دنیا، بیگار، شانتی، بگلا بھگت، دل ہی تو ہے اور پریم کی لیلا'' افسانے شامل ہیں۔۱۹۴۲ میں ایک اور افسانوی مجموعہ ''شیخ و برہمن اور دوسرے افسانے'' کے نام سے آیا۔اس میں سولہ افسانے شامل کیے گئے ہیں۔جن میں بالترتیب ''شیخ و برہمن، مایا، روپ کا نشہ، گھر کی بلا، یتیم، رانی، خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا، گناہ کی گٹھری، خودداری، پریم کی پیاسی، قربانی، پوجا، شریف ڈاکو، اچھوت، بھکاری کا پریم اور گھر'' افسانے ہیں۔ایک مجموعہ ''کنول و دیگر افسانے'' کے عنوان سے جنوری ۱۹۴۴ میں عبدالحق اکیڈیمی حیدر آباد سے اشاعت پذیر ہو کر منصۂ شہود پر آیا جس میں بارہ افسانے ہیں۔جن کی ترتیب اس طرح ہے ''کنول، فریبی، سہیلی، دل کی کمزوری، پنچایت، آزادی، خودداری، بھکارن، پریتم، محبت کی یادگار، روپ رانی اور پاروتی''۔۱۹۴۴ میں ہی ایک اور مجموعہ ''انقلاب اور دوسرے افسانے'' کے نام سے شائع ہوا۔اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں جن میں ''انقلاب، شرابی، نندی، خان بہادر، سچی خوشی، آگے جاؤ، چھٹکارہ، پردیسی، دن کی روشنی میں، ساکھ، لکشمی اور منزل'' ہیں۔۱۹۴۵ میں ''روپ سنگار'' کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں چودہ افسانے ''پریم کی انگوٹھی، ملاح کی لڑکی، پی کہاں، بڑے بول کا سر نیچا، تارا، چندر کلا، اقرارِ جرم، پریتما، مصور، بڑا آدمی، مُرلا، ۲۰۰۰ء کا ہندوستان، شہر کا جادو اور روپ سنگار'' شامل ہیں۔اعظم کریوی ایک شاعر بھی تھے۔انھوں نے بہت سے گیت لکھے، ان کے گیتوں کا ایک مجموعہ ''دیہاتی گیت'' کے نام سے اپریل ۱۹۳۹ء میں ادبی دنیا میں متعارف ہوا۔

اس کے علاوہ ایک کتاب ''ہندی شاعری'' کے عنوان سے ہندوستانی اکیڈمی سے ۱۹۳۱ میں شائع ہوئی۔

اعظم کریوی نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس روایت کی پاس داری کی ہے جس کی بنا پریم چند نے ڈالی تھی۔ اس ضمن میں پریم چند اور اعظم کریوی میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ جس طرح پریم چند نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کے دیہات اور گاؤں کی عکاسی کی ہے اسی نوعیت کے کئی افسانے اعظم کریوی کے یہاں بھی موجود ہیں۔ اعظم کریوی نے ہندوستانی گاؤں کی پاک اور بھینی خوشبو والی زندگی، غریبوں کے بے لوث خلوص ومحبت اور ان کی سادہ لوحی کی ایک سچی تصویر اپنے افسانوں میں پیش کی ہے۔ اعظم کریوی کی افسانہ نگاری کے بارے میں بدرالسلام فروغی لکھتے ہیں:

> ''وہ ہندوستانی دیہات اور وہاں کے رہنے والوں کی تصویریں پیش کرتے ہیں لیکن یہ تصویریں صرف فوٹو گرافی ہی بن کر نہیں رہ جاتیں بلکہ ان کی فن کاری ان میں مصوری کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے پلاٹ صاف اور سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا سا تلاطم نہیں ہوتا جو طبیعتوں میں صرف چند لمحوں کے لیے ایک ہیجان پیدا کر دے۔ بلکہ میدان میں بہتی ہوئی ندی کا سا ہلکا ہلکا اتار چڑھاؤ ہے جو ترنم سے ہم آغوش ہو۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسی زندگی کے عکاس ہیں جس میں سادگی اور معصومیت ہے۔ ان کے افسانوں میں جوش اور تلخی نہیں۔ پھر بھی ایک ہلکا سا احتجاج ہے، ایک دبی ہوئی چیخ، ایک گھٹی ہوئی سی پکار۔ ان کے افسانوں کی جان ان کی زبان ہے۔

''تقریب وتعارف''، بدرالسلام فروغی، مشمولہ: ''روپ سنگار ودیگر افسانے''، اعظم کریوی، کتب خانہ دارالبلاغ، لاہور، ۱۹۴۵، ص: ۴

اعظم کریوی ایک حقیقت پسند افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں حقائق کی ترجمانی کی ہے۔ یوں تو ان کا تخیل انھیں رفعتوں کی طرف پرواز کرنے کی دعوت دیتا ہے مگر زندگی کی حقیقی جراحتیں ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی ہیں اور وہ زندگی کے زمینی پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس تعلق سے ان کے افسانہ ''پریم کی چوڑیاں'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''پریما انیسویں سال میں تھی اس کی جوانی کا چاند بڑی آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ حسن ورعنائی کی تمام خوبیاں قدرت نے فیاضی سے پریما کو عطا کی تھی۔ اس کے انداز میں بھولا پن آواز میں نغمہ کی دل فریبی آنکھوں میں حیا اور خیالات میں پاکیزگی تھی لیکن ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ غریب کی جوانی جاڑوں کی چاندنی تھی، کوئی قدر دان نہ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی۔ دان ''دہیز'' دینے کے لیے درگا کے پاس کچھ نہ تھا جوان جہان لڑکی کو دیکھ دیکھ کر اس کے گلے میں پانی نہ اترتا تھا۔ دو چار جگہ اس نے نسبت کا پیام بھی دیا لیکن کوئی دو سو سے کم دان لینے پر راضی نہ ہوا۔ دو سو روپیہ تو بہت ہوتے ہیں۔ گھر میں اتنے کھپریل بھی نہ رہے ہوں گے۔ درگا گاؤں میں جس طرف نکلتی لوگ اس کو سنا سنا کر کہتے جوان لڑکی گھر میں بٹھا رکھی ہے، بیاہ نہیں کرتی نہ جانے کیا ارادہ ہے۔ درگا لوگوں کے طعنے سن کر شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتی، اس لیے گاؤں میں اپلے بیچنا بند کر دیے۔ ایک

دوسرے گاؤں میں اپلے بیچنے جانے لگی، وہاں بھی کچھ دنوں بعد لوگوں نے درگا کو دق کرنا شروع کر دیا۔ بیچاری کی جان بڑی مصیبت میں تھی، کبھی سوچتی گنگا جی میں ڈوب کر اپنی جان دے دے لیکن جب پریما کا خیال آتا تو اپنے ارادہ سے باز آجاتی۔''

''پریم کی چوڑیاں اور دوسرے افسانے''اعظم کریوی، عزیزی پریس، آگرہ، ۱۹۴۲ء، ص: ۲۰۔۲۱

اعظم کریوی کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہندو تہذیب و معاشرت کو اپنے افسانوں میں بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے جو ان کے لیے ایک چیلنج کے مانند تھا مگر انھوں نے اس موضوع کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ پریم چند کی طرح اعظم کریوی کے یہاں بھی اصلاحی اور اخلاقی پہلو کی کارفرمائی ہے۔ غرض کہ اعظم کریوی نے دیہات نگاری میں پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی و اصلاحی نقطۂ نظر حاوی ہے۔ وہ سماج میں پھیلی ان تمام برائیوں اور خرابیوں کو موضوع بناتے ہیں جو ایک عام انسان کے لیے ہلاکت کا باعث ہیں، مثلاً ''جہیز'' جیسی لعنت۔ اسی طرح کے اور بھی موضوعات پر انھوں نے قلم فرسائی کی ہے۔

9.3.3 علی عباس حسینی

علی عباس حسینی کا نام بھی پریم چند کے مقلدین میں شمار ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۹۷ء میں ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید محمد صالح اور دادا کا نام مولانا سید حسین اصغر تھا۔ پڑھا لکھا گھرانا تھا۔ لہٰذا حسینی کی ذہن سازی میں اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد مشن ہائی اسکول سے میٹرک اور انٹر کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی تعلیم مکمل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ پھر درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے اور آخر تک اسی پیشے سے منسلک رہے۔ لکھنؤ میں ۱۹۶۹ کو انتقال کیا۔

علی عباس حسینی بچپن سے ہی نہایت ذہین اور ہوشیار تھے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ دس بارہ برس کی عمر میں انھوں نے بہت سی ضخیم کتابوں کا مطالعہ کر لیا تھا مثلاً طلسم ہوش ربا، الف لیلیٰ کے قصے، فردوسی کا شاہنامہ، اس کے علاوہ اردو کی دوسری بہت سی کہانیاں۔ جب کچھ بڑے ہوئے تو انگریزی فکشن کا بھی مطالعہ کیا ان سب کا ان کی تخلیقی صلاحیت پر گہرا اثر اپڑا۔ علی عباس حسینی نے اردو ادب خصوصاً فکشن کے میدان میں گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے تقریباً دو سو افسانے لکھے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے۔ بعد میں یہی افسانے مجموعوں کی شکل میں بھی منظر عام پر آئے۔ ان میں ''رفیق تنہائی، باسی پھول، میلہ گھومنی، ندیا کنارے، آئی۔ سی۔ ایس، ایک حمام میں، ہمارا گاؤں، کچھ نہیں ہے، پھولوں کی جھڑی (ہندی)، گائے امان (ہندی)، سیلاب کی راتیں'' قابل ذکر ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''ہمارا گاؤں'' میں شامل افسانے ''ہمارا گاؤں، گاؤں کی لاج، لاٹھی پوجا، چناؤ، بے وقوف، نورونار، دوددا، حاجی بابا، پوتر سیندور اور جل پری'' ہیں۔ ''آئی۔ سی۔ ایس میں شامل افسانے ''آئی۔ سی۔ ایس، شیخو چچا، جھوٹ، دو شریفوں کا مقابلہ، ملک خدا تنگ نیست، بیلوں کی جوڑی، قانون باطن، بختیار ک کا نسخہ، ملاپ، شیخ کریم کی نفرت، سماج کی بھینٹ، شریف مزدور، دل کی آگ اور پیا کی جوگن'' ہیں۔ ''باسی پھول'' میں جن افسانوں کو جگہ ملی ہے وہ اس طرح ہیں: ''باسی پھول، گونگا ہری، بیوی، نئی ہمسائی، عدیا تنبولن، کیے کا بھوک، عدالت، آم کا پھل، امتحانِ قدرت، شکار یا شکاری، خوش قسمت لڑکا، حقِ نمک، کیا کیا جائے۔ ''میلہ گھومنی'' علی عباس حسینی کی کافی مشہور تصنیف ہے۔ اس میں کل اکیس افسانے ہیں جن میں ''مصنف، وکیل اور منشی، جھبو کا ہیرو، طمانچہ، کنجی، ولی عہد بہادر، بدلہ، پہرے دار، کھیت، بٹی،

بھکاری، حسن رہگزر، پیاسا، عملِ خیر، خالی گود، میلہ گھومنی، کفن، کلی، بجھنم، بیگار اور میخانہ'' شامل ہیں۔ان کے علاوہ کئی دیگر افسانے جنھیں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ''میاؤں میاؤں، ہنستی چنگاری، خالی گود، جن کا سایہ، پژمردہ کلیاں، دیہاتی، ہار جیت، انتقام، انسپکٹر کی عید، اچھوت برہمن، باغی بیوی، بجھتی شمع، دیش اور دھرم، روزہ، کوڑا گھر، ویران آبادیاں، چمارٹولی، اور ہنستے ہی گھر بستے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علی عباس حسینی نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔''سرسید احمد پاشا یا قاف کی پری'' شاید کہ بہار آئے اور حکیم بانا یا ذنبٹیوں کا بادشاہ'' کے نام سے ان کے ناول منظر عام پر آئے۔دو ڈرامے ''نورتنی اور امیر خسرو'' لکھے۔اس کے علاوہ فکشن تنقید میں ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جو ''ناول کی تنقید اور تاریخ'' کے نام مشہور و معروف ہے۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''عروس ادب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

پریم چند اسکول سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں سدرشن اور اعظم کریوی کے بعد علی عباس حسینی کا نام آتا ہے۔حقیقت پسندی پریم چند کے افسانوں کا خاص وصف ہے۔علی عباس حسینی کے یہاں بھی یہ وصف اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔وہ اپنے افسانوں میں زمینی حقائق کو موضوع بناتے ہیں۔اس تعلق سے ''سماجی کی بھینٹ، شریف مزدور، چمارٹولی، ہمارا گاؤں اور گاؤں کی لاج'' وغیرہ افسانوں کے نام محض مثال کے طور پر پیش کر دیے ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سے افسانوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں دیہات نگاری کی فضا موثر انداز میں ملتی ہے۔ان کی کہانیوں کے پلاٹ نہایت دلکش اور فطری ہیں۔ چوں کہ حسینی کی پیدائش ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔اس لیے انھوں دیہی زندگی کو قریب سے دیکھا، سمجھا اور جیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں دیہی زندگی کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ فطری اور دلکش ہیں۔انھوں نے دیہی زندگی کے مختلف مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے نچلے طبقے کی زندگی اور اس زندگی میں رونما ہونے والے مختلف مسائل کی بطور احسن ترجمانی کی ہے۔اس سلسلے میں نند کشور وکرم لکھتے ہیں:

> ''بلاشبہ حسینی نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا اور انھوں نے مشرقی اتر پردیش کی دیہی زندگی کو اپنی کہانیوں میں بڑے دلکش پیرائے میں پیش کیا۔ انھوں نے بھی پریم چند کی طرح کسانوں کی معاشی بدحالی، مفلسی اور ناگفتہ بہ حالت اور زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم اور ان کی چیرہ دستیوں پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔اور گاؤں کے محنت کش مگر مفلس اور نادار مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے حق میں اپنی آواز بلند کی ہے۔ وہ چھوت چھات اور ذات پات کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے اپنے افسانوں میں ان کے خلاف آواز بلند کی ہے اور اپنی کہانیوں میں اپنے اس نظریے کی بڑے دلکش انداز میں ترجمانی کی ہے۔ وہ اونچ نیچ اور ذات پات کو انسانیت کے دامن پر ایک بدنما دھبہ سمجھتے تھے۔''

علی عباس حسینی کی کہانیاں (کلیات حصہ دوم) مرتب: نند کشور وکرم، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی، ۲۰۱۶، ص:۱۲

حسینی نچلے طبقے کی خواتین کے مسائل کو پیش کرنے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔انھوں نے پریم چند کی طرح دیہات میں زندگی بسر کرنے والی عورتوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ پریم چند اسکول کا ایک مقصد سماجی اصلاح ہے۔علی عباس حسینی کے افسانوں میں یہ نظریہ بھی پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔کوئی تخلیق جہاں ایک طرف تفنن طبع اور ذوق جمال کو تسکین پہنچانے کا کام کرتی ہے وہیں دوسری جانب وہ پیغامبری کا بھی کام کرتی ہے۔اس سے سماج اور معاشرے میں پھیلی بہت سی خرابیوں کو دور کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔علی عباس حسینی نے بھی اپ نے

افسانوں کے ذریعہ اس نوع کے کام لیے ہیں۔ان کے افسانوں کا مرکزی موضوع انسان ہے۔وہ اپنی تخلیقات میں انسان کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔وہ انسانیت پرست اور اصلاح پسند فن کار تھے۔ان کے افسانوں کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے، جس میں ایک طرح کا فطری بہاؤ ہے۔تصنع، تکلف اور بناوٹی پن سے ان کی تخلیق بہت حد تک پاک ہے۔حسن، انسان اور حسن بیان مل کر ان کے یہاں ایک ہو جاتے ہیں جو ان کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی ہے۔

9.3.4 اختر اورینوی

اختر اورینوی کا نام بھی پریم چند کے پیروکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔سید اختر احمد اختر اورینوی ۱۹/اگست ۱۹۱۰ء کو گیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید وزارت حسین اور والدہ کا نام بی بی شمسہ تھا۔اختر اورینوی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔اس کے بعد مونگیر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔۱۹۲۸ء میں سائنس کالج پٹنہ سے سکنڈ ڈویژن میں آئی۔ایس۔سی کا امتحان پاس کیا۔پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کی تعلیم مکمل کی۔۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج میں بحیثیت لکچرران کی بحالی ہوئی۔اس طرح اختر اورینوی شعبۂ درس وتدریس سے منسلک ہو گئے۔دوران تدریس انھوں نے اپنی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا بھی بھرپور استعمال کیا۔جس کے نتیجے میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔انھوں نے شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، تنقید اور تحقیق کے میدان میں قلم آزمائی کی ہے۔اختر اورینوی ایک اچھے شاعر تھے۔ان کی تخلیقات وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔بعد میں یہی شعری مجموعوں ''انجمن آرزو'' اور ''یک چمن گل'' کی شکل میں منظر عام پر آئے۔انھوں نے دو ناول ''حسرت تعمیر'' اور ''کارواں (نامکمل)'' لکھے۔دو ڈرامے ''شہنشاہِ حبشہ'' اور ''زوال کینٹن'' بھی لکھے۔ان کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا'' لکھا جس پر انھیں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔اس کے علاوہ کئی تحقیقی مضامین بھی لکھے جو ان کی تحقیقی کاوشوں کا پتہ دیتے ہیں۔انھوں نے تنقیدی کارنامے بھی انجام دیے جو ''قدر ونظر، مطالعۂ اقبال، مطالعۂ نظیر، تحقیق وتنقید، کسوٹی سراج ومنہاج، مطالعہ ومحاسبہ اور گزارش'' کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔افسانوی ادب میں بھی گراں قدر کارنامہ انجام دیا۔ان کے کئی افسانوی مجموعے یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے۔ان کے کل چھ مجموعے ہیں جن میں ''منظر و پس منظر ۱۹۴۰، کلیاں اور کانٹے ۱۹۴۱، انار کلی اور بھول بھلیاں ۱۹۴۴، سیمنٹ اور ڈائنامائٹ ۱۹۴۷، کیچلیاں اور بالِ جبریل ۱۹۵۹، سپنوں کے دیس میں ۱۹۶۹'' ہیں۔اختر اورینوی کے افسانوں میں ''سیکھ جھور، مکان کی تلاش، اکتاہٹ، ممتا، گرجا کے سائے میں جنت سے دور، انھیں مردے نہ کہو، کل آج کل، راج محل میں، ایک معمولی سی لڑکی، کیچلیاں اور بال جبریل، ٹائپسٹ، آخری اکنی، بوڑھی ماما، کام، بے بس، پاگل، جینے کا سہارا، تسکین حسرت، اندھی نگری، دو مائیں، جونیئر، تاخیر، بیل گاڑی، سینے ٹوریم کا فقیر، مریض، یہ دنیا، پس منظر، اب؟، گندے انڈے، کواڑ کی اوٹ سے، محشر، درخت کا قتل، شکور دادا، شادی کے تحفے، بدگمانی، فٹ پاتھ، زود پشیمانی، نیا شوالہ، وہ واقعہ، کوئلے والا، بہت بے آبرو ہو کر، پناہ گزیں، کلیاں اور کانٹے'' قابل ذکر ہیں۔

اختر اورینوی نے تقریباً ۱۹۲۷ کے آس پاس افسانے لکھنے شروع کیے۔ان کے یہاں حقیقت اور رومان کا ایک اچھا امتزاج ملتا ہے۔ پریم چند کی طرح انھوں نے بھی مزدوروں اور کسانوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں دیہی مسائل کو خصوصیت کے ساتھ جگہ دی ہے۔کسان اور زمیندار کے تعلقات کو بھی بیان کیا ہے۔وہ استحصال زدہ افراد کی روداد اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کا پورا وجود نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔اسی طرح جب وہ کسی ماحول یا فضا کا منظر کھینچتے ہیں تو وہاں بھی اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔اختر اورینوی کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں انسان کو اہمیت دی ہے یعنی ان کے افسانوں کا مرکز انسان

ہے۔ڈاکٹر عبدالمغنی اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''بحیثیت افسانہ نگار اور ینوی واقعات وحالات سے زیادہ اہمیت اشخاص وکردار کو دیتے ہیں۔ وہ بالعموم اپنے مطالعے کے لیے کسی اشرف المخلوقات کو چن لیتے ہیں۔اس کے بعد حسب موقع اس کے اردگرد ایک ماحول پیدا کر کے اس کے کوائف اور امکانات کا جائزہ لیتے اور تجزیہ کرتے ہیں۔''

اختر اور ینوی نے دیہات کے پس منظر میں تو افسانے لکھے ہی ہیں ساتھ ہی شہری تناظر میں کئی افسانے لکھے ہیں۔ان کے یہاں مزدور کی حیثیت ایک مزدور کی طرح ہی ہے،خواہ وہ شہر کا ہو یا دیہات کا۔ بہت سے افراد معاش کی جستجو میں شہروں کا رخ کرتے ہیں۔شہر میں پہنچ کر ان کے مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے۔مثلاً رہائش،طعام،کام،اجنبیت وغیرہ۔غرض یہ کہ غریب اور مزدور طبقے کے لیے شہری زندگی اور بھی دردناک ہو جاتی ہے۔مگر چوں کہ شہری زندگی میں روزگار کے مواقع ہوتے ہیں اس لیے انسان ان تکلیفوں کو بھی برداشت کرتا رہتا ہے جسے اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔اختر اور ینوی نے ان شہری مزدوروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ان کے افسانے محض ایک کہانی یا قصہ نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک طرح کا درد ہے،ایک طرح کا پیغام ہے اور ایک احساس ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔فنی اعتبار سے ان کے ابتدائی دور کے افسانے بہ نسبت بعد کے افسانوں سے کچھ کمزور ہیں لیکن جیسے جیسے ان کا مطالعہ ومشاہدہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ویسے ویسے ان کے فن میں پختگی اور فکر میں گہرائی آتی گئی۔اس فنی پختگی اور فکری گہرائی کے سبب اختر اور ینوی کو اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

9.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

اردو افسانے پر پریم چند کے اثرات کا مطالعہ کیا۔

سدرشن کے ادبی کارناموں اور ان کی افسانہ نگاری سے واقفیت حاصل کی۔

اعظم کریوی کے ادبی کارناموں اور کی افسانہ نگاری سے واقف ہوئے۔

علی عباس حسینی کی ادبی خدمات اور ان کی افسانہ نگاری کا مفصل جائزہ لیا۔

اختر اور ینوی کی ادبی خدمات اور ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں معلومات حاصل کی۔

9.7 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ پنڈت بدری ناتھ سدرشن کی ادبی خدمات اور ان کی افسانہ نگاری پر ایک نوٹ لکھیے؟

سوال:2۔ اعظم کریوی کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالیے؟

سوال:3۔ علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیجیے؟

سوال:4۔ اختر اور ینوی کی افسانہ نگاری پر ایک مضمون قلم بند کیجیے؟

9.8 سوالات کے جوابات

جواب:1. سدرشن نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے کیا۔حالاں کہ بعد میں انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی مگر افسانوں دنیا میں انھوں نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ان کا پہلا افسانہ ''پھول'' ۱۹۱۶ء میں ''مخزن'' میں شائع ہوا جو افسانوی مجموعہ ''سدا بہار پھول'' میں شامل ہے۔اس مجموعے میں کل اٹھارہ افسانے شامل تھے۔ان میں ''انتقام، لوہے کا دل، غریب کی آہ اور انصاف کی کرسی'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان افسانوں میں پریم چند کا اصلاحی نقطۂ نظر صاف طور پر ظاہر ہے۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''بہارستان'' ہے جسے انھوں نے ۱۹۲۴ء میں لکھا اور ۱۹۲۵ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔اس میں شامل افسانے ''تیرتھ یاترا، ایک اندھی لڑکی کی سرگزشت، شاعر کی بیوی، گناہِ عظیم، گردشِ زمانہ، محبت کی موت، منزل مقصود، سزائے اعمال، فرعون کی معشوقہ، نشیب و فراز، چشم بصیرت'' وغیرہ ہیں۔ان افسانوں میں بھی پریم چند کا اصلاحی نقطۂ نظر حاوی ہے۔تیسرا مجموعہ ''چشم و چراغ'' اور چوتھا مجموعہ ''طائر خیال'' ہے۔''طائر خیال'' میں شامل افسانے ''عروس شاعری، مصور کی زندگی، صدا سکھ، باپ، دو خدا، جب لاش نے شہادت دی، کایا پلٹ، دوسروں کی طرف دیکھ کر، شعلۂ مضطر، بچپن کا ایک واقعہ'' وغیرہ ہیں۔پانچواں افسانوی مجموعہ ''سولہ سنگار'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں ''شاعر کا انتخاب، سورداس، مزدور، دو داکٹر، ایک تصویر کے دو رخ، دلہن کی ڈائری، نخل محبت، دو دوست، جب دولت آتی ہے، کلجگ نہیں کر جگ ہے، راجپوت کی شکست، ثروت کا نشہ'' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ان میں ''مزدور، ثروت کا نشہ، دلہن کی ڈائری اور دو دوست'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔چھٹا افسانوی مجموعہ ''چندن'' ہے۔اس میں شامل افسانے وزیر عدالت، شاعر، خانہ داری کا سبق، مہر مادری، کنول کی بیٹی، عورت کا دل، فریب دولت، صدائے جگر خراش'' وغیرہ ہیں۔ساتواں مجموعہ ''آزمائش'' ہے۔اس مجموعے میں ''آزمائش، رشوت کا روپیہ، بدلہ، گناہ کی قیمت، جنس صداقت، محبت کا گنہ گار'' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔آٹھواں مجموعہ ''صبح وطن'' کے نام سے افسانوی دنیا میں متعارف ہوا۔اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں۔نواں مجموعہ ''قوسِ قزح'' کے نام سے شائع ہوا، اس میں نو افسانے ہیں۔

سدرشن نے افسانوں کے علاوہ ناول، ناولٹ، ڈرامے اور گیت بھی لکھے ہیں۔ان کا سب سے پہلا ناول ''کنج عافیت'' ہے۔اس کے علاوہ ''قدرت کے کھیل، بے گناہ مجرم، راج سنگھ، خوش انجام، عورت کی محبت، گناہ کی بیٹی، پتھروں کا سوداگر اور پریم پجارن'' قابل ذکر ہیں۔انھوں نے ڈرامے بھی لکھے جن میں ''گاندھی جی، مزدور، رامائن چھایا، ودیادھرمی، کنواری ودھوا، دھوپ چھاؤں، انجنا، گراموفون، دشمن، اندھے کی دنیا'' وغیرہ ہیں۔شعری مجموعہ ''دل کے تار'' نام سے چھپ کر آیا۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''چٹکیاں'' کے نام سے شائع ہوا۔اس میں بائیس مضامین تھے لیکن بعد کے ایڈیشن میں اضافے کے ساتھ انتیس مضامین شامل ہیں۔

سدرشن پریم چند سے کافی متاثر تھے۔سدرشن نے جب افسانوی دنیا میں قدم رکھا اس وقت کئی افسانہ نگار اور ان کے افسانے موجود تھے لیکن ان کے سامنے پریم چند کے علاوہ ایسا کوئی نمونہ نہیں تھا جس کی وہ تقلید کر سکیں۔لہٰذا انھوں نے پریم چند کی روش کو اپنایا اور اسی ڈگر پر چلنا شروع کر دیا۔کہیں کہیں تو وہ پریم کے نظریات کی بھی اتباع کرتے نظر آتے ہیں۔جس طرح پریم چند ایک قوم پرست انسان تھے اسی طرح سدرشن بھی ایک سچے قوم پرست تھے۔وہ گاندھی جی سے بھی بہت متاثر تھے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں عوامی مسائل کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔غربت و افلاس، عسرت و تنگی اور جبر و استحصال کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جو پریم چند کے افسانوں کا خاصہ ہے۔سدرشن نے دیہات اور شہر میں بسنے والے انسانوں کے مسائل کو اپنے افسانوں میں خاص جگہ دی ہے۔سدرشن نے شہر کے متوسط ہندو گھرانوں کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔جبکہ پریم چند کے یہاں دیہی زندگی پر مشتمل افسانوں اور ناولوں کی کثرت ہے۔سدرشن نے بھی دیہی معاشرت پر قلم اٹھایا لیکن وہ پریم چند کی طرح کامیاب نہیں ہو پاتے۔موضوعات کو تو نبھالے جاتے ہیں لیکن جب وہ دیہات کی تصویر کشی

کرنے لگتے ہیں تو ان کا قلم اکتسابی مشاہدے سے زیادہ ان کی مدد نہیں کر پاتا۔ بہ نسبت دیہات کے شہر کے معاشرتی موضوع پر جہاں قلم اٹھایا ہے وہاں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔لیکن پھر بھی ان کا قلم دیہی زندگی پر اٹھتا رہا اور کے اندرونی کرب کو پیش کرتا رہا۔

سدرشن ایک حقیقت پسند افسانہ نگار تھے۔انھوں نے سماج کے حقائق کی سچی تصویر قاری کے سامنے پیش کی ہے۔وہ ایک سچے محبّ وطن تھے۔اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ہر ممکن ہمارا ملک غربت اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو، اور تمام ہندوستان میں چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، سب ایک دوسرے سے مل جل کر رہیں، لوگ ایک دوسرے کے لیے بھائی چارگی اور ہمدردی کا جذبہ رکھیں، اپنے وطن کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کریں۔ان کی کہانیوں میں مذکورہ نقطۂ نظر کو دیکھا جا سکتا ہے۔انھوں نے جذبۂ حب الوطنی سے معمور افسانے بھی لکھے ہیں۔جس میں اپنے وطن پر قربان ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔سدرشن کا زمانہ وہ ہے جب ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے دوچار تھا۔ایسے میں اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ انگریزوں کے خلاف تمام ہندوستانی آپس میں ایک جٹ ہو جائیں اور انھیں حدود ہندوستان سے باہر نکال کر ہی دم لیں۔سدرشن کے اکثر افسانوں میں اصلاحی نقطۂ نظر عیاں ہے۔

پریم چند اور سدرشن کے یہاں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔دونوں کے یہاں ہندوستانی فضا، جذبۂ حب الوطنی، جواں مردی، جذبۂ ایثار، بھائی چارگی اور اصلاحی نقطۂ نظر کی کارفرما ہے۔زبان و اسلوب کی سطح پر دونوں ایک دوسرے سے قریب نظر آتے ہیں۔ہندوستانی معاشرت کی منظر کشی بڑے دلکش و پر اثر انداز میں کرتے ہیں۔مختصراً یہ کہ فنی اور فکری دونوں اعتبار سے سدرشن پریم چند کی اتباع کرتے نظر آتے ہیں۔

جواب:2. پریم چند کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ایک نام اعظم کریوی کا ہے۔انھوں نے افسانوں ادب میں گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔اعظم کریوی کا افسانوی مجموعہ ''پریم کی چوڑیاں'' نام سے ۱۹۴۲ میں شائع ہوا۔جن میں ''پریم کی چوڑیاں، نرملا، محبت کی ٹھوکر، ہولی، کھویا ہوا پیار، سیندور والا، دل کی دنیا، بیگار، شانتی، بگلا بھگت، دل ہی تو ہے اور پریم کی لیلا'' افسانے شامل ہیں۔۱۹۴۲ میں ایک اور افسانوی مجموعہ ''شیخ و برہمن اور دوسرے افسانے'' کے نام سے آیا۔اس میں سولہ افسانے شامل کیے گئے ہیں۔جن میں بالترتیب ''شیخ و برہمن، مایا، روپ کا نشہ، گھر کی بلا، یتیم، رانی، خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا، گناہ کی گٹھری، خودداری، پریم کی پیاسی، قربانی، پوجا، شریف ڈاکو، اچھوت، بھکاری کا پریم اور گھر'' افسانے ہیں۔ایک مجموعہ ''کنول و دیگر افسانے'' کے عنوان سے جنوری ۱۹۴۴ میں عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد سے اشاعت پذیر ہو کر منصۂ شہود پر آیا جس میں بارہ افسانے ہیں۔جن کی ترتیب اس طرح ہے ''کنول، فریبی، سہیلی، دل کی کمزوری، پنچایت، آزادی، خود داری، بھکارن، پریتم، محبت کی یادگار، روپ رانی اور پاروتی''۔۱۹۴۴ میں ہی ایک اور مجموعہ ''انقلاب اور دوسرے افسانے'' کے نام سے شائع ہوا۔اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں جن میں ''انقلاب، شرابی، نندی، خان بہادر، سچی خوشی، آگے جاؤ، چھٹکارہ، پردیسی، دن کی روشنی میں، ساکھ، لکشمی اور منزل'' ہیں۔۱۹۴۵ میں ''روپ سنگار'' کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں چودہ افسانے ''پریم کی انگوٹھی، ملاح کی لڑکی، پی کہاں، بڑے بول کا سر نیچا، تارا، چندر کلا، اقرارِ جرم، پریتما، مصور، بڑا آدمی، مُرلا، ۲۰۰۰ء کا ہندوستان، شہر کا جادو اور روپ سنگار'' شامل ہیں۔اعظم کریوی ایک شاعر بھی تھے۔انھوں نے بہت سے گیت لکھے، ان کے گیتوں کا ایک مجموعہ ''دیہاتی گیت'' کے نام سے اپریل ۱۹۳۹ء میں ادبی دنیا میں متعارف ہوا۔اس کے علاوہ ایک کتاب ''ہندی شاعری'' کے عنوان سے ہندوستانی اکیڈمی سے ۱۹۳۱ میں شائع ہوئی۔

اعظم کریوی نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس روایت کی پاس داری کی ہے جس کی بنا پریم چند نے ڈالی تھی۔اس ضمن میں پریم چند اور

اعظم کریوی میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔جس طرح پریم چند نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کے دیہات اور گاؤں کی عکاسی کی ہے اسی نوعیت کے کئی افسانے اعظم کریوی کے یہاں بھی موجود ہیں۔اعظم کریوی نے ہندوستانی گاؤں کی پاک اور بھینی خوشبو والی زندگی،غریبوں کے بے لوث خلوص ومحبت اوران کی سادہ لوحی کی ایک سچی تصویر اپنے افسانوں میں پیش کی ہے۔اعظم کریوی ایک حقیقت پسند افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں حقائق کی ترجمانی کی ہے۔یوں تو ان کا تخیل انھیں رفعتوں کی طرف پرواز کرنے کی دعوت دیتا ہے مگر زندگی کی حقیقی جراحتیں ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی ہیں اور وہ زندگی کے زمینی پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔اعظم کریوی کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہندو تہذیب ومعاشرت کو اپنے افسانوں میں بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے جو ان کے لیے ایک چیلنج کے مانند تھا مگر انھوں نے اس موضوع کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ پریم چند کی طرح اعظم کریوی کے یہاں بھی اصلاحی اور اخلاقی پہلو کی کارفرمائی ہے۔غرض کہ اعظم کریوی نے دیہات نگاری میں پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ان کے یہاں اخلاقی واصلاحی نقطۂ نظر حاوی ہے۔

جواب:3. علی عباس حسینی بچپن سے ہی نہایت ذہین اور ہوشیار تھے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔دس بارہ برس کی عمر میں انھوں نے بہت سی ضخیم کتابوں کا مطالعہ کر لیا تھا مثلاً طلسم ہوش ربا،الف لیلیٰ کے قصے،فردوسی کا شاہنامہ،اس کے علاوہ اردو کی دوسری بہت سی کہانیاں۔جب کچھ بڑے ہوئے تو انگریزی فکشن کا بھی مطالعہ کیا ان سب کا ان کی تخلیقی صلاحیت پر گہرا اثر اپڑا۔علی عباس حسینی نے اردو ادب خصوصاً فکشن کے میدان میں گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔انھوں نے تقریباً دوسو افسانے لکھے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہے۔ بعد میں یہی افسانے مجموعوں کی شکل میں بھی منظر عام پر آئے۔ان میں ''رفیق تنہائی، باسی پھول، میلہ گھومنی، ندیا کنارے، آئی۔سی۔ایس، ایک حمام میں، ہمارا گاؤں، کچھ نہیں ہے، پھولوں کی جھڑی (ہندی)، گائے امان (ہندی)، سیلاب کی راتیں'' قابل ذکر ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''ہمارا گاؤں'' میں شامل افسانے ''ہمارا گاؤں، گاؤں کی لاج، لاٹھی پوجا، چناؤ، بے وقوف، نورونار، دوددا، حاجی بابا، پوتر سیندور اور جل پری'' ہیں۔''آئی۔سی۔ایس میں شامل افسانے ''آئی۔سی۔ایس، شیخو چچا، جھوٹ، دوشریفوں کا مقابلہ، ملک خدا تنگ نیست، بیلوں کی جوڑی، قانون باطن، بختیارک کا نسخہ، ملاپ، شیخ کریم کی نفرت، سماج کی بھینٹ، شریف مزدور، دل کی آگ اور پیا کی جوگن'' ہیں۔''باسی پھول'' میں جن افسانوں کو جگہ ملی ہے وہ اس طرح ہیں: ''باسی پھول، گونگا ہری، بیوی، نئی ہمسائی، عدیا تنبولن، کیے کا بھوک، عدالت، آم کا پھل، امتحانِ قدرت، شکار یا شکاری، خوش قسمت لڑکا، حقِ نمک، کیا کیا جائے۔''میلہ گھومنی'' علی عباس حسینی کی کافی مشہور تصنیف ہے۔اس میں کل اکیس افسانے ہیں جن میں ''مصنف، وکیل اور منشی، جھبو کا ہیرو، طمانچہ، کنجی، ولی عہد بہادر، بدلہ، پہرے دار، کھیت، بٹی، بھکاری، حسن رہگزر، پیاسا، عملِ خیر، خالی گود، میلہ گھومنی، کفن، کلی، بجہنم، بیگار اور میخانہ'' شامل ہیں۔ان کے علاوہ کئی دیگر افسانے جنھیں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ''میاؤں میاؤں، ہنستی چنگاری، خالی گود، جن کا سایہ، پژمردہ کلیاں، دیہاتی، ہار جیت، انتقام، انسپکٹر کی عید، اچھوت برہمن، باغی بیوی، بجھتی شمع، دیش اور دھرم، روزہ، کوڑا گھر، ویران آبادیاں، چمار ٹولی، اور ہنستے ہی گھر بستے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علی عباس حسینی نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔''سرسید احمد پاشا یا قاف کی پری'' شاید کہ بہار آئے اور حکیم بانا یا ذنٹیوں کا بادشاہ'' کے نام سے ان کے ناول منظر عام پر آئے۔دو ڈرامے ''نورتنی اور امیر خسرو'' لکھے۔اس کے علاوہ فکشن تنقید میں ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جو ''ناول کی تنقید اور تاریخ'' کے نام مشہور ومعروف ہے۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''عروس ادب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

پریم چند اسکول سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں سدرشن اور اعظم کریوی کے بعد علی عباس حسینی کا نام آتا ہے۔حقیقت پسندی پریم چند کے افسانوں کا خاص وصف ہے۔علی عباس حسینی کے یہاں بھی یہ وصف اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔وہ اپنے افسانوں میں زمینی حقائق کو

موضوع بناتے ہیں۔اس تعلق سے ''سماجی کی بھینٹ،شریف مزدور، چمارٹولی، ہمارا گاؤں اور گاؤں کی لاج'' وغیرہ افسانوں کے نام محض مثال کے طور پر پیش کر دیے ہیں،اسی طرح اور بھی بہت سے افسانوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں دیہات نگاری کی فضا موثر انداز میں ملتی ہے۔ان کی کہانیوں کے پلاٹ نہایت دلکش اور فطری ہیں۔ چوں کہ حسینی کی پیدائش ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔اس لیے انھوں دیہی زندگی کو قریب سے دیکھا،سمجھا اور جیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں دیہی زندگی کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ فطری اور دلکش ہیں۔انھوں نے دیہی زندگی کے مختلف مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے نچلے طبقے کی زندگی اور اس زندگی میں رونما ہونے والے مختلف مسائل کی بطور احسن ترجمانی کی ہے۔حسینی نچلے طبقے کی خواتین کے مسائل کو پیش کرنے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔انھوں نے پریم چند کی طرح دیہات میں زندگی بسر کرنے والی عورتوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ پریم چند اسکول کا ایک مقصد سماجی اصلاح ہے۔علی عباس حسینی کے افسانوں میں یہ نظریہ بھی پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔کوئی تخلیق جہاں ایک طرف تفنن طبع اور ذوق جمال کو تسکین پہنچانے کا کام کرتی ہے وہیں دوسری جانب وہ پیغامبری کا بھی کام کرتی ہے۔اس سے سماج اور معاشرے میں پھیلی بہت سی خرابیوں کو دور کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔علی عباس حسینی نے بھی اپ نے افسانوں کے ذریعہ اس نوع کے کام لیے ہیں۔ان کے افسانوں کا مرکزی موضوع انسان ہے۔وہ اپنی تخلیقات میں انسان کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔وہ انسانیت پرست اور اصلاح پسند فن کار تھے۔ان کے افسانوں کی زبان سادہ،سلیس اور رواں ہے،جس میں ایک طرح کا فطری بہاؤ ہے۔تصنع،تکلف اور بناوٹی پن سے ان کی تخلیق بہت حد تک پاک ہے۔

جواب:4. انھوں نے اپنی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا بھی بھر پور استعمال کیا۔جس کے نتیجے میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔انھوں نے شاعری،افسانہ، ناول، ڈرامہ،تنقید اور تحقیق کے میدان میں قلم آزمائی کی ہے۔اختر اورینوی ایک اچھے شاعر تھے۔ان کی تخلیقات وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔بعد میں یہی شعری مجموعوں ''انجمن آرزو'' اور ''یک چمن گل'' کی شکل میں منظر عام پر آئے۔انھوں نے دو ناول ''حسرت تعمیر'' اور ''کارواں (نامکمل)'' لکھے۔دو ڈرامے ''شہنشاہِ حبشہ'' اور ''زوال کینٹن'' بھی لکھے۔ان کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا'' لکھا جس پر انھیں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔اس کے علاوہ کئی تحقیقی مضامین بھی لکھے جو ان کی تحقیقی کاوشوں کا پتہ دیتے ہیں۔انھوں نے تنقیدی کارنامے بھی انجام دیے جو ''قدر و نظر، مطالعۂ اقبال، مطالعۂ نظیر، تحقیق و تنقید، کسوٹی سراج و منہاج، مطالعہ و محاسبہ اور گزارش'' کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔افسانوی ادب میں بھی گراں قدر کارنامہ انجام دیا۔ان کے کئی افسانوی مجموعے یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے۔ان کے کل چھ مجموعے ہیں جن میں ''منظر و پس منظر ۱۹۴۰، کلیاں اور کانٹے ۱۹۴۱، انار کلی اور بھول بھلیاں ۱۹۴۴، سیمنٹ اور ڈائنامائٹ ۱۹۴۷، کیچلیاں اور بالِ جبریل ۱۹۵۹، سپنوں کے دیس میں ۱۹۶۹'' ہیں۔اختر اورینوی کے افسانوں میں ''سیکھ جھور، مکان کی تلاش، اکتاہٹ، ممتا، گرجا کے سائے میں جنت سے دور، انھیں مردے نہ کہو، کل آج کل، راج محل میں، ایک معمولی سی لڑکی، کیچلیاں اور بال جبریل، ٹائپسٹ، آخری اکنی، بوڑھی ماما، کام، بے بس، پاگل، جینے کا سہارا، تسکین حسرت، اندھی نگری، دو مائیں، جونیئر، تاخیر، بیل گاڑی، سینے ٹوریم کا فقیر، مریض، یہ دنیا، پس منظر، اب؟، گندے انڈے، کواڑ کی اوٹ سے، محشر، درخت کا قتل، شکور دادا، شادی کے تحفے، بدگمانی، فٹ پاتھ، زود پشیمانی، نیا شوالہ، وہ واقعہ، کوئلے والا، بہت بے آبرو ہو کر، پناہ گزیں، کلیاں اور کانٹے'' قابل ذکر ہیں۔

اختر اورینوی نے تقریباً ۱۹۲۷ کے آس پاس افسانے لکھنے شروع کیے۔ان کے یہاں حقیقت اور رومان کا ایک اچھا امتزاج ملتا ہے۔

پریم چند کی طرح انھوں نے بھی مزدوروں اور کسانوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں دیہی مسائل کو خصوصیت کے ساتھ جگہ دی ہے۔کسان اور زمیندار کے تعلقات کو بھی بیان کیا ہے۔وہ استحصال زدہ افراد کی روداد اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کا پورا وجود نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔اسی طرح جب وہ کسی ماحول یا فضا کا منظر کھینچتے ہیں تو وہاں بھی اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔اختر اورینوی کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں انسان کو اہمیت دی ہے یعنی ان کے افسانوں کا مرکز انسان ہے۔اختر اورینوی نے دیہات کے پس منظر میں تو افسانے لکھے ہی ہیں ساتھ ہی شہری تناظر میں کئی افسانے لکھے ہیں۔ان کے یہاں مزدور کی حیثیت ایک مزدور کی طرح ہی ہے،خواہ وہ شہر کا ہو یا دیہات کا۔بہت سے افراد معاش کی جستجو میں شہروں کا رخ کرتے ہیں۔شہر میں پہنچ کر ان کے مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے۔مثلاً رہائش،طعام،کام،اجنبیت وغیرہ۔غرض یہ کہ غریب اور مزدور طبقے کے لیے شہری زندگی اور بھی درد ناک ہو جاتی ہے۔مگر چوں کہ شہری زندگی میں روزگار کے مواقع ہوتے ہیں اس لیے انسان ان تکلیفوں کو بھی برداشت کرتا رہتا ہے جسے اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔اختر اورینوی نے ان شہری مزدوروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ان کے افسانے محض ایک کہانی یا قصہ نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک طرح کا درد ہے،ایک طرح کا پیغام ہے اور ایک احساس ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

9.9 فرہنگ

لفظ	:	معنی
تفصیل	:	وضاحت سے بیان کرنا
واقف	:	جاننے والا
اتباع	:	اطاعت
طرز	:	طریقہ،قاعدہ
روایت	:	کوئی رسم یا دستور جو پہلے سے قائم ہو
متاخرین	:	بعد میں آنے والے لوگ
مصلح	:	برائیاں دور کرنے والا
تحسین	:	سراہنا،پسند کرنا
انتقام	:	بدلہ
تقلید	:	نقل،کسی کے قدم بہ قدم چلنا
عُسرت	:	تنگی،مفلسی
تصویر کشی	:	تصویر کھینچنے کا کام،مصوری
معمور	:	بھرا ہوا،لبریز
ایثار	:	قربانی دینا

حمام	:	نہانے کی جگہ
دلکش	:	دل کو لبھانے والا
وصف	:	خوبی
امتزاج	:	دو یا زیادہ چیزوں کی آمیزش
جستجو	:	تلاش کرنا
رخ	:	چہرہ، جانب
مشاہدہ	:	آنکھوں دیکھا تجربہ
حسب موقع	:	موقع کے مطابق
معاش	:	روزی
طبقہ	:	انسانوں کا چھوٹا گروہ جو کچھ خصوصیت کے سبب دوسرے گروہ سے الگ ہو

9.10 کتب برائے مطالعہ

پروفیسر جعفر رضا — پریم چند فن اور تعمیر فن — شبستان، شاہ گنج، الہ آباد، ۱۹۹۹

پروفیسر آفاق احمد — پریم چند شناسی — مدھیہ پردیش اردو اکادیمی، بھوپال، ۱۹۹۴

خالد حیدر — پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی کے مسائل) — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹

پروفیسر جعفر رضا — پریم چند کہانی کار رہنما — لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، ۱۹۶۹ء

ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم — اردو افسانے پر ادبی تحریکات ور جحانات کے اثرات — الہدیٰ پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۱۷ء

اکائی 10: افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی، عیدگاہ اور کفن'' کا تنقیدی مطالعہ

ساخت

10.1	اغراض ومقاصد
10.2	تمہید
10.3	بڑے گھر کی بیٹی کا تنقیدی مطالعہ
10.4	عیدگاہ کا تنقیدی مطالعہ
10.5	کفن کا تنقیدی مطالعہ
10.6	آپ نے کیا سیکھا
10.7	اپنا امتحان خود لیجیے
10.8	سوالات کے جوابات
10.9	فرہنگ
10.10	کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ☆ افسانہ بڑے گھر کی بیٹی سے واقف ہوں گے۔
- ☆ دیہی زندگی کی طرز معاشعرت کو سمجھ سکیں گے۔
- ☆ عیدگاہ افسانہ کے ذریعہ مسلم معاشرہ اور رہن سہن کو سمجھ سکیں گے۔
- ☆ افسانہ کفن کا تجزیاتی مطالعہ کرسکیں گے۔
- ☆ پریم چند کی افسانہ نگاری کا جائزہ لے سکیں گے۔

10.2 تمہید

اردو ادب میں افسانہ نگاری کی باضابطہ ابتدا پریم چند سے ہوتی ہے۔ حالاں کہ ان سے پہلے بھی کئی تخلیق کاروں نے افسانے لکھے لیکن ان کے افسانے کے فن کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکے۔ اسی لیے ان افسانوں کی حیثیت محض ابتدائی نقوش کی حد تک ہی سمٹ کر رہ گئی اور پریم چند کو اردو کا باقاعدہ افسانہ نگار تسلیم کیا گیا۔ ان کے افسانوں میں غریبوں، مفلسوں، مظلوموں، کسانوں، زمینداروں، محنت کش طبقوں کے ساتھ ہی دیہی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ پریم چند کی حیثیت ایک مصلح کی تھی۔ وہ سماج میں رائج ان تمام برائیوں اور خرابیوں کو دور کرنا چاہتے تھے جو انسانی سماج اور ملک کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ وہ اپنے ملک کو ایک اچھا اور مثالی نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کے اکثر افسانوں میں اس نظریے کی جھلک ملتی ہے۔ ''بڑے گھر کی بیٹی، عیدگاہ اور کفن'' بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ اس اکائی میں ہم مذکورہ افسانوں کا

تنقیدی مطالعہ کریں گے۔

10.3 افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' کا تنقیدی مطالعہ

''بڑے گھر کی بیٹی''، منشی پریم چند کے مشہور افسانوں میں سے ایک ہے۔ یہ ان کے ابتدائی دور کی تخلیق ہے۔ عام طور پر بڑے گھر کی لڑکیوں کے تعلق سے جو تصور عوام میں رائج ہے، اس افسانے میں پریم چند نے اس کے برعکس اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ دیہات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ بنی مادھو سنگھ نام کے ایک شخص جو موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار ہیں، کسی زمانے میں ان کے آباواجداد کا شمار امراو رؤسا میں ہوتا تھا لیکن موجودہ دور میں ان کی حالت اب ویسی نہیں رہی۔ مادھو سنگھ کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے کا نام سری کنٹھ اور چھوٹے کا نام لال بہاری سنگھ ہے۔ سری کنٹھ ایک پڑھا لکھا، سمجھ دار اور سنجیدہ انسان ہے۔ اس نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور اب ایک دفتر میں ملازمت کرتا ہے۔ دوسرا بیٹا لال بہاری ہے جو دوہرے بدن کا سجیلا نوجوان ہے، اس کی خوراک بھی کافی ہے وہ محض ناشتے میں دو سیر دودھ استعمال کرتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے دونوں بھائی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سری کنٹھ کا مذہب اور رسم ورواج میں گہرا عقیدہ ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی رام لیلا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی تہذیب ومعاشرت کا بھی دلدادہ ہے۔

سری کنٹھ کی شادی ایک اونچے خاندان میں بھوپ سنگھ کی بیٹی آنندی سے ہوجاتی ہے۔ آنندی اپنی سات بہنوں میں چوتھے نمبر پر ہے۔ وہ دوسری بہنوں سے زیادہ خوبصورت اور نیک ہے۔ والدین اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ بھوپ سنگھ ایک ریاست کے تعلقہ دار ہیں۔ ان کے یہاں نوکر چاکر، عالی شان محل اور ہر طرح کی آرام وآسائش کی چیزیں دستیاب ہیں۔ اسی پرسکون اور پرکیف ماحول میں آنندی کی پرورش ہوتی ہے۔ لیکن آنندی کی شادی ایک ایسے گھرانے میں ہوجاتی ہے جہاں اس طرح کی آسائشیں اور سہولیتیں موجود نہیں ہیں جو اسے اپنے والدین کے یہاں میسر تھیں۔ بہرحال وہ جلد ہی خود کو سسرال کے ماحول میں ڈھال لیتی ہے اور ہنسی خوشی زندگی کے اوقات گزرنے لگتے ہیں۔ لیکن وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ تقریباً ہر انسان کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ آنندی کی زندگی میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ایک دن اس کا دیور لال بہاری سنگھ دو مرغیاں لے کر گھر آتا ہے اور آنندی سے اسے پکانے کے لیے کہتا ہے۔ آنندی گوشت پکا کر تیار کر دیتی ہے۔ لال بہاری جب کھانے کے لیے بیٹھا تو اس نے دیکھا کہ دال میں گھی نہیں ہے اس بات کو لے کر آنندی اور لال بہاری میں تکرار شروع ہوجاتی ہے اور لال بہاری طیش میں آکر اپنی آنندی کو کھڑاؤں پھینک کر مار دیتا ہے۔ یہیں سے افسانے میں ایک نیا موڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس منظر کو پریم چند نے یوں پیش کیا ہے:

> ''لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا۔ بولے ''دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟''
> آنندی۔ آج تو کل پاؤ بھر تھا وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔
> جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اٹھتی ہے اسی طرح بھوک سے باؤلا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بری معلوم ہوئی۔ تیکھا ہو کر بولا۔ ''میکے میں تو چاہے گھی کی ندی بہتی ہو۔''
> عورت گالیاں سہتی ہے، مار سہتی ہے مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ آنندی منھ پھیر کر بولی ''ہاتھی مرا تو بھی نو لاکھ کا، وہاں اتنا گھی روز نائی کمہار کھا جاتے ہیں۔''

لال بہاری جل گیا۔ تھالی اٹھا کر پٹک دی اور بولا۔ ''جی چاہتا ہے کہ تالو سے زبان کھینچ لے۔''
آنندی کو بھی غصہ آ گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی ''وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا دیتے۔''
اب نوجوان اجڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی۔ جب جی چاہتا تھا اس پر ہاتھ صاف کر لیا کرتا تھا۔ کھڑاؤں اٹھا کر آنندی کی طرف زور سے پھینکی اور بولا ''جس کے گمان پر پھولی ہوئی ہو اسے بھی دیکھوں گا اور تمھیں بھی۔''
آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکی۔ سر بچ گیا مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصے کے مارے ہوا میں ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔''

یہ واقعہ جمعرات کو پیش آیا جبکہ سری کنٹھ شنبہ کے روز اپنے گھر آتے تھے۔ جمعرات سے شنبہ تک کا وقت آنندی نے بڑی بے چینی، کشمکش اور اضطراب کی حالت میں گزارے۔ سری کنٹھ شنبہ کو آئے تو لال بہاری سنگھ نے ان سے بھابی کی شکایت کی۔ اس پر مزید یہ کہ بنی مادھو سنگھ نے بھی شہادت دے کر اس شکایت کو تقویت بخشی۔ لیکن جب سری کنٹھ آنندی کے پاس گیا اور اس نے پوری روداد سنائی تو سری کنٹھ کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ وہ اپنے باپ کے پاس جا کر بولا کہ ''دادا اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔ کیوں کہ جہاں عورتوں کی عزت نہ ہو، چھوٹے بڑوں کا ادب نہ کرتے ہوں، میری غیر موجودگی میں میری بیوی پر کھڑاؤں کی بوچھاڑ ہوتی ہو، وہاں اب میں نہیں رہ سکتا۔ اس گھر میں یا تو میں رہوں گا یا لال بہاری۔ میں اسے اپنا بھائی نہیں مانتا، مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے، میں اس کا چہرہ تک نہیں دیکھنا چاہتا۔'' بنی مادھو سنگھ نے سری کنٹھ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور دونوں کے درمیان بحث و مباحثے ہوتے رہے۔ لال بہاری دروازے کے پاس کھڑا ہو کر چپ چاپ بھائی کی باتیں سنتا رہا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے لیکن آج بڑے بھائی کے منھ سے دل دوز باتیں سن کر لال بہاری کو بہت زیادہ تکلیف ہوئی اور آخر کار اس نے گھر سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پرانی باتوں کو یاد کر کے زار و قطار روتا ہوا گھر کی کوٹھری میں گیا وہاں کپڑے پہنے اس کے بعد آنندی کے دروازے پر آ کر بولا:

''بھابی! بھیّا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے وہ اب میرا منھ نہیں دیکھنا چاہتے، اس لیے اب میں جاتا ہوں انھیں پھر منھ نہ دکھاؤں گا۔ مجھ سے جو خطا ہوئی ہے اسے معاف کرنا۔
یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہو گئی۔''

لال بہاری کی یہ حالت دیکھ کر آنندی کو ترس آ گیا۔ اب اسے اپنے کیے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے خواہ مخواہ سری کنٹھ سے اس کی شکایت کر دی۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔ لال بہاری نے کہا کہ ''بھابی! بھیا سے میرا سلام کہہ دو۔ وہ میرا منھ دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے میں بھی اپنا منھ انھیں نہ دکھاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ چل دیا اور تیزی سے دروازے کی جانب جانے لگا۔ آنندی نے سری کنٹھ سے اسے روکنے کے لیے کہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اچانک آنندی خود ہی اپنے گھر سے باہر آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لال بہاری جانے کے لیے آمادہ تھا مگر آنندی نے اسے جانے نہ دیا اور اسے قسم دے کر روک دیا۔ اس پر لال بہاری نے کہا کہ میں تب تک واپس نہیں لوٹوں گا جب تک کہ بھیا کا دل میری طرف سے صاف نہیں ہو جاتا ہے۔ اس پر وہ اس کو یقین دلاتی ہے کہ میرے دل میں تمھارے لیے ذرا بھی میل نہیں ہے۔ اسی اثنا میں سری کنٹھ کا دل بھی پگھل جاتا ہے اور دونوں بھائی گلے مل کر خوب روتے ہیں۔ بنی مادھو نے

اس منظر کو دیکھا تو وہ خوش ہو کر بولے ''بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بگڑتا ہوا کام بنا لیتی ہیں۔''

اس افسانے میں پریم چند نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جو تصور عوام میں رائج ہے ضروری نہیں کہ وہ صد فی صد درست ہو۔ امرا ورؤسا کے تعلق سے ہمارے سماج میں یہ بات عام ہے کہ ان کے پاس آرام و آسائش کی ساری چیزیں دستیاب ہوتی ہیں اس لیے یہ عیش و عشرت میں زندگی گزارتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اندر انسانیت اور ہمدردی نہیں ہوتی۔ حالاں کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ ہر انسان کی فطرت الگ الگ ہوتی ہے۔ اس کا حسب نسب یا امیری غریبی سے کوئی واسطہ نہیں۔ کسی انسان کے اندر انسانیت، ہمدردی، غمگساری اور خیر خواہی جیسی خوبیاں اچھی تربیت اور اچھے ماحول کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس افسانے میں دیکھا کہ آنندی جو ایک امیر گھرانے کی پروردہ ہے جسے ہر طرح کی آسائشیں ہمہ وقت دستیاب تھیں، وہی جب بیاہ کر اپنے سسرال جاتی ہے تو وہاں چیزوں کی فراوانی اس طرح نہیں ہوتی جیسا کہ اس کے باپ کے گھر میسر تھیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سسرال کے ماحول میں ڈھال لیتی ہے اور ہنسی خوشی اپنی زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔ یہ اس کے والدین کی تربیت کا ہی نتیجہ ہے۔ اسی طرح جب بنی مادھو سنگھ کا گھر اجڑنے کے قریب ہوتا ہے تو آنندی ہی اس تباہی سے گھر کو بچاتی ہے۔ یہاں بھی اس کی تربیت اسے ایسا کرنے پر اکساتی ہے۔ اچھی تربیت کی پہچان اکثر مشکل وقت میں ہی ہوتی ہے۔ پریم چند نے اس افسانے کے ذریعہ یہ پیغام دیا ہے کہ اچھائی ہر اچھے انسان میں موجود ہے، ہمیں اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

10.4 افسانہ ''عیدگاہ'' کا تنقیدی مطالعہ

یہ افسانہ بھی دیہات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں پریم چند نے مسلم سماج کے رہن سہن کو ایک اہم تیوہار کے ذریعہ ایک یتیم بچے حامد کی روداد پیش کی ہے۔ ایک نابالغ بچہ اتنی کم سنی میں بھی ایسا کام کرتا ہے جو بڑے بوڑھے اور گھر کے ذمے دار کرتے ہیں۔ جس وقت بچے کو کھیل کود سے دلچسپی ہونی چاہیے اس وقت وہ بچہ اپنے گھر کے مسائل پر غور و فکر کر رہا ہے۔

افسانے کا پلاٹ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ رمضان کے تیس روزے رکھنے کے بعد عید آئی ہے۔ چاروں طرف خوشی کا ماحول ہے۔ سبھی عیدگاہ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اسی گاؤں میں حامد نام کا ایک چار سالہ بچہ رہتا ہے۔ اس کے والد کو ہیضہ ہو گیا تھا جس کے سبب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اسی طرح والدہ بھی کسی بیماری کا شکار ہو کر انتقال کر گئیں۔ اس طرح حامد کے سر سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اٹھ چکا ہے۔ اب وہ یتیمی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے دادی امینہ اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ عید کے موقع پر وہ بھی عیدگاہ جانے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ مگر اس کی دادی کو طرح طرح کے خیالات آتے ہیں کہ گاؤں کے سبھی بچے تو اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں، حامد تو اکیلا ہے وہ کس کے ساتھ جائے گا، کہیں بھیڑ بھاڑ میں کھو نہ جائے، اتنی دور جانے پر اس کے پیروں میں چھالے پڑ جائیں گے۔ اسی طرح کے اور بھی خیالات آتے ہیں۔ آخر کار امینہ حامد کو تین پیسے دے کر گاؤں کے بچوں کے ساتھ عیدگاہ کے لیے روانہ کرتی ہے۔ حامد کے دوست محسن، آذر، سمیع، نوری اور محمود راستے بھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے عیدگاہ پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں عید کی نماز کے بعد ہر بچہ میلے کی جانب رخ کرتا ہے اور سب سے پہلے سب چرخی پر بیٹھتے ہیں اور جھولا جھولتے ہیں۔ حامد انھیں دور سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے اور سوچتا ہے کہ ذرا سے چکر کے لئے وہ اپنے تین پیسے کیوں برباد کرے۔ حالاں کہ محسن کے والد اسے بار بار بلاتے ہیں لیکن وہ ان کا احسان نہیں لینا چاہتا۔ اس کے بعد سب اپنی پسند کی چیزیں خریدتے ہیں جس میں کھلونے اور مٹھائیاں وغیرہ ہیں لیکن حامد کے پاس صرف تین پیسے تھے جو اس کی دادی نے بڑی مشقتوں سے جمع کئے تھے۔ اس لیے وہ نہ تو مٹھائی خریدتا ہے اور نہ ہی کھلونے کی جانب توجہ کرتا ہے۔ جب اس کے دوست کوئی چیز خریدتے

تو وہ انھیں ایک بار ہاتھ میں لے کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کی خواہش ادھوری رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ کوئی بچہ اسے اپنا کھلونا دینا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی حسرتوں کو دل میں چھپا لیتا ہے اور کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتا ہے۔ حامد کے دوستوں کے پاس بہت سارے پیسے تھے جنھیں وہ جیب سے بار بار نکال کر دیکھتے تھے اور خوشی سے دوبارہ جیب میں رکھ لیتے تھے۔ جیب میں رکھے کھنکھناتے ہوئے سکے انھیں خوشی کا احساس کراتے تھے اس سے ان کے چہروں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ لیکن ان بچوں کی بہ نسبت حامد کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ مٹھائیوں اور کھلونوں کو خرید کر اپنے پیسے برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ پورے میلے میں گھوم گھوم کر سبھی دکانوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز خریدے جو جلدی ختم یا خراب نہ ہو۔ حامد کے ساتھ آیا ہوا اس کا دوست محمود خاکی وردی اور لال پگڑی والا سپاہی خریدتا ہے۔ محسن کو جھکی کمر اور پشت پر مشک والا بھشتی پسند آیا۔ نوری نے کالا چوغا اور سفید اچکن پہنے اور قانون کی کتاب لئے ایک مٹی کا وکیل خریدا۔ وہ بچوں کو مٹی کے کھولنے خریدتے دیکھتا ہے تو کہتا کہ یہ سب مٹی کے کھلونے ہیں گر کر ٹوٹ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ ایک برتن کی دکان پر گیا جہاں اسے دست پناہ (چمٹا) دکھائی دیا۔ اس چمٹے کو دیکھ کر اسے اپنی دادی کے ہاتھوں کا خیال آیا جو روٹی پکاتے وقت جل جاتے تھے کیوں کہ ان کے پاس چمٹا نہیں تھا جس سے وہ روٹی پکا سکیں۔ ان کا خیال آتے ہی حامد نے اس چمٹے والے سے مول تول کر کے تین پیسے میں چمٹا خرید لیا۔ اپنی اپنی چیزیں خریدنے کے بعد جب سارے بچے ایک جگہ جمع ہوئے تو سب نے اپنے خریدے ہوئے کھلونے حامد کو دکھائے اور جب حامد نے انھیں اپنا چمٹا دکھایا تو سب نے اس کا بہت مذاق اڑایا۔ لیکن حامد سمجھدار بچہ تھا اس نے ان بچوں کو جواب دیا کہ تم سب کے کھلونے مٹی کے ہیں اور یہ سب ٹوٹ جائیں گے لیکن اس کا چمٹا لوہے کا بنا ہوا ہے وہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ وہ چمٹے کو اپنے کندھے پر رکھ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اب یہ بندوق ہو گیا اور اگر اس کو بجاؤ تو باجا بن سکتا ہے۔ حامد نے چمٹے کی ایسی تعریف کی کہ تمام بچے چمٹے کے بدلے اسے اپنا اپنا کھلونا دینے کو تیار ہو گئے لیکن حامد نے کسی کی پیشکش قبول نہیں کی۔ سبھی بچے بستی کی جانب واپس آ گئے اور کچھ ہی دیر میں کھیلتے ہوئے ایک ایک کر کے سارے کھلونے ٹوٹ گئے لیکن حامد کا چمٹا باقی رہا۔ وہ اسے فخر سے اٹھائے اپنی دادی کے پاس گیا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ حامد نے دوپہر تک کچھ کھایا پیا نہیں اور یہ چمٹا لے کر آیا ہے تو وہ ناراض ہو گئیں لیکن جب اس نے اپنی دادی سے کہا کہ روٹی پکاتے وقت آپ کی انگلیاں جل جاتی تھیں اس لئے وہ یہ چمٹا لایا ہے تو شفقت و محبت سے ان کا دل بھر آیا۔ انھیں احساس ہوا کہ حامد اتنی کم عمر میں بھی دنیا کی رنگینوں اور میلے کی رونق میں کھویا نہیں بلکہ اسے وہاں بھی اپنی دادی کی تکلیف یاد رہی۔ انھوں نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ وہ آج بچوں کی طرح رو رہی تھیں کیوں کہ انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کا پوتا ان کی فکر میں پریشان ہے اور انھیں دل ہی دل میں اپنے بیٹے کی یاد آئی اور اس کو سینے سے لگا کر آنسو بہاتی رہیں۔

افسانہ ''عیدگاہ'' موضوع کے لحاظ سے سادہ ہے لیکن اس میں جو گہرائی ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ افسانہ نگار نے حامد کی عمر چار سال بتائی ہے اور اس چھوٹی سی عمر میں ایک بچے کا اپنے گھر اور اپنی دادی کے لئے فکرمند ہونا حیرت انگیز بات ہے۔ پریم چند نے یہاں یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ غربت کی وجہ سے حامد کے اندر یہ احساس بہت زیادہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور وہ غریب ہے۔ جب میلے میں وہ دوسرے بچوں کو جھولا جھولتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کا مزا لے لیکن صرف چند چکر کے لئے وہ جھولا نہیں جھولتا کیونکہ اس کے پاس پیسے کم ہیں۔ جب وہ دوسرے بچوں کو مٹھائی کھاتے دیکھتا ہے تو اسے بھی مٹھائی کھانے کی خواہش ہوتی ہے لیکن وہ یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ تھوڑی دیر کو لذت ملے گی لیکن پیسے ختم ہو جائیں گے۔ پھر جب بچے کھلونے خریدتے ہیں تو حامد کا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ ان کھلونوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھے لیکن اس کی یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوتی کیونکہ نہ تو کوئی اسے اپنا کھلونا دیتا ہے اور نہ ہی

وہ خود کھلونا خریدتا ہے۔ پریم چند نے ایک بچے کی نفسیات کو بہت گہرائی سے پیش کیا ہے۔ ایک طرف تو اس کا دل بھی دوسرے بچوں کی طرح ہر چیز کے لئے مچل جاتا ہے لیکن دوسری طرف اس کے اندر ضبط کا مادہ بھی بہت ہے۔ وہ ہر بار خود کو سمجھاتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ چمٹا خریدنے پر سارے بچے اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو وہ بہت ہی ہوشیاری کے ساتھ ان بچوں کے کھلونوں کو اپنے چمٹے سے کمتر بتاتا ہے اور سب اس بات پر اتفاق بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد گھر جا کر جس طرح وہ اپنی دادی سے ان کی تکلیف کا بیان کرتے ہوئے چمٹا خریدنے کی وجہ بتاتا ہے وہ اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ حامد کے اندر بچپن سے ہی سنجیدگی موجود ہے۔ اس کے نامساعد حالات نے اسے اس بات کا شدید احساس کرایا ہے کہ وہ اوروں سے کمتر ہے اس لئے وہ خود کو دوسروں سے کمتر نہ ہونے دینے کے لئے اپنی باتوں سے سبھی کو احساس دلاتا ہے کہ چمٹا خرید کر اس نے کوئی نقصان کو سودا نہیں کیا اور دوسری طرف وہ اس چمٹے کے ذریعے اپنی دادی کی نہ صرف تکلیف دور کرتا ہے بلکہ ان کی دعاؤں کا حق دار بھی بن جاتا ہے۔

یہ افسانہ بظاہر حامد اور اس کے چند دوستوں کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ مگر درحقیقت اس افسانے میں بدلتے سماجی شعور، تجسس اور مضبوط قوت ارادی کی سوچ کارفرما ہے۔ گاؤں کا چار سالہ بچہ حامد اور شہر سے خریدا ہوا چمٹا دو علامتیں ہیں۔ حامد اگر نوزائیدہ شعور، تجسس اور معصومیت کی علامت ہے تو چمٹا قوت ارادی اور تحفظ کی علامت ہے۔

10.5 افسانہ ''کفن'' کا تنقیدی مطالعہ

کسی فنکار کی تمام تخلیقات شاہکار نہیں ہوتیں بلکہ کچھ ہی تخلیق ایسی ہوتی ہیں جو شاہکار کے درجے کو پہنچتی ہیں اور انھیں کی بدولت اس فنکار کو حیات جاودانی عطا ہوتی ہے۔ پریم چند کے افسانہ ''کفن'' کو یہ درجہ حاصل ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں اس افسانے کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہے اور خود پریم چند کا مرتبہ بھی اس افسانے کی وجہ سے بڑھ گیا ہے۔

پریم چند کے زیادہ تر افسانے دیہات کی فضا، ماحول اور مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ ''کفن'' کی ابتدا بھی اسی ماحول میں ہوتی ہے۔ گھیسو اور مادھو نام کے دو شخص ہیں جن کی حیثیت ایک مزدور کی ہے لیکن دونوں کاہل اور بے حس ہیں جس کے باعث تنگی و عسرت ان کا مقدر بن گئی ہے۔ گھیسو باپ ہے اور مادھو اس کا بیٹا اور مادھو کی بیوی کا نام بدھیا ہے۔ باپ اور بیٹے اپنے جھونپڑے کے باہر الاؤ کے پاس بیٹھے آلو بھون کر کھا رہے ہیں جبکہ بدھیا جھونپڑے کے اندر اکیلی درد زہ سے تڑپ رہی ہے۔ سردی کے موسم اور رات کے سناٹے میں اس کی تڑپ سے ایسی دل خراش آواز آتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے لیکن دونوں میں سے کوئی اس کی حال پرسی کے لیے اس کے قریب نہیں گیا۔ دونوں کو اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر ایک الاؤ کے پاس سے ہٹا تو دوسرا اس کے حصے کی آلو کھا جائے گا۔ دونوں آلو کھانے کے بعد اسی الاؤ کے پاس سو جاتے ہیں اور جب صبح ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بدھیا مر چکی تھی اور ساتھ ہی اس کا بچہ بھی۔ اب ان دونوں کو اس کی تدفین کی فکر ہوئی۔ لہٰذا انھوں نے ڈرمائی انداز میں رونا دھونا شروع کر دیا۔ ان کے اس عمل سے پاس پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے۔ باوجود ان کی نااہلی اور کام چوری کے لوگ ان کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن پڑوسیوں کی مدد تدفین کے لیے ناکافی تھی۔ لہٰذا دونوں نے گاؤں کے زمیندار کے گھر کا رخ کیا اور ان سے مدد طلب کی۔ زمیندار ان کی صورت سے بھی نفرت کرتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے دو روپیہ دیا۔ اس طرح امداد کی تمام رقم ملا کر کل پانچ روپئے جمع ہو گئے۔ تب یہ لوگ کفن خریدنے کے لیے بازار کی جانب روانہ ہو گئے، راستے میں انھیں طرح طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں۔ ان کو پریم چند یوں بیان کرتے ہیں:

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔''لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو؟

مادھو بولا۔''ہاں لکڑی تو بہت ہے۔اب کپھن چاہیے۔''

''تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔''

''ہاں اور کیا۔لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔''

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔''

کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔''

''اور کیا رکھا ہے۔یہی پانچ روپیہ ملتے تو دوا دارو کرتے۔''

یہ سب باتیں کرتے ہوئے بازار میں انھیں شام ہو جاتی ہے اور وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک شراب خانے کے سامنے پہنچ جاتے ہیں۔ایک شرابی کی کمزوری شراب ہوتی ہے۔اسی طرح یہ دونوں بھی اپنی کمزوری کے آگے بے بس ہو کر شراب خانے میں داخل ہو جاتے ہیں۔پھر کیا تھا جام پر جام چلتے ہیں اور پوڑیاں، گوشت، سالن، کلیجی اور مچھلی وغیرہ منگواتے ہیں اور ہر طرح کے خوف وخطر سے بے نیاز ہو کر کھاتے ہیں، اس کے بعد بدھیا کو دعائیں بھی دیتے ہیں۔کہتے ہیں کہ''بڑی اچھی تھی بچاری۔مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔''مادھو کہتا ہے کہ''بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔اسے بیکنٹھ لے جانا۔ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔''انھوں نے کھانے کے بعد جو کچھ بچا تھا اسے ایک بھکاری کو دے دیا اور اس سے کہا کہ لے جا کھا اور اسیر باد دے۔اسی دوران مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر گھیسو سے پوچھتا ہے کہ بدھیا بیکنٹھ میں جائے گی نہ؟ اس پر گھیسو مثبت میں جواب دے کر بدھیا کی اچھائیاں گنواتا ہے اور ان لوگوں پر طنز کستا ہے جو دوسروں کا استحصال کرتے ہیں:

> ''ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔وہ نہ جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔''

جب بدھیا درد زہ سے تڑپ تڑپ مر رہی تھی تو اس وقت مادھو اس کے قریب اسے دیکھنے تک کے لیے بھی نہیں جاتا لیکن آج اس کی ان تکلیفوں کو یاد کر کے روتے ہوئے کہتا ہے:

> ''مگر دادا۔بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر۔''
>
> گھیسو نے سمجھایا۔''کیوں روتا ہے بیٹا۔کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔''

ادھر دونوں کھا پی کر مست مے خانے کے سامنے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ادھر بدھیا کی لاش کفن کے انتظار میں کوٹھری میں پڑی رہتی ہے۔

اس افسانے کے کئی پہلو ہیں۔اس میں اولاً وہ مادھو اور گھیسو نظر آتے ہیں جو نکمے اور کاہل ہیں۔ان کی اس کاہلی کی وجہ ان کی مجبوری ہے۔ایسی مجبوری جو ان کی طرح بے سروسامان، مزدوروں، مظلوموں کو شب و روز جی توڑ محنت کے باوجود پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ان کی یہ کاہلی ان جیسے انسانوں سے لی جانے والی بیگار کے خلاف بغاوت کا اظہار ہے۔ان کے کردار کا دوسرا پہلو اس وقت نظر آتا ہے جب مادھو کی

بیوی دردزہ سے تڑپ رہی ہے اس وقت وہ دونوں اس کی حال پرسی کے بجائے آلو کھانے کی منہمک ہیں۔ان کی یہ بے حسی دراصل ان کی بے بسی کے باعث ہے۔ان کی کنگالی انھیں بدھیا کے کرب اور تکلیف سے آنکھیں چرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ان کے کردار کا ایک اور پہلو اس وقت دکھائی دیتا ہے جب وہ کفن کے پیسے شراب و کباب میں خرچ دیتے ہیں۔ یہ درحقیقت اس سماج کے خلاف بغاوت کی علامت ہے جو جیتے زندہ انسانوں کا استحصال کرتا ہے اور اس کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں مدد بھی نہیں کرتا۔ وہی سماج مرنے کے بعد اس کے کفن دفن کے لیے پیسے دیتا ہے۔

انسان کی چند بنیادی ضرورتوں میں ہوا اور پانی کے ساتھ کھانا ہے۔بھوک انسان کو جانے کیا کیا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔اس افسانے میں بھوک بنیادی استعارہ ہے جس کے آگے خونی رشتے، روایات اور مذہبی رسومات وغیرہ سب کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔اس افسانے میں پریم چند نے اسی بات کو اجاگر کیا ہے۔گھیسو اور مادھو کفن خریدنے کے بجائے ان روپیوں سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔گھیسو کو ایسا کھانا تقریباً بیس سال بعد نصیب ہو سکا ہے۔ان دونوں کی بھوک کے سامنے کفن دفن کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔ پریم چند نے یہاں یہ بتایا ہے کہ جب انسان مفلسی کا شکار ہو جاتا ہے اور بھوک کی شدت اسے ستاتی ہے تو وہ غیر انسانی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔اس کے اندر کی انسانیت مر جاتی ہے اور وہ انسانیت کی سطح سے گر جاتا ہے۔

10.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

پریم چند کی افسانہ نگاری کے بارے میں جانا۔

پریم چند کے افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' سے واقفیت حاصل کی۔

افسانہ ''کفن'' کا تنقیدی جائزہ دیکھا۔

افسانہ ''عیدگاہ'' کو مختلف جہتوں سے جانا۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کے فنی امتیازات کے بارے میں پڑھا۔

10.7 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

سوال:2۔ افسانہ ''عیدگاہ'' کا فنی جائزہ پیش کیجئے۔

سوال:3۔ افسانہ ''کفن'' کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیجئے۔

سوال:4۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے فنی امتیازات بتائیے۔

سوال:5۔ پریم چند کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ پیش کیجئے۔

10.8 سوالات کے جوابات

جواب 1۔ 'بڑے گھر کی بیٹی'، منشی پریم چند کے مشہور افسانوں میں سے ایک ہے۔ یہ ان کے ابتدائی دور کی تخلیق ہے۔عام طور پر بڑے گھر کی لڑکیوں کے تعلق سے جو تصور عوام میں رائج ہے اس افسانے میں پریم چند نے اس کے برعکس اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ

دیہات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ بنی مادھوسنگھ نام کے ایک شخص جو موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار ہیں، کسی زمانے میں ان کے آباو اجداد کا شمار امرا اور رؤسا میں ہوتا تھا لیکن موجودہ دور میں ان کی حالت اب ویسی نہیں رہی۔ مادھوسنگھ کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے کا نام سری کنٹھ اور چھوٹے کا نام لال بہاری سنگھ ہے۔ سری کنٹھ ایک پڑھا لکھا، سمجھ دار اور سنجیدہ انسان ہے۔ اس نے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور اب ایک دفتر میں ملازمت کرتا ہے۔ دوسرا بیٹا لال بہاری جو دوہرے بدن کا سجیلا نوجوان ہے، اس کی خوراک بھی کافی ہے وہ محض ناشتے میں دوسیر دودھ استعمال کر جاتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے دونوں بھائی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سری کنٹھ مذہب اور رسم ورواج میں یقین رکھتا ہے۔ اپنے گاؤں کی رام لیلا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی تہذیب ومعاشرت کے دلدادہ ہے۔

سری کنٹھ کی شادی ایک اونچے خاندان میں بھوپ سنگھ کی بیٹی آنندی سے ہوجاتی ہے۔ آنندی اپنی سات بہنوں میں چوتھے نمبر پر ہے۔ وہ دوسری بہنوں سے زیادہ خوبصورت اور نیک ہے۔ والدین اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ بھوپ سنگھ ایک ریاست کے تعلقہ دار ہیں۔ ان کے یہاں نوکر چاکر، عالی شان محل اور ہر طرح کی آرام وآسائش کی چیزیں دستیاب ہیں۔ اسی پرسکون اور پرکیف ماحول میں آنندی کی پرورش ہوتی ہے۔ لیکن آنندی کی شادی ایک ایسے گھرانے میں ہوجاتی ہے جہاں اس طرح کی آسائشیں اور سہولیتیں موجود نہیں ہیں جو اسے اپنے والدین کے یہاں میسر تھیں۔ بہرحال وہ جلد ہی اپنے آپ کو سسرال کے ماحول میں ڈھال لیتی ہے اور زندگی کے اوقات گزرنے لگتے ہیں۔ ایک دن لال بہاری سنگھ دو مرغیاں لے کر گھر آتا ہے اور اپنی بھابھی یعنی آنندی سے اسے پکانے کے لیے کہتا ہے۔ بھابی گوشت پکا کر تیار کر دیتی ہے۔ لال بہاری جب کھانے کے لیے بیٹھا تو اس نے دیکھا کہ دال میں گھی نہیں ہے اس بات کو لے کر آنندی اور لال بہاری میں تکرار شروع ہوجاتی ہے اور لال بہاری طیش میں آکر اپنی بھابی کو کھڑاؤں پھینک کر مار دیتا ہے۔ یہیں سے افسانے میں ایک نیا موڑ پیدا ہوتا ہے۔

جواب2۔ افسانہ ''عیدگاہ'' موضوع کے لحاظ سے سادہ ہے لیکن اس میں جو گہرائی ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ افسانہ نگار نے حامد کی عمر چار سال بتائی ہے اور اس چھوٹی سی عمر میں ایک بچے کا اپنے گھر اور اپنی دادی کے لئے فکرمند ہونا حیرت انگیز بات ہے۔ پریم چند نے یہاں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ غربت کی وجہ سے حامد کے اندر یہ احساس بہت زیادہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور وہ غریب ہے۔ جب میلے میں وہ دوسرے بچوں کو جھولا جھولتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کا مزا لے لیکن صرف چند چکر کے لئے وہ جھولا نہیں جھولتا کیونکہ اس کے پاس پیسے کم ہیں۔ جب وہ دوسرے بچوں کو مٹھائی کھاتے دیکھتا ہے تو اسے بھی مٹھائی کھانے کی خواہش ہوتی ہے لیکن وہ یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ تھوڑی دیر کو لذت ملے گی لیکن پیسے ختم ہوجائیں گے۔ پھر جب بچے کھلونے خریدتے ہیں تو حامد کا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ ان کھلونوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھے لیکن اس کی یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوتی کیونکہ نہ تو کوئی اسے اپنا کھلونا دیتا ہے اور نہ ہی وہ خود کھلونا خریدتا ہے۔ پریم چند نے ایک بچے کی نفسیات کو بہت گہرائی سے پیش کیا ہے۔ ایک طرف تو اس کا دل بھی دوسرے بچوں کی طرح ہر چیز کے لئے مچل جاتا ہے لیکن دوسری طرف اس کے اندر ضبط کا مادہ بہت ہے۔ وہ ہر بار خود کو سمجھاتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ جب چمٹا خریدنے پر سارے بچے اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو وہ بہت ہی ہوشیاری کے ساتھ ان بچوں کے کھلونوں کو اپنے چمٹے سے کمتر بتاتا ہے اور سب اس بات پر اتفاق بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد گھر جاکر جس طرح وہ اپنی دادی سے ان کی تکلیف کا بیان کرتے ہوئے چمٹا خریدنے کی وجہ بتاتا ہے وہ اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ حامد کے اندر بچپن سے ہی سنجیدگی موجود ہے۔ اس کے نامساعد حالات نے اسے اس بات کا شدید احساس کرایا ہے کہ وہ اوروں سے کمتر ہے اس لئے وہ خود کو دوسروں سے کمتر نہ ہونے دینے کے لئے اپنی باتوں سے سبھی کو احساس دلاتا ہے کہ چمٹا خرید کر اس نے کوئی نقصان کو سودا نہیں کیا اور دوسری طرف وہ اس چمٹے کے ذریعے اپنی دادی کی نہ صرف تکلیف دور کرتا ہے بلکہ ان کی

دعاؤں کا حق دار بھی بن جاتا ہے۔

جواب3۔ پریم چند سے قبل اردو افسانے کے نقوش انتہائی دھندلے ہیں۔ افسانہ بحیثیت صنف ادب پریم چند کی دین ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو کے افسانوی ادب کا رشتہ زمین سے جوڑا اور ہندوستان کی دیہی زندگی کے مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ افسانوی ادب جو محض بادشاہوں، شہزادوں، مافوق الفطرت عناصر اور جادوگروں وغیرہ کے بیان تک محدود تھا، اس میں پہلی بار گاؤں کے مسائل، عام انسانوں کے دکھ، درد، غم اور خوشی کے منظر بھی دیکھنے کو ملے۔''پوس کی رات''ہو یا''بوڑھی کاکی''''پنچایت''ہو یا''عیدگاہ''''نمک کا داروغہ''ہو یا''بڑے گھر کی بیٹی''پریم چند نے کسی نہ کسی سماجی مسئلے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اور اردو کے افسانوی ادب کو صحیح معنوں میں نہ صرف آئینۂ حیات بلکہ تنقید حیات کے درجے پر پہنچا دیا۔

کفن پریم چند کی زندگی کی آخری تخلیقات میں سے ایک ہے جس میں زندگی بھر کا علم، تجربہ اور شعور کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ پریم چند اپنی مختصر زندگی میں مختلف قسم کے حادثات و تجربات سے گزرے جس سے ان کی فکر و نظر میں کئی موڑ اور پڑاؤ آئے۔ کفن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ جذبہ اور فلسفہ باطنی سطح پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ فنی سطح پر بھی جو پختگی اس افسانے میں دکھائی دیتی ہے وہ ان کے دیگر افسانوں میں کم نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفن صرف اردو کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے افسانوی ادب میں چند بڑے افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اردو کے بعض نقاد تو اسے دنیا کے بڑے افسانوں میں شمار کرتے ہیں۔

کفن پریم چند کا شاہکار افسانہ کہا جاتا ہے۔ مسلسل بھوک، استحصال اور سماجی جبر انسان سے کس طرح بنیادی انسانی اوصاف چھین لیتا ہے، اس کی عکاسی پریم چند کے اس افسانے میں کی گئی ہے۔ مادھو اور گھیسو صرف اس لیے دم توڑتی ہوئی بدھیا کے پاس نہیں جاتے کہ اگر ایک گیا تو دوسرا ان آلوؤں کو کھا جائے گا جو وہ کھیت سے کھود لائے تھے۔ بدھیا کے مرنے کے بعد ہاتھ آئے کفن کے پیسوں کو بھی وہ شراب وہ کباب میں خرچ کر دیتے ہیں اور پھر مختلف تاویلوں سے اپنے ضمیر کی آواز دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے مکارانہ طرز عمل سے خوش اور مطمئن ہے کیونکہ وہ ان کسانوں سے تو بہتر ہیں جو جی توڑ محنت کرتے ہیں اور دوسرے اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہ بیچارے اپنی سادہ لوحی کے باعث ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں۔ اس طرح پریم چند کا یہ افسانہ پلاٹ، کردار نگاری، فطری مکالموں اور دیگر فنی خوبیوں کی بنا پر اردو کے اہم ترین افسانے کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔

اس افسانے کا پہلا اور بڑا کمال یہ ہے کہ یہ ایک ایسے دو کرداروں کے ذریعہ شروع ہوتا ہے جن کی سماج میں کوئی حیثیت نہیں ہے، وہ نااہل ہیں، کام چور ہیں اور بے حس بھی ہیں چوری چماری کر کے کسی طرح پیٹ بھرتے ہیں ان دونوں کرداروں کا پریم چند یوں تعارف کراتے ہیں۔

''چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہوتو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی..... گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں تھا۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے دنیا کے مکروں سے آزاد قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں..... مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے۔''

جواب4۔ کسی فنکار کا فن ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے آخر میں پختگی کو پہنچتا ہے۔ اکثر فنکار کے فن میں پختگی ان کے آخری دور میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کا آخری دور مختصر عرصے کو محیط ہے اور یہی زمانہ ان کی نظریات کی پختگی اور ترویج کا بھی

ہے۔ اس عہد کے افسانوں کے موضوعات اکثر سیاسی ہیں لیکن فن اور معیار کے اعتبار سے پچھلے دونوں ادوار کے مقابلے میں بہت بلند ہیں۔ مجموعہ ''سوز وطن'' کے افسانوں کے بعد پریم چند کے قلم سے حج اکبر، بوڑھی کاکی، دو بیل، نئی بیوی اور زادِراہ جیسے افسانے تخلیق ہوئے اور پھر ان کا فن بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتا رہا۔ اور آخر میں ''کفن'' جیسا افسانہ لکھ کر انہوں نے افسانوی ادب میں اپنی فنی اور فکری صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ افسانہ ''کفن'' کی کہانی دو چماروں کی ہے جو بے حیائی اور ڈھٹائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ دونوں اپنی کاہلی و سستی کی وجہ سے پورے گاؤں میں بدنام ہیں۔ اسی لیے لوگ ان سے کام کروانے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ بدھیا کے مرنے کے بعد اس کا شوہر مادھو اور سسر گھیسو اس کے کفن دفن کے لیے زمیندار اور محلے والوں سے پیسے مانگ کر لاتے ہیں مگر یہ سوچ کر کہ ''کفن تو لاش کے ساتھ جل ہی جاتا ہے'' وہ پیسے شراب و کباب میں خرچ کر دیتے ہیں۔

اس دور کے کئی افسانے مقامی ہونے کے باوجود آفاقی کہلانے کے مستحق قرار دیئے جاسکتے ہیں کیوں کہ اب ان کے افسانوں میں وہ ساری خصوصیات در آئی تھیں جو ایک اچھے اور معیاری افسانوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی زبان بھی صاف اور رواں ہوگئی تھی اور اندازِ بیان میں بھی دلکشی اور جاذبیت آ گئی تھی۔ سادگی و پرکاری، متانت و سنجیدگی ان کی تحریر کی خوبی تھے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پریم چند نے اپنے افسانوں میں زندگی کے دو پہلوؤں المیہ و طربیہ کو سمو دیا ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں سبھی طبقے اور سماج کے لوگوں کی روداد دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ مثلاً روہیلوں، بندیلوں اور راجپوتوں کی جنگجویانہ صفات اور جرأت مندانہ اقدار کا ذکر کرتے ہیں اور ہندو مہاجنوں، ساہوکاروں، سیٹھوں اور زمینداروں کے ظلم و تشدد اور گھناؤنے کرداروں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں، ان کے علاوہ غریب کسانوں، مفلس کاشتکاروں اور نیچی ذات کے چماروں کی بے بسی اور بے کسی کی المناک داستانیں بھی تحریر کرتے ہیں۔ ان کے یہاں رانی سارندھا جیسی جاں باز اور آن پر مٹنے والی رانیاں بھی ہیں اور کام چور و کاہل گھیسو اور مادھو جیسے المیہ کردار بھی جگہ پاتے ہیں۔

انسان ایک ہی طرح کے واقعات سے کس طرح متاثر ہوتا ہے؟ اس کے تعجب، حیرت، رنج، غصہ، نفرت، حسد، بغض، رشک، رقابت اور اس قسم کے فطری جذبات کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟ یہ چیزیں سب انسانوں کے لیے یکساں ہیں اور اس لیے افسانوی بلندی حاصل کرنے کے لیے افسانہ نگار نفسیات سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اس چیز سے پریم چند نے اس قدر کام لیا ہے کہ وہ ان کے طرز بیان کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ پریم چند کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اردو افسانوں میں حقیقت شعاری کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں جن میں ہر جگہ عالم گیر حقائق، عام فطرت انسانی کی نفسیات اور بلندی خیال کو پیش نظر رکھا ہے۔

پریم چند کے یہاں جہاں ایک طرف جذبات نگاری تنقیدِ حیات ہے وہیں دوسری طرف ترغیب و اصلاح بھی ہے۔ یہ وہ معاشرتی اور سیاسی شعور تھا جس نے پریم چند کو حقیقت پسند افسانہ نگار بنا دیا اور ان کے افسانے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی تقاضوں کی ترجمانی کرنے لگے۔ ان کے افسانوں میں ملک و قوم کی خاطر ایثار و محبت کے جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے ایک ماہر نفسیات کی طرح محکوم قوموں کو عزم و ہمت کے گر سکھائے۔ پریم چند نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انسان دوستی اور وطن دوستی کی بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کے یہاں سچی وطن دوستی، سماجی اصلاح کا جذبہ، دیہاتی زندگی کے مرقعے، طبقاتی کشمکش اور کردار نگاری کی خوبصوت مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے تخلیقی جبلت کو محض فن تک محدود نہیں کیا بلکہ اس میں مقصدیت کی روح پھونک کر ایک مصلح قوم کی حیثیت سے نمایاں کارنامہ انجام دیا۔

جواب 5۔ پریم چند کی افسانہ نگاری میں عہد بہ عہد ارتقاء نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کی افسانہ نگاری کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا دور 1909ء سے لے کر 1920ء تک ہے۔ دوسرا دور 1930ء سے 1932ء تک اور تیسرا دور 1932ء سے 1936ء تک ان کی زندگی کے آخری چار سال کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلے دور کے افسانوں میں رومانی تصورات نمایاں ہیں۔ دوسرے دور میں معاشرتی برائیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دی گئی ہے اور سیاسی موضوعات کو بھی اس دور میں جگہ ملی ہے۔ آخری دور میں پریم چند کے یہاں فنی عظمت اور موضوعاتی تنوع نظر آتا ہے۔ اس عہد میں انھوں نے نا قابل فراموش افسانے لکھے۔ ان کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں ان ادوار کو پیش نظر رکھنا ہوگا تبھی اُن کے فن کا صحیح تعین کیا جا سکتا ہے۔

پہلے دور کے ابتدائی افسانوں میں داستانوی اور رومانی رنگ حاوی ہے۔ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر پریم چند اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' کے نام سے 1909ء میں چھپوایا۔ اس مجموعے کی اشاعت انگریز سرکار کو ''خطرہ کی گھنٹی'' محسوس ہوئی۔ اس لیے اس کی تمام کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔ اس کے بعد پریم چند تاریخ اور اصلاح معاشرہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ اس وقت تک وہ افسانوی تکنیک سے نا واقف تھے اور طلسم ہوشربا کے اسیر تھے۔ 1909ء سے 1920ء تک پریم چند ''ہوبا'' کے مقام پر ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز تھے۔ جہاں کے کھنڈرات انہیں ہندوؤں کی عظمتِ گذشتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ حالی کی طرح انہیں بھی اپنے افسانوں کے ذریعہ ہندو قوم کی ماضی کی شان و شوکت اجاگر کرنا چاہیے۔ چنانچہ 1910ء میں ''رانی سارندھا'' 1911ء میں ''راجہ ہردول'' اور 1912ء میں ''آلھا'' جیسے افسانے اسی جذبے کے تحت لکھے گئے۔

پریم چند کے دل میں ہندو راجوں اور رانیوں کی حوصلہ مندی اور خاندانی روایات کی پاسداری کا بڑا احترام تھا۔ ''رانی سارندھا'' میں انہوں نے ہندو قوم کے ماضی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سب افسانوں میں کسی نہ کسی تاریخی واقعہ کو دہرا کر ہندو قوم کو اسلاف کے کارنامے یاد دلانا مقصود ہے۔

ان تاریخی اور نیم تاریخی افسانوں کے بعد اپنے دوسرے دور میں پریم چند نے قومی اور معاشرتی اصلاح کی طرف توجہ دی- انہوں نے ہندو معاشرے کی قبیح رسوم پر قلم اٹھایا اور بیوہ عورت کے مسائل، بے جوڑ شادی، جہیز کی لعنت اور چھوت چھات جیسے موضوعات پر افسانے لکھے۔ اس دور میں وہ ایک مصلح کی حیثیت سے اپنے معاشرے کو احترامِ انسانیت اور مشرقی و مغربی تہذیب کے فرق اور اخلاق اقدار کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

افسانہ نگاری کے دوسرے دور میں پریم چند سیاست کے بکھیڑوں میں الجھ گئے تھے۔ یہ دور برصغیر میں تحریکوں کا دور تھا۔ تحریکِ خلافت، تحریک عدم تعاون، تحریکِ ستہ گرہ، سول نافرمانی وغیرہ۔ برصغیر کے تمام باشندے ملک آزاد کرانے کا مطالبہ کر رہے تھے- پریم چند نے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے قلم کے ذریعہ اس مہم میں شرکت کی ٹھانی اور سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ اگرچہ کوئی سیاسی آدمی نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے باقاعدہ طور پر سیاست میں حصہ لیا۔ لیکن شاید وہ سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ سیاسی موضوعات پر بھی کھل کر اظہارِ خیال کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے سرکاری ملازمت کا جوا گلے سے اتار پھینکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے افسانوں میں سیاست کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

افسانہ نگاری کے دوسرے دور میں پریم چند نے دیہی زندگی کی طرف بھی توجہ دی کیونکہ پریم چند کا تعلق دیہات سے تھا۔ اس لیے انہوں نے دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنے بیشتر افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ دیہاتیوں کے مسائل سے بخوبی آگاہ تھے- اس لیے کسانوں اور مزدوروں کے دکھوں کو اپنے نوکِ قلم سے معاشرے میں اجاگر کرتے ہیں۔ ''پوس کی رات''، ''سوا سیر گیہوں'' اور ان کے دیگر افسانے کسانوں

کی غربت وافلاس کی عکاسی کرتے ہیں۔ پریم چند نے غریب کسان اور کاشتکار کے رہن سہن، اس کے افلاس اور دکھوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ ''سوا سیر گیہوں'' پریم چند کا ایک ایسا افسانہ ہے جو دیہاتی کسان کی سادہ لوحی کے ساتھ ساتھ زمیندار مہاجن اور ساہوکار کی فریب کاری کا پردہ چاک کرتا ہے اور اس کے ظلم وتشدد اور مکر وفریب کے خلاف انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی ''پریم چند کے سب سے اہم پلاٹ وہ ہیں جن میں ہندوستان کے کسانوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ پریم چند نے کسانوں کو ان کی گہری نیند سے بیدار کیا اور یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ اگر دیہات کے باشندے بیدار ہو جاتے ہیں تو ہندوستان کی بیداری یقینی ہے۔''

اس حقیقت سے واقعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معیار ومقدار کے اعتبار سے پریم چند نے اردو ادب میں افسانے کی روایت کو مستحکم کیا اور انہوں نے ہی اردو افسانے کو ارتقائی منازل تک پہنچایا۔ مختصر اردو افسانے کے لیے ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

10.9 فرہنگ

لفظ	:	معنی	لفظ	:	معنی
مفلس		محتاج، غریب	اضطراب		بے چینی
مظلوم		ستایا ہوا	شہادت		گواہی
مصلح		برائیاں دور کرنے والا	نباہ		گزارا
رائج		دستور یا معمول کے مطابق	اثنا		درمیان
تصور		ذہن میں کسی شے کی صورت قائم کر	نافراوانی		کثرت، بہتات
برعکس		الٹا	کم سن		چھوٹی عمر کا، نابالغ
تعلقہ دار		زمیندار، تعلقہ کا مالک	یتیم		وہ بچہ جس کا باپ، ماں یا دونوں فوت ہو گئے ہوں
دستیاب		حاصل	مشقت		محنت، تھکانے والا کام
پرورش		دیکھ بھال، تعلیم وتربیت	دست پناہ		چمٹا
طیش		غصہ، جھنجھلاہٹ	شفقت		مہربانی
کھڑاؤں		لکڑی کا چپل	کمتر		بہت تھوڑا
اجڈ		غیر مہذب، دیہاتی	تحفظ		حفاظت
ضبط		برداشت	علامت		نشان، دلیل
تجسس		تلاش، جستجو	دردزہ		بچہ پیدا ہونے کا

درد

تدفین	دفن کرنا	منہمک	کسی کام میں بہت

مصروف

خدشہ	اندیشہ، کھٹکا	بے بس	لاچار، مجبور
دل خراش	دردناک	اجاگر کرنا	واضح کرنا، نمایاں
عسرت	تنگ دستی	ثانوی	دوسرا
حال پرسی	عیادت، خیریت پوچھنا	شدت	زیادتی، زور
مے خانہ	شراب خانہ	شاہکار	سب سے بہتر

کارنامہ

بے حس	مردوں جیسا	عظمت	بڑائی، قدر و منزلت
کاہلی	سستی	آفاقی	عالمگیر، ہر جائی
آنکھ چرانا	بے مروتی کرنا، کھل کر نہ دیکھنا	المیہ	درد بھرا
کاشتکار	کسان	حسد	جلن
دلدادہ	عاشق، فریفتہ	حیات	زندگی
بغض	نفرت، دشمنی	عزم	ہمت

10.10 کتب برائے مطالعہ

پریم چند فن اور فن کار : پروفیسر جعفر رضا، شبستان، شاہ گنج، الہ آباد، ۱۹۹۹

پریم چند شناسی : پروفیسر آفاق احمد، مدھیہ پردیش اردو اکادیمی، بھوپال، ۱۹۹۴

پریم چند کے نمائندہ افسانے: ڈاکٹر قمر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۰

پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی کے مسائل): خالد حیدر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹

پریم چند کہانی کار رہنما: ڈاکٹر جعفر رضا، لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، ۱۹۶۹ء

پریم چند حیات اور فن: اصغر علی انجینئر، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، دہلی، ۱۹۸۱ء

اکائی 11: پریم چند کی زبان واسلوب

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 زبان واسلوب کی تعریف

11.4 اسلوب کے اقسام اور تشکیل

11.5 پریم چند کی زبان واسلوب

11.5.1 افسانوں میں پریم چند کا اسلوب

11.5.2 ناولوں میں پریم چند کا اسلوب

11.5.3 غیر افسانوی نگارشات میں پریم چند کا اسلوب

11.6 آپ نے کیا سیکھا

11.7 اپنا امتحان خود لیجیے

11.8 سوالات کے جوابات

11.9 فرہنگ

11.10 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ☆ زبان واسلوب کی تعریف کا مطالعہ کریں گے۔
- ☆ اسلوب کے اقسام اور تشکیل کے بارے میں جانیں گے۔
- ☆ پریم چند کی تخلیقات کے اسلوب کا جائزہ لیں گے۔
- ☆ پریم چند کے افسانوی اسلوب سے واقف ہوسکیں گے۔
- ☆ پریم چند کے غیر افسانوی اسلوب سے آگاہ ہوسکیں گے۔

11.2 تمہید

پریم چند کی تمام افسانوی اور غیر افسانوی نگارشات اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں جو خطبۂ صدارت دیا تھا اس میں انھوں نے ادب کی غرض وغایت پر کھل کر بات کی تھی۔ ان کی تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ساری زندگی اسی نظریے کے حامل رہے۔ پریم چند نے اپنے بعض خطوط میں بھی شعر وادب کے مقصد ومنہاج

پر روشنی ڈالی ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرتاً ان کے مزاج میں رومانیت موجود نہ تھی اور نہ وہ حسن وعشق کے قائل تھے۔ان کی زندگی میں تکلفات اور تصنع کا کوئی دخل نہ تھا۔ان کی زندگی کا کافی حصہ دیہاتوں میں گزرا۔وہاں انھوں نے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔وہ عوام کے لیے ادب تخلیق کرتے تھے۔ظاہر ہے عوام سادہ زبان اور عام فہم اسلوب کو سمجھ سکتی ہے۔مشکل وگنجلک زبان اور پیچیدہ اسلوب عوام کے لیے تفہیم میں مسائل پیدا کرتے ہیں۔چوں کہ وہ شعروادب سے سماجی،قومی،اخلاقی،تعلیمی اور اصلاحی کام لینا چاہتے تھے اور تاعمر یہی ان کا مقصد رہا۔اسی لیے انھوں نے تقریباً تمام تحریروں میں روزمرہ کی سادہ زبان اور عام فہم اسلوب اختیار کیا ہے۔اس اکائی ہم ان کی تخلیقات کی زبان کا مطالعہ کریں گے۔

11.3 زبان واسلوب کی تعریف

لفظ اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جو مذکر واحد سے مشتق ہے۔اسلوب (Style) سے مراد کسی مصنف کا طرز بیان یا انداز نگارش ہے جو الفاظ،صوتی آہنگ،محاورات واشارات،جملوں کی ساخت اور زبان وبیان کے خدوخال کو پر تاثیر بناتے ہیں۔اسلوب انگریزی میں لفظ Style کا مترادف ہے اور یونانی زبان میں Stylos اور لاطینی میں Stylus کے ہم معنی ہے۔مختلف ادوار میں ماہرین ادب نے اسلوب کی تعریف کے سلسلے میں اپنی اپنی منفرد رائے قائم کی ہے۔انگریزی ادب کے معروف ادیب سوئفٹ نے مناسب الفاظ کا مناسب جگہوں پر استعمال کو اسلوب مانا ہے۔امریکی انشا پرداز اور شاعر ایمرسن کا خیال ہے کہ ''انسان کا اسلوب اس کی ذہنی آواز ہے۔''انگریزی کے مشہور نقاد مڈلٹن مرے نے اسلوب کے تین معنی واضح کیے ہیں۔پہلا معنی یہ ہے کہ ''اظہار وہ ذاتی انفرادیت ہے جس کی بنا پر ہم کسی مصنف کو پہچان لیتے ہیں۔''دوسرا معنی ''اظہار کا فن'' ہے جبکہ تیسرا معنی میں اسلوب کا مطلب ''اعلیٰ مقصودِ ادب'' ہے۔اردو ادب میں مشہور ومقبول نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے اسلوب کو ''واضح خیال کا موزوں الفاظ میں اظہار'' بتایا ہے۔ان کے خیال میں اسلوب کی جامع تعریف کے لیے ہمیں اس کے تین مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔پہلا تو طریقۂ بیان اور دوسرا حسن بیان اور تیسرا انفرادیت کا حسن'' ہے۔اردو کے نامور ناقد وادیب گوپی چند نارنگ کے مطابق:

> ''شاعر یا مصنف قدم قدم پر پیرایۂ بیان کی آزادی کا استعمال کرتا ہے۔پیرایۂ بیان کی آزادی کا استعمال شعوری بھی کرتا ہے،غیر شعوری بھی۔اس میں ذوق،مزاج،ذاتی پسند وناپسند، صنف یا ہیئت کے تقاضوں نیز قاری کی نوعیت کے تصور کو بھی دخل ہوسکتا ہے۔یعنی تخلیقی اظہار کے ممکنہ امکانات جو وجود میں آچکے ہیں اور جو وقوع پذیر ہوسکتے ہیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا (جن کا اختیار مصنف کرے) دراصل اسلوب ہے۔''

(ادبی تنقید اور اسلوبیات،ص:15)

11.4 اسلوب کی اقسام اور تشکیل

اسلوب کے مفہوم کو اور بہتر طور پر سمجھنے کے لیے اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالنی ہوگی۔اس سلسلے میں ہمیں اسلوب کا مطالعہ دو طریقوں سے کرنا ہوگا جس میں ایک تو ادیب یا شاعر کی اسلوبی خصوصیت کو اہم مانا جاتا ہے اور دوسرا فن پارے کی اسلوبی خصوصیت پر نظر رکھی جاتی ہے۔اس کو ہم ذیل میں بیان کردہ دو طریقوں سے مطالعہ میں شامل کرسکتے ہیں:

(1) تخلیق کار کے اسلوب کا مطالعہ (2) متنی اسلوب کا مطالعہ

اس میں پہلے مطالعہ کی غرض سے تین نمایاں قسمیں ہوتی ہیں:

(1) مکانی اسلوب (2) زمانی اسلوب (3) انفرادی اسلوب

اول مکانی اسلوب (Spatial Style) ادیب اور ادب دونوں کے مطالعہ کے لیے اہمیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو ہم علاقائی اسلوب (Regional Style) اور طبقاتی اسلوب (Social Style) کے زمرے میں منقسم کر سکتے ہیں۔ جب ایک مصنف کسی فن پارہ کی تخلیق کرتا ہے تو وہ اپنے سماج اور علاقہ کی پیروی کرتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہ سماج کا ایک فرد ہے۔ سماج و معاشرہ کے موضوعات، مسائل اور ماحول وغیرہ سے متاثر ہوئے بغیر وہ نہیں رہ سکتا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہو کہ ایک علاقہ کا ادیب دوسرے علاقہ کے ادیب سے منفرد فن پارہ کی تخلیق کرتا ہے خواہ وہ ایک ہی عہد سے وابستہ کیوں نہ ہو کیونکہ مختلف علاقوں کی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج میں فرق ہوتا ہے اور یہی فرق ہمیں ان کی تخلیقات میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور اسی کو ہم علاقائی اسلوب کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً دہلی اور لکھنؤ کی تخلیقات میں علاقائی اعتبار سے فرق نمایاں ہے۔

طبقاتی اسلوب سے مراد یہ ہے کہ کسی دور کا سماج اپنے معاشی نظام زندگی کے لحاظ سے مختلف طبقات میں بٹا ہوتا ہے اور ہر طبقہ کی اپنی اقتصادی ضرورتیں ہوتی ہیں انھیں کی وجہ سے وہ ایک مخصوص تہذیبی اقدار سے منسلک ہوتا ہے اور یہ رشتہ اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ ان قدروں سے اسے جدا کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مخصوص اقدار اس طبقے کی پہچان بن جاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ سماج کے ہر طبقہ کی اپنی ایک الگ تہذیب، رسم و رواج اور قدریں ہوتی ہیں جہاں سے تعلق رکھنے والا ادیب بھی اپنے ادب میں اسی طبقاتی اقدار کا منظر نامہ پیش کرتا ہے اور اسی کو ہم طبقاتی اسلوب (Social Style) کے خانے میں رکھتا ہے۔ مثلاً جس طرح پریم چند نے دیہی طبقاتی نظام کو اپنے افسانوں میں پیش کیا، اسی طرح بیدی نے سکھ و ہندو مذہب کے متوسط طبقے کی کہانیاں لکھیں، عصمت چغتائی نے بھی مسلم متوسط طبقے کی زندگی کو قلمبند کیا، قاضی عبدالستار نے جاگیردارانہ طبقے کی زندگی کی جھلک دکھلائی۔ حقیقت یہی ہے کہ ایک فنکار اپنے عہد کے ماحول اور سماج کی مختلف صورتوں سے متاثر ہو کر ہی اپنی تخلیقات کو جنم دیتا ہے۔

مکانی اسلوب کی ہی ایک قسم کو انفرادی اسلوب کا نام دیا گیا ہے۔ انفرادی اسلوب اسے کہتے ہیں جب ایک فنکار اپنے طبقاتی اور علاقائی سطح کے اسلوب میں اپنے مخصوص و منفرد اسلوب کو یکجا کر دیتا ہے تو اسے ہم انفرادی اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ یہ منفرد اسلوب اس فن کو اور فنکار کو یعنی دونوں کی انفرادیت کو واضح کرتا ہے۔ انفرادی اسلوب کو منظّم اور غیر منظّم اسلوب کے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ منظّم اسلوب میں ایک ترتیب ہوتا ہے جبکہ غیر منظّم اسلوب میں بے ترتیبی دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ ایک ادیب کا اسلوب منظّم اور غیر منظّم دونوں انداز کا ہو سکتا ہے۔

دوسرے طریقہ یعنی کہ متنی اسلوب کو بھی ہم مختلف خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن اس میں ہم موضوع، ہیئت، فارم کو اہمیت دیں گے۔ حالانکہ موضوع کے اعتبار سے اسلوب میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے اس لیے اسلوب کا مطالعہ کرتے وقت موضوع کا مدنظر ہونا بے حد اہم ہے۔ غرضیکہ اسلوب کے مطالعہ میں ہم اسلوب کو مختلف خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جس میں علاقائی اسلوب، طبقاتی اسلوب، عہد ساز اسلوب، منظّم اسلوب، غیر منظّم اسلوب، ہیئتی اسلوب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس تقسیم کی مدد سے اسلوب کے مطالعہ میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اسلوب ایک ایسا طریقہ ہے جس کو خوبصورتی بخشنے میں ادیب کا کردار اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن اسلوب خواہ شعری ہو یا نثری عام طور پر اس کی تشکیل میں دو اہم عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ اول موضوع اور دوم ہیئت۔ اسلوب محض موضوع کی آرائش و زیبائش کا وسیلہ نہیں البتہ یہ

موضوع کوفن میں تبدیل کرنے کا طریقہ ہے۔اس لیے موضوع کے بغیر اسلوب اور اسلوب کے بغیر موضوع کوفن میں پرونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔اسی طرح اسلوب کا ہیئت سے گہرا تعلق ہے۔کسی تخلیق یا تخلیق کار کو ہیئت ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ ہیئت اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔ہیئت کے بغیر اسلوب کا وجود نہیں۔اردو کے تمام اصناف مثلاً غزل،قصیدہ،مثنوی،مرثیہ،رباعی،داستان،ناول،افسانہ، ڈراما،انشائیہ سبھی اپنے موضوع اور ہیئت کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ شناخت رکھتے ہیں۔اگر موضوع اور ہیئت کا تعین نہ کیا جائے تو کوئی بھی فن پارہ فنی کسوٹی پر پورا نہیں اتر پائے گا۔ یہ بات طے ہے کہ اسلوب میں ہیئت اور موضوع کی اپنی شناخت ہے البتہ گردش زمانہ کے ساتھ اگر کوئی صنف جنم لیتی ہے تو اس کے تقاضوں کو پورا کرنے لیے اسلوب میں تبدیلی ممکن ہوگی۔

اسلوب کو تشکیل دینے میں تکنیک کا بھی اہم رول ہے۔کوئی بھی فنکار مواد کو اسلوب سے ہم آہنگ کر کے ایک مخصوص طریقے سے اس کو متشکل کرتا ہے،دراصل یہی تکنیک ہے۔کسی بھی تخلیق میں بیان کردہ واقعہ یا موضوع ایک مخصوص تکنیک کو سامنے لاتا ہے اور فنکار اپنی شعوری کوششوں سے اس کو نکھارتا اور سنوارتا ہے۔ایک سچے فنکار کے اپنے جذبات واحساسات ہوتے ہیں جس کو وہ ذاتی تجربات کی سطح پر لا کر تخلیق میں سمونے کی سعی کرتا ہے۔اس طرح ایک فنکار بڑی ہنرمندی کے ساتھ تکنیک کا استعمال کر کے دوسرے فنکار کے اسلوب سے اپنی انفرادیت قائم کرتا ہے۔

اسلوب میں زبان و بیان کے ساتھ اس کے اظہار اور انتخاب کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ایک فنکار کی اسلوبیاتی شناخت اسی پر بنتی ہے جبکہ ان چیزوں کے انتخاب میں شخصیت اور ماحول وغیرہ کے عناصر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اسلوب کو محض ذریعۂ اظہار نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ یہ تخلیق کار کی فکر کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے اور یہ فکر اس کو اس کے عہد سے میسر ہوتی ہے۔اس کے علاوہ تخلیق کار جب کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اس کے پس پردہ بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں اس کا عہد،شخصیت،سماج،رہن سہن،رسم ورواج،انسانی رویے اور روایات ہوتے ہیں جو اس کے اسلوب کو تشکیل دینے میں معاون ہوتے ہیں۔اسلوب تخلیق کار کی ذہنی کیفیت،اس کے جذبات اور احساسات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔تخلیق کار کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنی تمام تر کیفیات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ تخلیق قاری پر اپنا دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہے۔لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب تمام تر کیفیات حقیقی تجربات ومشاہدات کی روشنی میں موضوع اور اسلوب کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

11.5 پریم چند کی زبان واسلوب

پریم چند کا اسلوب مجموعی وصف وہمہ گیر خصوصیت اس کا جمہوری وعوامی انداز ہے۔اس وصف کی بنا پر ان کا اسلوب اور طرز الگ ہو جاتا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ان کے اسلوب کی یہی خصوصیت انھیں منفرد شناخت دلاتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ پریم چند کے زمانے میں ادب لطیف اور انشائے جمیل اور شعر ومنثور کے لکھنے والے اپنے رنگین شاعرانہ تخیل سے اردو نثر ونظم کے دامن کو سجانے وسنوارنے میں مصروف تھے۔ پریم چند نے اسی رنگین اور مسجع انداز تحریر سے دوری اختیار کی اور تمام رعنائی وزیبائی،صناعی وحسن کاری اور سحر انگیزی سے انحراف کرتے ہوئے سادہ انداز تحریر اختیار کیا۔اپنے گہرے سماجی شعور اور سماجی احساس کے زیر اثر انھوں نے زبان کو اعلیٰ اشخاص وطبقات کی اجارہ داری سے آزادی دلائی اور اسے عام انسانوں کی ملکیت بنایا اور اس طرح وہ ایک جمہوری وعوامی اسلوب کو پیدا کرنے اور پروان چڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ پریم چند کا مخصوص جمہوری وعوامی اسلوب ان کے افسانوں،ناولوں اور غیر افسانوی نگارشات کے جسد میں روح کی طرح سمایا ہوا ہے۔ان کی تخلیقات کے کسی خاص حصے میں نہیں بلکہ مکمل تحریروں میں ایک جیسا ہی انداز تحریر،اسلوب اور زبان دیکھنے کو ملتی ہے۔ پریم چند کی تخلیقات کا مجموعی مطالعہ

کر کے ہی ہم ان کے مخصوص اسلوب سے آشنا ہو سکتے ہیں۔

11.5.1 افسانوں میں پریم چند کا اسلوب

اردو نثر کی تاریخ میں پریم چند کا اسلوب خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔اس اہمیت کا صحیح اندازہ اس دور کے نثری رجحانات سے موازنہ کر کے لگایا جا سکتا ہے۔اس دور میں انشا پردازی، رنگین اسلوب، مرصع و مسجع عبارت، تشبیہات و استعارات کا استعمال وغیرہ عام تھا۔صرف سرسید اور حالی وغیرہ نے سادہ زبان و اسلوب کو فروغ دینے کی کوشش کی۔اس پُر تکلف اور مصنوعی نثر کے برخلاف ایک سادہ اور پُر اثر نثر کو افسانوی ادب میں رائج کرنے کے لیے پریم چند نے جو کردار ادا کیا ہے وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ پریم چند ایسے فنکار ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری کو انشا پردازی نہیں بلکہ ایک مؤثر فن کی حیثیت سے اختیار کیا۔ان کی افسانوی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غضب کی لچک اور توانائی ہے۔ان کے افسانے خوشی اور غم، امید اور نا امیدی، حوصلہ اور ہمت کے گہرے تاثرات قائم کرتے ہیں۔اس اعتبار سے ان کی نثر نرمی، سختی، شگفتگی، کرختگی، پیچیدگی، سادگی، شعریت اور سپاٹ پن کے نئے نئے جلوے دکھاتی ہے۔

پریم چند کے افسانے اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے نئے تہذیبی و لسانی اور ادبی رجحان کا احساس دلاتے ہیں جس میں قدیم روایت کے ساتھ جدید تصورات و افکار اور مختلف تہذیبوں کے عناصر شامل ہیں۔ چونکہ پریم چند سے پہلے اردو زبان و ادب کا دائرہ ایک مخصوص طبقے تک محدود تھا۔خیالات و نظریات اور مسائل کی تکرار سے ادب میں جمود کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ پریم چند نے اردو زبان و ادب کا رشتہ مخصوص طبقے کے بجائے اس سماج سے قائم کیا جو شہر اور دیہات میں رہنے والے مختلف طبقوں، مذہبوں، ذاتوں اور تہذیبی و لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا۔جس کے نتیجے میں ان کے افسانوں میں موضوع و مواد اور زبان و بیان کی سطح پر غیر معمولی تنوع پیدا ہو گیا ہے۔

پریم چند جس دور میں افسانے لکھ رہے تھے اس دور کے سماج میں متوسط طبقہ متحرک اور فعال تھا جس کے اپنے خواب تھے، آرزوئیں اور امنگیں تھیں جو دوسرے طبقوں سے مختلف تھیں اس لئے ان کی زبان اور لب و لہجہ بھی دوسروں سے مختلف تھا جس میں تجسس و تلاش کے ساتھ فکر و عمل، جوش و امنگ، جرأت و حوصلہ، حقیقت اور رجائیت پسندی سے تعلق رکھنے والے الفاظ کی کثرت تھی۔اس طبقے کے ذریعہ جہاں نئی ترکیب وجود میں آ رہی تھی وہیں الفاظ کے معنی میں وسعت بھی پیدا ہو رہی تھی۔متوسط طبقے کے بدلتے ہوئے اقدار نے سماج میں ان کو سب کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں بھی اس نئے اور ابھرتے ہوئے متوسط اور نچلے طبقے کی نفسیات اور زبان کو خصوصی طور پر جگہ دی۔

چونکہ پریم چند کے دور میں ایک نیا متوسط طبقہ بھی جنم لے رہا تھا جو مغربیت سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا تھا۔لہٰذا ان کے یہاں عام زبان، دیہاتی زبان اور سادہ زبان کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔مغربی تہذیب اور جدید تعلیم کے اثرات نے کشمکش کی جو فضا پیدا کی تھی اس نے ایسے اسلوب اور طرز بیان کو جنم دیا جس میں طنز موجود ہے اور استفہامیہ لہجہ بھی۔ یہ اپنے عہد کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کی ذہنی و جذباتی کیفیت کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند کے سیاسی افسانوں کا اسلوب بیان سادگی کے ساتھ ہی بے باکانہ انداز لیے ہوئے ہے۔افسانہ ''جیل'' کا یہ اقتباس اس بات کو ثابت کرتا ہے:

> ''روپ متی نے جوش سے کہا اگر سوراج ملنے پر بھی دولت کو ہی جگہ ملے اور تعلیم یافتہ لوگ سوسائیٹی میں اسی طرح غرض کے بندے بنے رہیں تو سوراج نہ ملنا اچھا۔افسر کے تمول اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خود غرضیوں نے ہمیں پیس ڈالا۔جن برائیوں کو رفع کرنے کے لئے آج ہم جان کو ہتھیلی

پر لئے ہوتے ہیں۔انھیں برائیوں کو کیا ہم اس لئے سر پر چڑھالیں گے کہ وہ بدیشی نہیں سودیشی ہیں۔کم ازکم میرے لئے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں کہ جان کی جگہ گوبند آبیٹھے۔میں سوسائٹی کی حالت دیکھنا چاہتی ہوں جہاں غریب سے غریب آدمی کو پیٹ بھر کر کھانا میسر آسکے۔''

(افسانہ''جیل'')

پریم چند نے اپنے افسانوں میں کثرت سے مقولے بھی استعمال کئے ہیں جس کی وجہ سے نثر میں ایجاز واختصار کے ساتھ حسن وتاثیر میں بھی اضافہ ہوا ہے۔انھوں نے ایسے مقولے استعمال کئے ہیں جو عوامی بول چال کی زبان میں رائج ہیں۔لیکن ان میں ایسے بھی ہیں جو پریم چند کے مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہیں۔جس طرح موضوع کے لحاظ سے ان کے افسانوں کا دائرہ وسیع ہے اسی طرح مقولوں میں بھی وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔وہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے ایسے حساس مبصر ہیں جن کے مقولے حقیقی باتوں کو ظاہر کرتے ہیں جن میں طنز کا عنصر بھی موجود رہتا ہے۔ان کے چند مقولے ملاحظہ فرمائیں:

''مادیت مغربی تہذیب کی روح ہے۔''

''عورت کے آنسو مرد کے غصہ پر روغن کا کام کرتے ہیں۔''

''لوگ دروازہ بند پاکر روزن اور شگاف کی فکر کرتے ہیں۔''

''اہل کمال کی صحبت میں برے بھی بھلے ہوجاتے ہیں۔''

''جب انسان کا دل جلتا ہے تو زبان تک اس کی آنچ آتی ہے۔''

''گھورنا مردوں کی اور لجانا عورتوں کی عادت ہے۔''

بڑوں کے پاس دولت ہوتی ہے، چھوٹوں کے پاس دل ہوتا ہے۔''

پریم چند کے افسانوں میں موجود مذکورہ بالا مقولے نہ صرف نثر کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ قاری کو غور وفکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ان مقولوں کا پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ صرف ایک عبارت میں مصنف تلخ حقیقت کو باآسانی سے پیش کردیتا ہے۔

پریم چند نے اپنے تاریخی افسانوں میں بندیلوں اور راجپوتوں کو موضوع بنایا ہے اور ان کی تہذیب ومعاشرت کی عکاسی کے لئے اگرچہ مخصوص ہندی الفاظ اور اصطلاحات جیسے راجہ رانی، مہاراجہ، کنور، راج ہٹ، مورچھل، ڈھال، تلوار، کٹار، گھڑیال اور پان کا بیڑا جیسے بہت سارے الفاظ استعمال کیے ہیں۔یہ راجپوت جاگیردارانہ نظام کا حصہ تھے۔پریم چند نے ان کی شان وشوکت، اخلاق وکرداراور حریت پسندی کے اظہار کے لیے اردو فارسی الفاظ وتراکیب اور اصطلاحات کو کثرت سے استعمال کیا ہے اسی کے ساتھ ان کے اسلوب بیان میں بھی فارسی انشا پردازی کا اثر نظر آتا ہے۔

تاریخی افسانوں کے برعکس ان کے دیہی افسانوں میں زبان وبیان آسان اور عوام کی زبان سے قریب ہے۔افسانوں میں کسانوں، مزدوروں اور دیگر پسماندہ طبقے کی تہذیب اور معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے ان کے پیشے، اشیا، زراعت اور ماحول کو پیش کرتے ہیں، اس کے ساتھ ہی اس طبقے کی زبان، مقامی اور عوامی بولیوں کے الفاظ اور محاورے بھی ان کی تحریروں کا حصہ بن جاتے ہیں۔پریم چند نے اپنے افسانوں میں واقعات کی پیش کش میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے لیکن کردار نگاری اور مکالمہ نگاری میں حقیقی رنگ بھرنے کے لیے ہندی، اودھی، بھوجپوری اور قنوجی زبان کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ان میں اہم بات یہ ہے کہ جب وہ اردو زبان کے الفاظ کو

غلط یا دیہاتی تلفظ کے ساتھ لکھتے ہیں تو اس سے ان کی معنویت متاثر نہیں ہوتی بلکہ ان میں حقیقی تاثر ضرور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مثلاً تو پھان، آپھت، جمانہ، مجا، جرورت، کھوب، گلامی، مرجی، کسم، گائب، جبردستی، اکل، جراوغیرہ سیکڑوں ایسے الفاظ ہیں جو ان کے کرداروں کی شناخت، ماحول اور فضا کے قیام میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

پریم چند لسانی اصول پرستوں سے آزاد رہ کر لکھتے ہیں۔ انھیں دیہی علاقوں کی زبان، محاوروں اور عام بول چال کے الفاظ سے کوئی پرہیز نہیں ہے۔ وہ ضرورت کے اعتبار سے دلکش تشبیہوں اور حسین تمثیلوں کو اپنی تحریوں کا حصہ بناتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعہ اردو نثر کی اس خوبی کو نمایاں کیا ہے جو فطری اور بے ساختہ ہوتی ہے۔ پریم چند صرف مکالموں میں ہی نہیں بلکہ عام بیانیہ میں بھی بے ساختہ انداز بیان اور عام بول چال کی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''ایک دن میں نے سنا کہ گومتی گنگو کے گھر سے بھاگ گئی۔

کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس خبر سے ایک خاص خوشی ہوئی۔ مجھے گنگو کے اطمینان اور پر عافیت زندگی پر ایک طرح کا رشک آتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کسی رسوا کن سانحے، کسی دل فگار اور تباہ کن تنقید کا منتظر تھا۔ آخر اسے اپنی سہل اعتقادی کا تاوان دینا پڑا۔''

(افسانہ ''معصوم بچہ'')

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیا ناتھ کی کوڑی چت پڑی۔ ماں کا مامتا بھرا دل بیٹے کی مصیبت دیکھ کر کیوں نہ پسیجتا۔ پھول متی یہ داستان سنتے ہی باؤلی ہوگئی اس پر اما ناتھ نے اور بھی ردّا جمایا۔''

(افسانہ ''بدنصیب ماں'')

11.5.2 ناولوں میں پریم چند کا اسلوب

پریم چند کے فن میں تصادم کی مختلف صورتیں اور سطحیں ملتی ہیں جن سے اسلوب متاثر ہوا ہے۔ ان کی نگارشات کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے تجربہ اور تکنیک کی ہم آہنگی اور جذباتی کیفیت نے اسلوب خلق کیا ہے۔ اسی کے بطن سے اسلوب کی شدت، اس کا تیکھا پن، انوکھا پن، اس کی رفعت اور بلندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ پریم کا ادبی سفر جیسے جیسے ترقی کرتا گیا ان کے فن کی ہیئت اور موضوعات میں تبدیلی آتی گئی۔ ان کی زبان و تحریر ارتقا کے مراحل طے کرنے لگی۔ 1904 سے 1912 تک کے ناولوں میں اتنی پختگی نہیں ہے اور زبان و بیان کی کچھ خامیاں بھی ہیں لیکن 1913 سے 1923 تک کے ناولوں میں پختگی کے ساتھ شعور کی بالیدگی اور سنجیدگی بھی نظر آنے لگتی ہے۔ 1924 سے 1936 کے درمیان لکھے گئے ناولوں میں طرز تحریر کے ساتھ زبان و بیان کی دوسری خوبیاں بھی اعلیٰ درجے کو پہنچ گئی ہیں۔

ابتدائی دور کے ناولوں میں ''ہم خرما و ہم ثواب''، ''سوز وطن''، ''جلوۂ ایثار'' اور ''بیوہ'' شامل ہیں۔ ان ناولوں میں تجربات و مشاہدات کا دائرہ محدود ہے۔ اس دور کے ناولوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ جن اشخاص کی متحرک اور واضح تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں ان کی نفسیات، بول چال، رہن سہن اور لب و لہجے کے بارے میں مشاہدہ نہیں ہے صرف کتابی باتوں یا سنی سنائی باتوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کا طرز تحریر رومانی اور تخیلی ہوگیا ہے۔ زندگی کے حقائق سے دور ہو کر اس میں مصنوعی پن جھلکتا ہے۔ اس دور میں قدم قدم پر زبان و بیان کی خامیاں در آئی ہیں۔ انھیں الفاظ کے موزوں استعمال، جملوں کی ترتیب اور محاروں کی نشست کا سلیقہ کم تھا اسی لیے اس دور کے ناول کمزور معلوم

ہوتے ہیں۔

پریم چند کے ناولوں کے دوسرے دور میں ''بازارِحسن''، ''گوشۂ عافیت'' اور ''نرملا'' کو شامل کیا جاسکتا ہے۔اس میں زبان کی سادگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ پختگی اور متانت کا بھی احساس ہوتا ہے۔اس دور کے ناولوں میں جس نوعیت کے موضوعات ہیں اسی ماحول کی زبان استعمال کی گئی ہے۔1914 سے پریم چند نے ہندی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ناولوں میں عربی وفارسی کے الفاظ کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔اسی کے ساتھ ان ناولوں میں پریم چند عام بول چال کے محاورے اور ضرب الامثال ایسی صفائی اور سلاست سے استعمال کرنے لگے تھے کہ زبان میں ایک ادبی رچاؤ، گھلاوٹ اور جامعیت پیدا ہوگئی ہے۔روزمرہ اور رائج محاوروں کے برجستہ اور برمحل استعمال سے پریم چند کی بیانیہ نثر اور مکالموں میں وضاحت اور معنوی کیفیت کا ایسا انداز پیدا ہوگیا ہے جو اس سے پہلے موجود نہیں تھا۔اسی طرح اردو کے ضرب الامثال بھی جس موزونیت اور سلیقہ مندی سے استعمال ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند نے اپنی کاوشوں سے اظہار و بیان کے وسائل پر قدرت حاصل کرلی تھی۔مثلاً ''نرملا'' میں جو کہاوتیں استعمال ہوئی ہیں اس کے کچھ نمونے درج کیے جارہے ہیں:

'مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال'۔'چھاتی پر مونگ دلنا'۔'دائی کے پیٹ چھپانا'۔'اونگھتے کو ٹہلتے کا بہانہ، سینہ پر سانپ لوٹنا'۔'دودھار گائے کی لات بری نہیں لگتی'۔'جیسا تانا بانا ویسی بھرنی'۔'آنکھوں پھوٹی پیر گئی'۔'کل کا بیٹا آج کا سیٹھ'۔'ناٹوں کھیتی بھریوں گھر'۔

پریم چند نے تشبیہات واستعارات کے ذریعہ، کہیں ظرافت کی لطافت اور کہیں طنز کی شدت اور تیکھے پن سے دلچسپی پیدا کی ہے لیکن وہ تشبیہات واستعارات سے زبان کی سجاوٹ کرنے کا کام نہیں لیتے بلکہ ان کے ذریعہ وہ قاری تک باتوں کی ترسیل کرنے، اس کو ذہن نشین کرانے اور موثر بنانے کا کام لیتے ہیں۔عام طور سے تشبیہات روزمرہ کی زندگی بالخصوص دیہات اور کسانوں کی زندگی سے لیتے ہیں۔مثلاً ناول ''گوشۂ عافیت'' میں لکھتے ہیں:

''ان کی حالت اس وقت اس تھکے ماندے ہلوا ہے کی سی ہورہی تھی جس کے بیل کھیت سے دروازے پر آکر بدک گئے ہوں۔''

''پریم شنکر ایک درخت کے نیچے کھڑے مغموم نگاہوں سے موٹر کی طرف تاک رہے تھے جیسے کسی گاؤں کی عورتیں گاؤں کی آخری حد پر کھڑی ہوئی آنسو بھری آنکھوں سے سسرال جانے والی لڑکی کی پالکی کو دیکھتی ہیں۔''

اب ناول ''نرملا'' سے یہ عبارتیں دیکھیں:

''اب وہ ناتمام خواہش نرملا کے دل میں چراغ کی طرح جلنے لگی۔''

''رنگیلی بائی کا کڑا پن پتھر کا نہیں لاکھ کا تھا جو ایک ہی آنچ میں پگھل جاتا ہے۔''

اس طرح کی تشبیہات پریم چند کے داخلی اور خارجی مرقعوں میں ایک کیفیت اور ان کی عبارت میں روانی اور زور پیدا کردیتی ہے۔ناول نگاری کے تیسرے دور میں ''چوگانِ ہستی''، ''پردۂ مجاز''، ''میدانِ عمل'' اور ''گئودان'' فنی نقطۂ نظر سے پریم چند کے اہم ناول ہیں۔ان ناولوں میں شہروں کے ساتھ ہی گاؤں کی زندگی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔یہ وہ دور تھا جب پریم چند سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوکر عوام کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں۔اس کا اثر ان کے فن کے ساتھ زبان و بیان پر بھی دکھائی دیتا ہے۔اس طرح وہ روزمرہ اور عوام کی زبان سے کچھ اور قریب آگئے۔اس دور کے ناولوں میں فارسی اور عربی کے الفاظ کے ساتھ ہی ہندی کے غیر مانوس الفاظ کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ناولوں کے اردو اور ہندی ایڈیشن میں زبان کا بہت کم ہی فرق نظر آتا ہے بلکہ مکالموں کی زبان میں رسم الخط کی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔

پریم چند کے ناولوں میں طرز تحریر کی خوبیاں جو پچھلے دور میں نشو ونما پا رہی تھیں اس دور میں مزید واضح اور نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال معنی آفرینی اور اثر آفرینی میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔ ناولوں میں مکالموں کے ذریعے کرداروں کے باطنی حالات کو ادا کرنے میں پریم چند بہت کامیاب ہوئے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پیچیدہ اور گہرے کیوں نہ ہوں۔ کم سے کم الفاظ میں وہ زیادہ سے زیادہ باتوں کو کہہ دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ ناول ''پردۂ مجاز'' میں منشی بجردھر کا تعارف اس طرح پیش کرتے ہیں:

''آپ ہیں تو راجپوت اپنے کو منشی کہتے اور لکھتے ہیں۔ منشی کے لقب سے آپ کو بڑی محبت ہے۔ کئی سال سے پنشن پاتے ہیں۔ بہت چھوٹے عہدے سے ترقی کرتے کرتے بلآخر آپ تحصیلداری کے منصب پر فائز ہوئے۔ اگر چہ آپ اس عہدے پر تین مہینے سے زیادہ نہیں رہے اور اتنے دن بھی محض قائم مقام رہے۔ پر اپنے کو سابق تحصیلدار صاحب کہتے ہیں۔ اعزاز پا کر آپ خوشی سے اکڑ جاتے ہیں لیکن پنشن تو پچیس ہی روپے ملتی تھی۔ اس لئے تحصیلدار صاحب کو بازار ہاٹ خود ہی جانا پڑتا تھا.... حاکموں نے ان کی کارگزاری کے جو پروانے دئے تھے اور ان کا سرمایۂ حیات تھے، انھیں وہ بڑے غرور سے دوسروں کو دکھاتے۔''

یہاں پریم چند بہت ہی مختصر اور سیدھے سادے انداز میں ایک کردار کے خط وخال، اس کے ماضی وحال، اس کی فکر وذہنیت، مزاج اور طور طریقوں کو متحرک بنا کر سامنے لائے ہیں۔ ہر لفظ کی ایمائیت ہمارے تخیل کو مہمیز کرتی ہے۔

پرم چند کی تحریر کی ایک خاص اور اہم بات یہ ہے کہ وہ کسی پھیلی ہوئی بات کو یا کسی کردار کی کیفیت کو چند الفاظ میں سمیٹ کر قاری کے ذہن نشین کر دیتے ہیں۔ یہی کام وہ اکثر تشبیہوں اور استعاروں سے بھی لیتے ہیں جن کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے ہوتا ہے۔ پریم چند کی تشبیہات میں ایک شاعرانہ رنگ، لطافت، ندرت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''دلی امنگوں کے بہاؤ میں ان کی معصوم عقل کسی پھولوں کی مالا کی طرح بہتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔''

راجہ صاحب اور ان کے مشیر کھڑے حسرت ناک نظروں سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے گویا شمشان میں کھڑے لاش کا جلنا دیکھ رہے ہوں۔''

وہ بڑی بڑی پلکوں سے آنکھیں سے آنکھیں چھپائے۔ بدن چرائے ایک نور سا بکھیرتی ہوئی اس طرح نکل گئی جیسے موسیقی کی تان کان میں آ کر غائب ہو جائے۔''

پریم چند کے اسلوب میں جزئیات نگاری کا بھی خاص دخل ہے۔ جزئیات کی مدد سے وہ اپنی کہانی کے کرداروں کو متحرک بنانے کا کام لیتے ہیں۔ ان کی جزئیات نگاری میں اختصار پایا جاتا ہے یہ ان کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔ پریم چند اپنی کہانی کے کرداروں پر نظر رکھتے ہیں اور انھیں کرداروں کی شخصیت کے پہلوؤں کو ابھارتے ہیں اور قاری کے ذہن میں اس کے تمام پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ ناول ''گئودان'' سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

''مذاق میں غم دور ہو گیا۔ یہی اس کی دوا ہے۔ دھنیا خوش ہو کر روپا کے بال گوندھنے بیٹھ گئی جو بالکل الجھ کر رہ گئے تھے اور ہوری کھلیان چلا۔ کیف آفریں بسنت نکہت، فرحت اور جان

بخشی کا سرمایہ لٹا رہی تھی۔کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی اپنی رسیلی میٹھی اور دل پر اثر ڈالنے والی آواز
سے سوئی ہوئی امیدوں کو جگاتی پھر رہی تھی۔مہوے کی ڈالیوں پر مینوں کی برات سجی بیٹھی تھی۔نیم
اور سرسا اور کروندے اپنی خشبو میں نشہ سا گھول رہتے تھے۔''

مکالموں کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے اس میں روزمرہ کا انداز، سہولت اظہار اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ پریم چند کے یہاں یہ خوبی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ناول میں کرداروں کے جذبات واحساسات اور حرکات وسکنات کو گفتگو کے اندر لانا ہوتا ہے۔مکالموں میں حقیقت اور حسن کاری کا رنگ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ناول نگار نہ صرف زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو بلکہ اس طبقۂ خاص جس کی نمائندگی وہ کررہا ہے، اس کی زبان، محاوروں، اصطلاحوں اور لب ولہجہ پر بھی اسے قدرت حاصل ہو۔ پریم چند کے ناولوں میں مکالموں کی زبان اور ادائیگی کا یہ شعور فنکارانہ طور پر ملتا ہے۔وہ اپنی تحریروں میں دیہات کی زبان، کسانوں کی بولی اور لب ولہجہ کو بہ حسن وخوبی برتتے ہیں۔مثلاً

''کیا کرے گی پوچھ کر۔ایک اکھبار کے دپھتر میں گیا تھا جو چاہے سجادے....تو بات سمجھتی
نہیں بگڑنے لگتی ہے۔'' وہ کہتی ''کھوب سمجھتی ہوں اور اکھبار والے دنگا مچاتے ہیں اور گریبوں کو جیل
لے جاتے ہیں۔''

11.5.3 غیر افسانوی نگارشات میں پریم چند کا اسلوب

پریم چند کی غیر افسانوی نگارشات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس میں بھی انھوں نے سادہ زبان اور عام فہم اسلوب سے کام لیا ہے۔البتہ ان کے بعض ابتدائی مضامین ایسے ہیں جن میں کہیں کہیں رنگین انداز تحریر بھی نظر آتا ہے۔اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ صرف عام فہم انداز میں ہی نہیں لکھتے تھے بلکہ مسجع عبارت لکھنے پر بھی قادر تھے۔ان کا یہ طرز مولوی محمد حسین آزاد کی نثر کی یاد دلاتا ہے۔ مثلاً راجہ ٹوڈرمل پر لکھے گئے سوانحی مضمون سے عبارتیں دیکھیں:

''.....مگر اکبر کا دربار وہ گلشن نہ تھا جس میں کوئی نر اسپاہی یا منشی شہرت یا اعزاز کے پھول چنتا۔''

''....ٹوڈرمل فتح ونصرت کے نقارے بجاتا، اقبال گھوڑے پر سوار دارالخلافہ کو لوٹا۔

''....وہی ایک مرد ہے جس کی شہرت کی چادر بگلے کے پر کی طرح صاف ہے۔

راجہ ٹوڈرمل (1905) رانا پرتاپ سنگھ (1906) اور تامس گینس برو (1907) ایسے سوانحی مضامین ہیں جن کا رنگ اور اسلوب افسانوی انداز کا ہے۔اس میں کہیں کہیں مشکل اور نامانوس الفاظ اور فقرے بھی موجود ہیں۔مثلاً مضمون 'راجہ ٹوڈرمل' میں وہ لکھتے ہیں:

''آخر خدمت گزاران شاہی کا آٹھوں پہر کی دوڑ دھوپ اور دوادوش سے ناک میں دم آ گیا۔''

''یہ اسی کی خرد پژوہی تھی جس نے سارے بنگالہ میں اکبری خطبہ پڑھوایا۔''

یہاں 'دوادوش' اور 'خرد پژوہی' مشکل تراکیب ہیں۔

اپنے ادبی مضمون 'ہندوستان بہ عہد ملکہ وکٹوریہ' میں انھوں نے سادہ اور سلیس ادبی زبان کا استعمال کیا ہے۔موضوع کے اعتبار سے زبان کا برمحل استعمال ان کے یہاں موجود ہے لیکن لہجے میں طنز اور تیکھا پن بھی پایا جاتا ہے۔مثلاً:

''مسٹر دت نے گورنمنٹ کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں پر غیر متعصّبانہ نگاہ ڈالی ہے اور ایسے پُر مغز مشورے دیے ہیں کہ اگر گورنمنٹ ان پر عمل کرے تو واقعی سجگ کا زمانہ آئے گا۔مگر مولوی صاحب نے ابتدا سے انتہا تک ایک گیت گایا ہے۔جو نثر میں ہونے سے بالکل

بدمزہ ہوگیا ہے۔کاش انھیں واقعات پر مولوی صاحب قصیدہ لکھتے تو وہ زیادہ وقعت سے دیکھے جانے کا مستحق ہوتا۔''

مضمون 'خاندان مشترکہ' معاشرتی مضمون ہے جس میں پریم چند کا اسلوب عام فہم اور سادہ ہے۔اپنی بات کو سمجھانے کے لئے انھوں نے مثالیں بھی دی ہیں تا کہ بات کی تفہیم آسانی سے ہو سکے۔اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

''مگر جب ہم ان فائدوں کا ان نقصانات عظیم سے مقابلہ کرتے ہیں جو اس رواج کے باعث پیدا ہو گئے ہیں تو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس رسم کی پابندی ہمارے لیے جاں گزاں ہے۔ایک تجربے کار فلاسفر کا قول ہے کہ جس قوم کے افراد کو سدا خاندانی خوشیاں میسر نہیں ہیں تو وہ کبھی پائے عروج پر نہیں پہنچ سکتی۔اور جس نے یہ کہا بہت ٹھیک کہا ہے کہ ہم لوگ خاندانی مسرتوں سے محروم ہیں۔ہمارے گھروں میں آئے دن بم چخ مچی رہتی ہے۔کبھی ساس بہو سے منھ پھلائے بیٹھی ہے کبھی بہو ساس سے روٹھی ہے، نند اور بھاوج کے جھگڑے ہمارے یہاں گیتوں، رقصوں اور کہانیوں میں عام طور پر مشہور ہے۔اگر گھر میں بیچاری ایک بہو ہے اور مردانے میں دس آدمی تو وہ ان دسوں کی کنیز سمجھی جاتی ہے۔''

پریم چند نہ صرف اپنے مضامین میں سہل انداز اختیار کرتے ہیں بلکہ عام زندگی میں مستعمل زبان کا استعمال بھی کرتے ہیں۔انھوں نے ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں موقع کی مناسبت سے محاوروں کا بھی استعمال کیا ہے۔اپنے مضمون 'آزادی کی لڑائی میں کون آگے' میں لکھتے ہیں:

''ہمارا وکیل سمودائے تو اس سنگرام سے ایسا بھاگ رہا ہے جیسے آدمی کی صورت دیکھتے ہی گیدڑ بھاگے۔ہمارے بڑے سے بڑے نیتا جن کی جوتیوں کے تسمے کھولنے کے لائق بھی یہ لوگ نہیں، دھڑا دھڑ جیلوں میں بند ہو رہے ہیں، پر یہ ہیں کہ اپنے بلوں میں منھ چھپائے پڑے ہیں۔بس ملاّ کی دوڑ مسجد تک۔کچہری گئے اور گھر آئے، انھیں دین و دنیا سے کوئی مطلب نہیں۔اس بے غیرتی کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے!''

مضمون 'ملکانہ راجپوت مسلمانوں کے شدھی' سے ایک مثال ملاحظہ فرمائیں جہاں ہندی اور اردو زبان کی آمیزش اسے مزید پر اثر اور دلچسپ بناتی ہے:

''لیکن با ایں ہمہ ادعائے گائے پروری ہندوؤں نے گورکھشا کی ایسی کوئی مجموعی کوشش نہیں کی جس سے ان دعوے کی عملی تصدیق ہو سکتی۔گورکھشنی سبھائیں قائم کر کے مذہبی مناقشے پیدا کرنا گورکھشا نہیں ہے۔جب ہم دیکھتے ہیں کہ بیلوں کے لئے چارہ میسر نہیں تو گایوں کے لئے (وہ بھی جب لاغر نحیف اور بڈھی ہو جائیں) چارہ بہم پہنچانے کی دقت کا حال کسی کسان سے پوچھئے۔وہ گایوں کو فاقہ کشی سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے بدلے انھیں قصائی کے رندے کے حوالے کر دینا زیادہ شان انسانیت سمجھتا ہے۔''

مضمون 'موجودہ تحریک کے راستے میں رکاوٹیں' میں پریم چند کا انداز نہایت عالمانہ ہے۔اس مضمون میں انھوں نے سادگی سے تو کام لیا ہی ہے لیکن ان کی تحریر بعض جگہ علمی ادبی انداز کی ہوتی ہے حالانکہ یہ ایک سیاسی مضمون ہے لیکن اس میں ادبیت موجود ہے۔اس کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں:

''حفظ جان و مال کا جذبہ ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، یہ انسان کا فطری خاصہ ہے۔انسان ہی کا نہیں، ہر ذی حیات کا۔اپنی بقا اور حفظ حیات کا حس ادنیٰ ترین مخلوق میں بھی پایا جاتا ہے۔انسان میں اپنی بقائے حیات کے ساتھ ساتھ حفظ مال اور ناموس کا خیال بھی شامل ہے۔یہ مت سمجھئے کہ یورپ اور امریکہ میں ہر فرد بشر آزادی کا اتنا دلدادہ ہے کہ اس پر نثار ہونے کو تیار ہے۔ایسے افراد ہر ملک میں گنے گنائے ہی ہوتے ہیں جو اپنے ضمیر کی آزادی کی حفاظت پر اپنا سب کچھ نثار کر دیں۔اگر یہ کیفیت ہوتی تو ان ملکوں میں جبری شمولیت فوج کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔لوگ خود بخود سینہ سپر ہو کر میدان میں جاتے۔''

مجموعی اعتبار سے پریم چند کے افسانے زبان و بیان کے اعتبار سے نئے تہذیبی ولسانی اورادبی رجحان کے ساتھ فن پارے کی پیش کش میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔

11.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

اسلوب وزبان کے بارے میں جانا ہے۔

پریم چند کے اسلوب وزبان سے واقفیت حاصل کی۔

پریم چند کے ناولوں اورافسانوں میں اسلوب وزبان کی خصوصیات سے آپ واقف ہوئے۔

پریم چند کی غیرافسانوی نگارشات میں ان کے اسلوب وزبان کے بارے میں آپ نے جانا۔

11.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔زبان واسلوب سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟تفصیل سے بتائیے۔

2۔اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اقسام پر روشنی ڈالیے۔

3۔پریم چند کے افسانوں میں اسلوبیاتی خصوصیات کی نشاندہی کیجئے۔

4۔ناولوں کے حوالے سے پریم چند کی اسلوبیاتی خصوصیات بتائیے۔

5۔غیرافسانوی نگارشات میں پریم چند کے زبان واسلوب کی انفرادیت بتائیے۔

11.8 سوالات کے جوابات

جواب1۔ لفظ اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جو مذکر واحد سے مشتق ہے۔اسلوب (Style) سے مراد کسی مصنف کا طرز بیان یا انداز نگارش ہے جو الفاظ،صوتی آہنگ،محاورات واشارات،جملوں کی ساخت اورزبان و بیان کے خدوخال کو پر تاثیر بناتا ہے۔ اسلوب انگریزی کے لفظ Style کا مترادف ہے اور یونانی زبان میں Stylos اور لاطینی میں Stylus کے ہم معنی ہے۔مختلف ادوار میں ماہرین ادب نے اسلوب کی تعریف کے سلسلے میں اپنی اپنی منفرد رائے قائم کی ہے۔انگریزی ادب کے معروف ادیب سوئفٹ نے مناسب الفاظ کا مناسب جگہوں پر استعمال کو اسلوب مانا ہے۔امریکی انشاپرداز اور شاعر ایمرسن کا خیال ہے کہ ''انسان کا اسلوب اس کی ذہنی آواز ہے۔'' انگریزی کے مشہور نقاد مڈلٹن مرے نے اسلوب کے تین معنی واضح کیے ہیں۔پہلا معنی یہ ہے کہ ''اظہار وہ ذاتی انفرادیت ہے جس کی بنا پر ہم کسی مصنف کو پہچان لیتے ہیں۔'' دوسرا معنی ''اظہار کا فن'' ہے جبکہ تیسرے معنی میں اسلوب کا مطلب ''اعلیٰ مقصودِ ادب'' ہے۔اردو ادب میں مشہور و مقبول نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے اسلوب کو ''واضح خیال کا موزوں الفاظ میں اظہار'' بتایا ہے۔

جواب2۔ اسلوب کے مفہوم کو اور بہتر طور پر سمجھنے کے لیے اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالنی ہوگی۔اس سلسلے میں ہمیں اسلوب کا مطالعہ دو طریقوں سے کرنا ہوگا جس میں ایک تو ادیب یا شاعر کی اسلوبی خصوصیت کو اہم مانا جاتا ہے اور دوسرا فن پارے کی اسلوبی خصوصیت پر نظر رکھی جاتی ہے۔اس کو ہم ذیل میں بیان کردہ دو طریقوں سے مطالعہ میں شامل کر سکتے ہیں:

(۱) تخلیق کار کے اسلوب کا مطالعہ (۲) متنی اسلوب کا مطالعہ

اس میں پہلے مطالعہ کی غرض سے تین نمایاں قسمیں ہوتی ہیں:

(۱) مکانی اسلوب (۲) زمانی اسلوب (۳) انفرادی اسلوب

اول مکانی اسلوب (Spatial Style) ادیب اور ادب دونوں کے مطالعہ کے لیے اہمیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو ہم علاقائی اسلوب (Regional Style) اور طبقاتی اسلوب (Social Style) کے زمرے میں منقسم کر سکتے ہیں۔ جب ایک مصنف کسی فن پارہ کی تخلیق کرتا ہے تو وہ اپنے سماج اور علاقہ کی پیروی کرتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہ سماج کا ایک فرد ہے۔ سماج و معاشرہ کے موضوعات، مسائل اور ماحول وغیرہ سے متاثر ہوئے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایک علاقہ کا ادیب دوسرے علاقہ کے ادیب سے منفرد فن پارہ کی تخلیق کرتا ہے خواہ وہ ایک ہی عہد سے وابستہ کیوں نہ ہو کیونکہ مختلف علاقوں کی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج میں فرق ہوتا ہے اور یہی فرق ہمیں ان کی تخلیقات میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور اسی کو ہم علاقائی اسلوب کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً دہلی اور لکھنؤ کی تخلیقات میں علاقائی اعتبار سے فرق نمایاں ہے۔

طبقاتی اسلوب سے مراد یہ ہے کہ کسی دور کا سماج اپنے معاشی نظام زندگی کے لحاظ سے مختلف طبقات میں بٹا ہوتا ہے اور ہر طبقہ کی اپنی اقتصادی ضرورتیں ہوتی ہیں انھیں کی وجہ سے وہ ایک مخصوص تہذیبی اقدار سے منسلک ہوتا ہے اور یہ رشتہ اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ ان قدروں سے اسے جدا کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مخصوص اقدار اس طبقے کی پہچان بن جاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ سماج کے ہر طبقہ کی اپنی ایک الگ تہذیب، رسم و رواج اور قدریں مختص ہو جاتی ہیں جہاں سے تعلق رکھنے والا ادیب بھی اپنے ادب میں اسی طبقاتی اقدار کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اسی کو ہم طبقاتی اسلوب (Social Style) کے خانے میں رکھتے ہیں۔ مثلاً جس طرح پریم چند نے دیہی طبقاتی نظام کو اپنے افسانوں میں پیش کیا، اسی طرح بیدی نے سکھ و ہندو مذہب کے متوسط طبقے کی کہانیاں لکھیں، عصمت چغتائی نے بھی مسلم متوسط طبقے کی زندگی کو قلم بند کیا، قاضی عبدالستار نے جاگیردارانہ طبقے کی زندگی کی جھلک دکھلائی۔ حقیقت یہی ہے کہ ایک فنکار اپنے عہد کے ماحول اور سماج کی مختلف صورتوں سے متاثر ہو کر ہی اپنی تخلیقات کو جنم دیتا ہے۔

جواب 3۔ پریم چند کے افسانے اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے نئے تہذیبی و لسانی اور ادبی رجحان کا احساس دلاتے ہیں جس میں قدیم روایت کے ساتھ جدید تصورات و افکار اور مختلف تہذیبوں کے عناصر شامل ہیں۔ چونکہ پریم چند سے پہلے اردو زبان و ادب کا دائرہ ایک مخصوص طبقے تک محدود تھا جن کے خیالات و نظریات اور مسائل کی تکرار نے ادب میں جمود کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ پریم چند نے اردو زبان و ادب کا رشتہ مخصوص طبقے کے بجائے اس ترقی پذیر سماج سے قائم کیا جو شہر اور دیہات میں رہنے والے مختلف طبقوں، مذہبوں، ذاتوں اور تہذیبی و لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا جن کی وجہ سے ان کے افسانوں میں موضوع و مواد اور زبان و بیان کی سطح پر غیر معمولی تنوع پیدا ہو گیا۔

چونکہ پریم چند کے دور میں ایک نیا متوسط طبقہ بھی جنم لے رہا ہے جو مغربیت سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے لہٰذا ان کے یہاں عام زبان، دیہاتی زبان اور سادہ زبان کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ مغربی تہذیب اور جدید تعلیم کے اثرات نے کشمکش کی جو فضا پیدا کی تھی اس نے ایسے اسلوب بیان کو جنم دیا جس میں طنز بھی موجود ہے اور استفہامیہ لب و لہجہ۔ یہ اپنے عہد کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کی ذہنی و جذباتی کیفیت کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتے ہیں۔ پریم چند کے سیاسی افسانوں کا اسلوب بیان سادگی کے ساتھ ہی بے باکانہ انداز لیے ہوئے ہے۔ افسانہ ''جیل'' کا یہ اقتباس اس بات کو ثابت کرتا ہے:

''روپ متی نے جوش سے کہا اگر سوراج ملنے پر بھی دولت کو ہی جگہ ملے اور تعلیم یافتہ لوگ سوسائیٹی میں اسی طرح غرض کے بندے بنے رہیں تو سوراج نہ ملنا اچھا۔ افسر کے تمول اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خودغرضیوں نے ہمیں پیس ڈالا۔ جن برائیوں کو رفع کرنے کے لئے آج ہم جان کو ہتھیلی پر لئے ہیں۔ انھیں برائیوں کو کیا ہم اس لئے سر پر چڑھالیں گے کہ وہ بدیشی نہیں، سودیشی ہیں۔ کم ازکم میرے لئے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں کہ جان کی جگہ گوبند آ بیٹھے۔ میں سوسائیٹی کی ایسی حالت دیکھنا چاہتی ہوں جہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی پیٹ بھر کر کھانا میسر آ سکے۔''

(افسانہ ''جیل'')

پریم چند نے اپنے افسانوں میں کثرت سے مقولے بھی استعمال کئے ہیں جن کی وجہ سے نثر میں ایجاز واختصار کے ساتھ حسن وتاثیر میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے ایسے مقولے استعمال کئے ہیں جو عوامی بول چال کی زبان میں رائج ہیں۔ لیکن ان میں ایسے بھی ہیں جو پریم چند کے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر افسانوں کا حصہ ہیں۔ جس طرح موضوع کے لحاظ سے ان کے افسانوں کا دائرہ وسیع ہے اسی طرح مقولوں میں بھی وسعت پائی جاتی ہے۔ وہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے ایسے حساس مبصر ہیں جن کے مقولے حقیقی باتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور اس میں طنز کا عنصر بھی موجود رہتا ہے۔ ان کے چند مقولے ملاحظہ فرمائیں:

''مادیت مغربی تہذیب کی روح ہے۔''

''عورت کے آنسو مرد کے غصہ پر روغن کا کام کرتے ہیں۔''

''لوگ دروازہ بند پا کر روزن اور شگاف کی فکر کرتے ہیں۔''

جواب 4۔ پریم چند کے فن میں تصادم کی مختلف صورتیں اور سطحیں ملتی ہیں جن سے اسلوب متاثر ہوا ہے۔ ان کی نگارشات کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے تجربہ اور تکنیک کی ہم آہنگی اور جذباتی کیفیت نے اسلوب خلق کیا ہے۔ اسی کے بطن سے اسلوب کی شدت، اس کا تیکھاپن اور انوکھاپن اور اس کی رفعت و بلندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ پریم چند کا ادبی سفر جیسے جیسے ترقی کرتا گیا ان کے فن کی ہیئت اور موضوعات میں تبدیلی آتی گئی۔ جس سے ان کی زبان وتحریر میں تدریجی ارتقا دیکھنے کو ملتا ہے۔ 1904 سے 1912 تک کے ناولوں میں اتنی پختگی نہیں ہے اور زبان و بیان کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ 1913 سے 1923 تک کے ناولوں میں پختگی کے ساتھ شعور کی بالیدگی اور سنجیدگی بھی نظر آنے لگتی ہے۔ 1924 سے 1936 کے درمیان لکھے گئے ناولوں میں طرز تحریر کے ساتھ زبان و بیان کی دوسری خوبیاں بھی اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی ہیں۔

ابتدائی دور کے ناولوں میں ''ہم خرما وہم ثواب''، ''سوز وطن''، ''جلوۂ ایثار'' اور ''بیوہ'' شامل ہیں۔ ان ناولوں میں تجربات ومشاہدات کا دائرہ محدود ہے۔ اس دور کے ناولوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جن اشخاص کی متحرک اور واضح تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں ان کی نفسیات، بول چال، رہن سہن اور لب و لہجے کے بارے میں انھیں مشاہدہ نہیں ہے، صرف کتابی باتوں یا سنی سنائی باتوں پر اکتفا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کا طرز تحریر رومانی اور تخیلی ہوگیا ہے۔ زندگی کے حقائق سے دور ہوکر اس میں مصنوعی پن جھلکتا ہے۔ اس دور میں قدم قدم پر زبان و بیان کی خامیاں بھی موجود ہیں۔ انھیں الفاظ کے موزوں استعمال، جملوں کی ترتیب اور محاروں کی نشست کا سلیقہ کم تھا اس لئے اس دور کے ناول کمزور معلوم ہوتے ہیں۔

پریم چند کے ناولوں کے دوسرے دور میں ''بازارحسن، گوشۂ عافیت'' اور ''نرملا'' کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ان میں زبان کی سادگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ پختگی اور متانت کا بھی احساس ہوتا ہے۔اس دور کے ناولوں میں جس پس منظر کے موضوعات ہیں اسی ماحول کی زبان استعمال ہوئی ہے۔ 1914 سے پریم چند نے ہندی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ناولوں میں عربی و فارسی کے الفاظ کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔اسی کے ساتھ ان ناولوں میں پریم چند عام بول چال کے محاورے اور ضرب الامثال ایسی چستی صفائی اور صحت سے استعمال کرنے لگے تھے کہ زبان میں ایک ادبی رچاؤ، گھلاوٹ اور جامعیت پیدا ہوگئی۔روزمرہ اور چلتے ہوئے محاوروں کے برجستہ اور برمحل استعمال سے پریم چند کی بیانیہ نثر اور مکالموں میں وضاحت اور معنوی کیفیت کا ایسا انداز پیدا ہوگیا ہے جو اس سے پہلے موجود نہیں تھا۔اسی طرح اردو کے ضرب الامثال بھی جس موزونیت اور سلیقہ مندی سے استعمال ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند نے اپنی کاوشوں سے اظہار و بیان کے وسائل پر قدرت حاصل کر لی تھی۔مثلاً ''نرملا'' میں کہاوتیں استعمال ہوئی ہیں:

'مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال'۔'چھاتی پر مونگ دلنا'۔'دائی کے پیٹ چھپانا'۔'اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، سینہ پر سانپ لوٹنا'۔'دودھار گائے کی لات بری نہیں لگتی'۔'جیسا تانا بانا ویسی بھرنی'۔'آنکھوں پھوٹی پیر گئی'۔'کل کا بیٹا آج کا سیٹھ'۔'ناٹوں کھیتی بھریوں گھر'۔

مکالموں کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے اس میں روزمرہ کا انداز، سہولت اظہار اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔پریم چند کے یہاں یہ خوبی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ناول میں کرداروں کے جذبات و احساسات اور حرکات و سکنات کو گفتگو کے اندر لانا ہوتا ہے۔مکالموں میں حقیقت اور حسن کاری کا رنگ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ناول نگار نہ صرف زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو بلکہ اس طبقۂ خاص جس کی نمائندگی وہ کر رہا ہے، اس کی زبان، محاوروں، اصطلاحوں اور لب ولہجہ پر بھی اسے قدرت حاصل ہو۔پریم چند کے ناولوں میں مکالموں کی زبان اور ادائیگی کا یہ شعور فنکارانہ طور پر ملتا ہے۔وہ اپنی تحریروں میں دیہات کی زبان، کسانوں کی بولی اور لب ولہجہ کو بہ حسن وخوبی برتتے ہیں۔مثلاً

''کیا کرے گی پوچھ کر۔ایک اکھبار کے دپھتر میں گیا تھا جو چاہے سجا دے....تو بات سمجھتی نہیں بگڑنے لگتی ہے۔'' وہ کہتی ''کھوب سمجھتی ہوں اور اکھبار والے دنگا مچاتے ہیں اور گریبوں کو جیل لے جاتے ہیں۔''

جواب 5۔ پریم چند کے غیر افسانوی نگارشات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس میں بھی انھوں نے سادہ زبان اور عام فہم اسلوب سے کام لیا ہے۔البتہ ان کے بعض ابتدائی مضامین ایسے ہیں جن میں کہیں کہیں رنگین انداز تحریر بھی نظر آتا ہے۔اس سے یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ وہ صرف عام فہم انداز میں ہی نہیں لکھتے تھے بلکہ ان میں رنگین انداز تحریر کی صلاحیتیں بھی اعلیٰ درجے کی تھیں۔مثلاً راجہ ٹوڈرمل پر لکھے گئے سوانحی مضمون سے عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

''.....مگر اکبر کا دربار وہ گلشن نہ تھا جس میں کوئی نر اسپاہی یا منشی شہرت یا اعزاز کے پھول چنتا۔''

''....ٹوڈرمل فتح ونصرت کے نقارے بجاتا، اقبال گھوڑے پر سوار دارالخلافہ کو لوٹا۔

''....وہی ایک مرد ہے جس کی شہرت کی چادر بگلے کے پر کی طرح صاف ہے۔

راجہ ٹوڈرمل (1905) رانا پرتاپ سنگھ (1906) اور تامس گینس برو (1907) ایسے سوانحی مضامین ہیں جن کا رنگ اور اسلوب افسانوی انداز کا ہے۔اس میں کہیں کہیں مشکل اور نامانوس الفاظ اور فقرے بھی موجود ہیں۔مضمون 'راجہ ٹوڈرمل' میں لکھتے ہیں:

''آخر خدمت گزار ان شاہی کا آٹھوں پہر کی دوڑ دھوپ اور دوادوش سے ناک میں دم آ گیا۔''

''یہ اسی کی خرد پژوہی تھی جس نے سارے بنگالہ میں اکبری خطبہ پڑھوایا۔''

یہاں 'دوادوش' اور 'خرد پژوہی' مشکل تراکیب ہیں۔

اپنے ادبی مضمون 'ہندوستان بعہد ملکہ وکٹوریہ' میں انھوں نے سادہ اور سلیس ادبی زبان کا استعمال کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے زبان کا برمحل استعمال ان کے یہاں موجود ہے لیکن لہجے میں طنز اور تیکھا پن بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

''مسٹر دت نے گورنمنٹ کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں پر غیر متعصّبانہ نگاہ ڈالی ہے اور ایسے پُر مغز مشورے دیے ہیں کہ اگر گورنمنٹ ان پر عمل کرے تو واقعی سجگ کا زمانہ آئے گا۔ مگر مولوی صاحب نے ابتدا سے انتہا تک ایک گیت گایا ہے۔ جونئر میں ہونے سے بالکل بدمزہ ہو گیا ہے۔ کاش انھیں واقعات پر مولوی صاحب قصیدہ لکھتے تو وہ زیادہ وقعت سے دیکھے جانے کا مستحق ہوتا۔''

مضمون 'خاندان مشترکہ' معاشرتی مضمون ہے جس میں پریم چند کا اسلوب عام فہم اور سادہ ہے۔ اپنی بات کو سمجھانے کے لئے انھوں نے مثالیں بھی دی ہیں تاکہ ترسیل میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ اس کی مثال دیکھیں:

''مگر جب ہم ان فائدوں کا ان نقصانات عظیم سے مقابلہ کرتے ہیں جو اس رواج کے باعث پیدا ہو گئے ہیں تو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس رسم کی پابندی ہمارے لیے جاں گزاں ہے۔ ایک تجربے کار فلاسفر کا قول ہے کہ جس قوم کے افراد کو سدا خاندانی خوشیاں میسر نہیں ہیں تو وہ کبھی پائے عروج پر نہیں پہنچ سکتی۔ اور جس نے یہ کہا بہت ٹھیک کہا ہے کہ ہم لوگ خاندانی مسرتوں سے محروم ہیں۔ ہمارے گھروں میں آئے دن بم چخ مچی رہتی ہے۔ کبھی ساس بہو سے منھ پھلائے بیٹھی ہے کبھی بہو ساس سے روٹھی ہے، نند اور بھاوج کے جھگڑے ہمارے یہاں گیتوں، رقصوں اور کہانیوں میں عام طور پر مشہور ہے۔ اگر گھر میں بیچاری ایک بہو ہے اور مردانے میں دس آدمی تو وہ ان دسوں کی کنیز سمجھی جاتی ہے۔''

پریم چند نہ صرف اپنے مضامین میں سہل انداز اختیار کرتے ہیں بلکہ عام زندگی میں مستعمل زبان کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں موقع کی مناسبت سے محاوروں کا بھی استعمال کیا ہے۔ اپنے مضمون 'آزادی کی لڑائی میں کون آگے' میں لکھتے ہیں:

''ہمارا وکیل سمودائے تو اس سنگرام سے ایسا بھاگ رہا ہے، جیسے آدمی کی صورت دیکھتے ہی گیدڑ بھاگے۔ ہمارے بڑے سے بڑے نیتا جن کی جوتیوں کے تسمے کھولنے کے لائق بھی یہ لوگ نہیں، دھڑا دھڑ جیلوں میں بند ہو رہے ہیں، پر یہ ہیں کہ اپنے بلوں میں منھ چھپائے پڑے ہیں۔ بس ملاّ کی دوڑ مسجد تک۔ کچہری گئے، اور گھر آئے، انھیں دین و دنیا سے کوئی مطلب نہیں۔ اس بے غیرتی کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے!''

11.9 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
غرض وغایت	مقصد	تصنع	بناوٹ
ادب لطیف	تخیلاتی نثر	منہاج	راستہ
جسد	جسم	گنجلک	الجھاؤ
تفہیم	سمجھانا	خرد پژوہی	فکر کرنا، تلاش کرنا
دوادوش	دوڑ دھوپ	بم چخ	شور وغُل
کنیز	ملازمہ	مسرت	خوشی

ناموس	عزت	بشر	انسان
سینہ سپر	مقابل ہوکر	شمولیت	شامل ہونا
مناقشے	باہمی لڑائی	نحیف	کمزور، ناتواں
تدریجی	درجہ بہ درجہ بڑھنا	مشاہدہ	عینی تجربہ
ذی حیات	جاندار	متانت	سنجیدگی
ضرب الامثال	کہاوتیں	عہد	زمانہ
دارالخلافہ	دارالحکومت	خدوخال	شکل وصورت
آرائش	سجاوٹ	مہمیز	تحریک، ترغیب
شناخت	پہچان	وصف	خوبی
گردش	گھماؤ	انحراف	انکار
تقاضا	مانگ	مسجع	ہم وزن وہم قافیہ نثری عبارت
ذاتی	نجی	سحرانگیز	متاثر کرنے والا
استفہامیہ	سوالیہ جملہ یا فقرہ	روغن	گھی، چکنائی
زراعت	کھیتی باڑی	رفعت	بلندی

11.10 کتب برائے مطالعہ

ڈاکٹر قمر رئیس — مضامین پریم چند، یونیورسٹی پبلشر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1960ء

عتیق احمد — مضامین پریم چند، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 1981ء

سید محمد عصیم — پریم چند کا فنی وفکری مطالعہ، ترکمان گیٹ، دہلی، 1984ء

ڈاکٹر جعفر رضا — پریم چند کہانی کار رہنما، لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، 1969ء

اصغر علی انجینئر — پریم چند حیات اور فن، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، دہلی، 1981ء

پروفیسر علی احمد فاطمی — پریم چند نئے تناظر میں، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 2006ء

پرکاش چندر گپتا — پریم چند، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1992ء

محمد اکبرالدین صدیقی — پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری، دفتر انجمن عثمانیہ، حیدرآباد، دکن، 1954ء

اکائی:13 پریم چند کی صحافت نگاری

13.1 اغراض ومقاصد
13.2 تمہید
13.3 صحافت کی تعریف اور جہتیں
13.4 اردو صحافت کا آغاز وارتقا
13.5 پریم چند کی صحافت نگاری
13.6 آپ نے کیا سیکھا
13.7 اپنا امتحان خود لیجئے
13.8 سوالات کے جواب
13.9 فرہنگ
13.10 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم اردو صحافت کی تعریف جانیں گے۔
اس اکائی میں ہم اردو صحافت کے آغاز وارتقا پر گفتگو کریں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کی مختلف رسالوں کے وابستگی کے متعلق جانیں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کی صحافت نگاری پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کی مختلف اخبار ورسائل میں خدمات کا جائزہ لیں گے۔

13.2 تمہید

پریم چند کو اردو ادب میں 'اپنیاس سمراٹ' یعنی 'ناول کے بادشاہ' کا درجہ دیا جاتا ہے۔انھوں نے اردو ادب کی بہت خدمت کی۔اردو کی نثری اصناف میں ان کا ادبی کارنامہ کثیر تعداد میں ہے۔انھوں نے افسانے، ناول، ڈرامے، اداریے، مضامین اور خطوط وغیرہ لکھے۔ان سبھی تخلیقات کے مطالعہ سے ان کے ادبی سرمایے کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے اور ساتھ ہی ان کی عظمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔نثری اصناف کے ساتھ ہی پریم چند نے اردو صحافت میں بھی اہم کردار ادا کیا۔کسی بھی ملک کی ترقی کے لئے صحافت کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ملک کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی حالات صحافت کے ذریعہ ہی منظر عام پر آتے ہیں اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو صحافت ملک کی تاریخی بقا میں

بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بہت سارے ایسے واقعات ہوتے ہیں جنھیں لوگ وقت کے ساتھ فراموش کر دیتے ہیں لیکن صحافت کے ذریعہ وہ محفوظ رہتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایک صحافی اپنے زمانے اور اس میں پیدا شدہ حالات کو مختلف زاویوں سے دیکھتا اور پرکھتا ہے اور ہم عصر زمانے کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی ضمن میں اخبار کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ وہ نہ صرف خبر کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ ملک وقوم کی اصلاح اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کوشاں رہتے ہیں اور اہم رول ادا کرتے ہیں۔ صحافت کے اوپر ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ اس کا کام صرف اتنا نہیں ہے کہ خبریں جمع کر کے شائع کر دے یا نشر کر دے بلکہ صداقت کے ساتھ خبریں عوام تک پہنچیں یہ اہم کام ہے۔ صحافت ادب، سیاست، کھیل، حکموت، سماج، ماحولیات، جغرافیہ، اقتصادیات وعمرانیات غرضیکہ ہر شعبے کو سمیٹتی ہے اس لئے اس کا کام سخت دشوار ہے۔ صحافت کی انھیں ذمہ داریوں کے مدنظر اس کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

13.3 صحافت کی تعریف اور جہتیں

اردو زبان میں مستعمل لفظ ''صحافت'' عربی زبان کے لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی صفحہ، کتاب یا رسالے کے ہیں۔ لفظ ''صحف'' سے بنا ہے ''صحیفہ'' جس کے معنی کتاب یا رسالہ، لکھا ہوا، خط، یا مکتوب کے ہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق ''صحیفہ کے لغوی معنی وہ چیز ہے جس پر لکھا جا سکے، اسی مناسبت سے روق کی ایک جانب یعنی صفحہ کو بھی صحیفہ کہتے ہیں۔ جدید عربی میں صحیفہ بمعنی جریدہ اور اخبار بھی مستعمل ہے۔ قرآن مجید میں نامۂ اعمال، خط یا مکتوب، حکم نامہ یا فرمان اور کتب آسمانی، سچے رسولوں پر نازل کی جانے والی کتابوں اور احکام وہدایات کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔''

علمی اردو لغت (جامع) از وارث سرہندی میں اس لفظ سے مراد ''صحیفہ سے مراد کتاب، رسالہ، لکھا ہوا، اخبار، کتابچہ، وہ مختصر کتابیں جو بعض پیغمبروں پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔''

پروفیسر عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب ''فن صحافت'' میں لکھا ہے کہ ''صحیفے سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے، چنانچہ تمام اخبارات ورسائل صحیفے ہیں اور جو لوگ اس کی ترتیب وتحسین اور تحریر سے وابسہ ہیں انھیں صحافی کہا جاتا ہے اور ان کے پیشے کو ''صحافت'' کا نام دیا گیا ہے۔''

انگریزی زبان میں یہ لفظ Journal سے ماخوذ ہے۔ لفظ Journal لاطینی (Latin) زبان کے لفظ Diurnails سے مشتق کے جس کے معنی روزنامچہ یا روز کے حساب یا کھاتے سے لیا جاتا ہے۔ یعنی کہ ایک روز کے میں جتنی بھی باتیں یا واقعات ہوں اس کی تحریری شکل کو کہا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی تک آتے آتے انگریزی زبان میں روزمرہ کی خبروں کے لئے Journalism لفظ کا استعمال ہونے لگا۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ صحافت ہم سے کہتے ہیں جس میں تحقیق کر کے روزمرہ کی خبروں کو صوتی، بصری یا تحریری شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے یا قارئین، سامعین یا ناظرین تک اس کی ترسیل کرنے کے عمل کو صحافت کہا جاتا ہے اور یہ خبریں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتی ہیں۔

جدید دور سائینس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ نئی نئی ایجادات سے زندگی کے تمام شعبوں میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں زندگی آسان بھی ہوئی ہے تبدیل بھی ہوتی جا رہی ہے۔ صحافت کے شعبے میں بھی جدید دور کے ساتھ بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلے زمانے میں بادشاہوں اور حکمرانوں کو ملک کے مختلف علاقوں میں ہونے والے واقعات سے باخبر رکھنے کے لئے ہرکاروں اور وقائع نگاروں کا اہتمام کیا جاتا تھا جو ساری خبریں بادشاہ کے دربار تک ارسال کرتے تھے اور حالات وواقعات سے صرف درباری لوگ یا اہل

اقتدار ہی مستفید ہوتے تھے لیکن جدید دور میں ایسے ذرائع ابلاغ موجود ہیں جن سے چند لمحوں میں ہی کوئی بھی خبر ہر طبقے کے لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔موجودہ دور میں صحافت کی کئی جہتیں ہیں جنھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔مطبوعہ صحافت(Printed Journalism)

2۔برقی صحافت(Electronic Journalism)

مطبوعہ صحافت سے مراد خبروں کا کاغذ پر چھپی ہوئی شکل میں ترسیل ہونا ہے۔اس کے اندر روزنامچہ،ہفت روزہ اخبار،علمی و ادبی مجلّے، پیشہ وارانہ رسالے، سہہ ماہی اور سالانہ جریدے اور طباعتی صحافت میں پوسٹرز(Posters)، اسٹیکرز (Stickers)، ہینڈ بلز (Hand bills)، ٹی بورڈز (T-boards) وغیرہ کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ برقی صحافت میں ریڈیو،ٹیلیویژن،فلم، وی۔سی۔آر۔،سلائیڈرز اور ہینڈ پروجیکٹر کو شامل کیا جاتا ہے۔مطبوعہ صحافت میں روزانہ اخبارات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔دنیا بھر میں روزانہ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں سینکڑوں زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں۔اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ روز کی خبریں مطبوعہ شکل میں اخباروں میں مل جاتی ہیں۔آج کے دور میں پوری دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے قریب ہو گئے ہیں۔ ہر ملک کے حالات و واقعات اخباروں میں شائع کئے جاتے ہیں۔ دور دراز کے مملاک کی خبریں حاصل کرنا اور ان کے بارے میں جاننے کا اشتیاق عوام میں پیدا ہوا ہے۔اس طرح مختلف ممالک میں رہنے والے لوگ ایک خاندان کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔مطبوعہ صحافت میں روزانہ نکلنے والے اخبارات اسی لئے بہت مقبول ہیں کہ ان میں خبروں کی سرخیاں عوام کا ذہن اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور اہم خبروں کے بارے میں وہ سب سے پہلے جان پاتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان روزنامچوں میں اپنے شہر کی خبروں کا بھی ایک روق ہوتا ہے جس سے لوگ اپنے شہر کے حالات و واقعات کو بخوبی جان سکتے ہیں۔ ہفت روزہ، ماہانہ، سہہ ماہی، سالانہ اور پیشہ ورانہ رسائل کی اپنی جگہ اہمیت و افادیت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ان رسائل و جرائد کی وجہ سے ہر طبقے سے وابستہ افراد اپنی اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق ان سے استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔مثلاً مذہبی رجحان رکھنے والے لوگ مذہبی رسائل و جرائد سے، سیاسی رجحان رکھنے والے لوگ سیاسی نوعیت کے رسائل و جرائد سے، معاشی معاملوں میں دلچسپی لینے والے معاشی رسائل سے، سائنس اور ٹکنالوجی میں دلچسپی لینے والا طبقہ اسی قسم کے رسائل و جرائد کو خرید کر ان سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ان رسائل و جرائد کے علاوہ کئی ایسے ذرائع ابلاغ ہیں جنھوں نے اپنی اہمیت تسلیم کرائی ہے جن میں پوسٹرز(Posters)، اسٹیکرز (Stickers)، ہینڈ بلز (Hand bills)، ٹی بورڈز (T-boards) اور بینرز (Banners) شامل ہیں۔جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی جا رہی ویسے ویسے صحافت میں نئی نئی ایجادات ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

برقی صحافت سے مراد ایسے ذرائع ابلاغ سے ہے جس کے ذریعہ خبروں کو سنا یا دیکھا جا سکتا ہو۔ برقی صحافت میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ریڈیو انیسویں صدی کی ایجاد ہے جس نے پوری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ریڈیو یا ٹرانسسٹر کی ایجاد کی وجہ سے اس کی ایک سوئی گھماتے ہی گھر بیٹھے دنیا کے تمام ریڈیو اسٹیشن کی نشریات کو سنا جا سکتا تھا۔ریڈیو کی ایجاد نے دوریوں کو سمیٹ دیا تھا۔ دور راز کے علاقوں جہاں بجلی اور دوسرے وسائل موجود نہیں تھے وہاں بھی لوگ ٹرانسسٹر کے ذریعہ ہر جگہ کے حالات کی خبریں سن سکتے تھے۔ریڈیو کی وعت و سرعت کا مقابلہ آج تک کوئی دوسرا ذریعہ ابلاغ نہیں کر سکا۔

پہلے وقت میں ریڈو خبروں کو سننے کا سب سے تیز اور سستا ذریعہ مانا جاتا تھا لیکن بیسویں صدی میں جب ٹیلی ویژن کی ایجاد ہوئی تو ریڈیو کی اہمیت کچھ کم ہو گئی اور اس کی وجہ یہ رہی کہ بہت ساری خبروں کو صرف سنا نہیں بلکہ دیکھا بھی جا سکتا تھا۔اس طرح لوگوں کی توجہ ریڈیو

سے ہٹ کر ٹیلی ویژن کی جانب ہوگئی۔ ٹیلی ویژن کے اثرات کی گہری چھاپ با آسانی دیکھی جا سکتی ہے اور محسوس کی جا سکتی ہے۔سی۔این۔این، پی۔ٹی۔این اور دوسرے چینل شروع ہونے سے دنیا سمٹ کر ٹی وی اسکرین میں سما گئی ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ہمہ گیری میں اضافہ کرنے کے لئے ٹیلی ٹیکس، ٹیلی کانفرنسنگ، کیبل ٹی۔وی۔ مواصلاتی سیارے کے ذریعے براہ راست نشریات، ویڈیو ٹائپ رائٹر، ویڈیو ٹرمینل، ویڈیو ٹیلیکس، وائل لیس سسٹم اور نیوز فوٹو ٹرانسمیشن نے سمعی اور بصری صحافت میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ برقی صحافت کا تیسرا اور جدید آلہ انٹرنٹ ہے جس کے ذریعہ پوری دنیا سمٹ کر ایک چھوٹی سی ڈیوائس یعنی موبائل میں آچکی ہے۔انٹرنٹ کا استعمال کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں ایک بٹن دبانے پر پوری دنیا کے حالات کو با آسانی اور سب سے تیزی کے ساتھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔اس طرح سے ذریعہ ابلاغ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔

13.4 اردو صحافت کا آغاز وارتقا

ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز بہت ہی پُر آشوب دور میں شروع ہوا۔ اس وقت 1857ء کی بغاوت کے بعد ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے حالات بہت خراب تھے۔ ایسے حالات میں صحافت کی ابتدا اور انگریزوں کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانا ان کے لئے سخت مشکل لے کر آیا لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری اور اردو صحافت ترقی کی منازل طے کرتی رہی۔

انگریز جب ہندوستان پر قابض ہوئے تو انھوں نے پہلا انگریزی اخبار 29 جنوری 1780 میں نکالا۔ اس اخبار کا نام ''کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر'' تھا جس کو جیمس اگسٹس ہکی (James Augustus Hicky) نے جاری کیا تھا۔ یہ چار صفحات پر مشتمل ہفت روزہ اخبار تھا جس میں ہندوستانی نامہ نگاروں کے علاوہ یورپی خبروں کا خلاصہ بھی دیا جاتا تھا۔ برصغیر کا دوسرا اخبار ''انڈیا گزٹ'' کے نام سے نومبر 1780 میں شروع ہوا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر بی میزنک (B. Messink) اور پیٹر ریڈ (Peter Reed) تھے۔ یہ اخبار اپنے اجرا کے تین سال بعد ہفتہ وار سے سہ روزہ ہوگیا اور کلد ہی سہ روزہ سے روزنامہ بن گیا۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے علمی وادبی ذوق کی تسکین کے لئے ایک سہ ماہی رسالہ Asiatic Miscellany of Bengal Register جاری کیا۔ یہ اس دور کے مہنگا اور معیاری رسالہ تھا۔ کلکتہ سے ایک اور ہفت روزہ اخبار ''بنگال جنرل'' 1785 میں جاری کیا گیا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر اور مالک تھامس جونز (Thomas Jones) تھے۔ اس کے بعد مدراس سے 12 اکتوبر 1785 کو "Madras Courier" کے نام سے ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر رچرڈ جانسٹن (Richard Johnston) تھے۔

کلکتہ اور مدراس کے بعد ممبئی سے ہفتہ وار اخبارات کے جاری ہونے کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1790 میں ممبئی سے ''ممبئی کوریئر'' کے نام سے ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ اس کے بعد 20 جون 1790 سے ممبئی گزٹ شروع ہوا اس میں ممبئی کی تجارتی وتفریحی خبروں کے علاوہ بیرون ممالک کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔

اٹھارہویں صدی کی آٹھویں دہائی کے شروع میں برصغیر میں صحافت کا آغاز ہوا تھا۔ بیس سال کے مختصر عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مرکز کلکتہ، مدراس، ممبئی اور دوسرے شہروں سے بڑی تعداد میں اخبارات کا اجرا ہوا۔ انیسویں صدی کا آغاز صحافت پر پابندیوں سے ہوا۔ 22 مئی 1801 کو گورنر جنرل کے زیر صدارت کونسل کے اجلاس میں باضابطہ تجویز منظور کر کے اخبارات کے مدیران اور مالکان کو وارننگ دی گئی کہ اخبارات کی اشاعت کے پہلے ان کے پروف چیف سکریٹری کو پیش کئے جائیں گے۔ کچھ مدت تک اس طرح کی پابندیوں کے صحافت

ترقی کے مراحل طے کرتی رہی۔اس کے بعد اس میں کچھ نرمی واقع ہوئی۔

اس کے بعد مقامی زبانوں میں بھی اخبارات جاری ہونے لگے۔1830 میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو گیا۔اسی کے ساتھ ہی اردو اخبارات کی اشاعت ہونے لگی۔ ہندوستان کا پہلا مقامی اخبار بنگالی زبان میں 1816 میں ''بنگال گزٹ'' کے نام سے جاری ہوا۔ یہ تقریباً ایک سال تک نکلتا رہا۔ 1818 میں پہلا بنگالی رسالہ ''ڈگ درشن'' جاری ہوا۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا۔ رام موہن رائے نے ''مراۃ الاخبار'' کے نام سے فارسی زبان کا پہلا اخبار 20 اپریل 1822 میں جاری کیا۔دوسرا اخبار جو فارسی زبان میں جاری ہوا۔اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔اردو صحافت کی ابتداء 1822ء میں کلکتہ سے شروع ہوئی جہاں سے سب سے پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' نکلا۔اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے 1837ء میں ''اردو اخبار'' جاری کیا۔اس اخبار کے ذریعے محمد باقر نے انگریزوں کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی جس کے نتیجے میں انھیں بے رحمی سے شہید کر دیا گیا۔اردو صحافت کی ابتدا کے دو سو سال سے بھی کم عرصے میں اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب رہی ۔ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو صحافت میں مقصدیت اور جرأت اظہار زیادہ پایا جاتا ہے۔ اردو اخبارات نے سماجی، سیاسی اور قوم کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا اور ایمانداری کا ثبوت فراہم کیا۔ گجراتی زبان کا پہلا اخبار 1822 میں ''بمبئی سماچار'' نکلا۔اس ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر مرزبان جی تھے۔ ہندی زبان کا پہلا اخبار 1826 میں ''اودنت مارتنڈ'' کے نام سے شروع ہوا اس کے ایڈیٹر منوٹھا کر تھے۔

شمالی ہندوستان کا پہلا فارسی اخبار 1833 میں ''زندہ الاخبار'' کے نام سے جاری ہوا اس کے ایڈیٹر نام منشی عاجد تھا۔فروری 1831 میں کلکتہ اور آگرہ سے ''آئینہ سکندر'' سراج الدین لکھنوی نے نکالا۔اس کے بعد اسی سال کلکتہ سے مولوی وہاج الدین کی زیر ادارت ''ماہ عالم افروز'' جاری ہوا ہفت روزہ اخبار ''سلطان الاخبار'' 1835 کو رجب لکھنوی نے جاری کیا۔ ہفت روزہ ''احسن الاخبار'' بمبئی سے نکلنا شروع ہوا۔ 1841 میں سید اولاعلی نے ''سراج الاخبار'' نکالا۔ یہ اخبار مغلیہ خاندان کے آخری حکمران بہادر شاہ ظفر کے دربار کا روزنامچہ تھا۔اس کے بعد مرزا مخلص علی کے کراچی سے ''مفرح القلوب'' کے نام سے ہفت روزہ 1855 میں جاری کیا۔

شمالی ہند کا پہلا اور برصغیر کا دوسرا اردو اخبار ''دہلی اخبار'' 1837 میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے شروع کیا۔ 1840 میں اس کا نام بدل کر ''دہلی اردو اخبار'' کر دیا گیا۔اس اخبار میں ادبی تحریروں کے علاوہ مرزا غالب، مومن خاں مومن اور بہادر شاہ ظفر کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔تقریباً اکیس سال جاری رہنے کے بعد 1857 کی جنگ آزادی میں مولوی محمد باقر کی شہادت کی وجہ سے یہ بند ہو گیا۔ 1837 میں سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے دہلی سے ''سید الاخبار'' کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالا۔اس کے ایڈیٹر مولوی عبد الغفور تھے۔ دہلی کالج کے پروفیسر مولوی کریم الدین نے 1845 میں ''کریم الاخبار'' کے نام سے ایک اخبار نکالا جو تیس سال تک جاری رہا۔ اس دور میں دہلی اردو صحافت کا بڑا مرکز تھا۔

انقلاب کے بعد اردو صحافت کا دوسرا عہد شروع ہوتا ہے۔ یہ 1858 سے 1947 کا زمانہ ہے۔ لاہور سے ''اخبار عام'' کے جاری ہونے کے ساتھ یہ دور شروع ہوتا ہے۔ 1871 میں یہ اخبار منظر عام پر آیا۔اس کی خاصیت یہ تھی کہ دوسرے اخباروں کے مقابلے میں اس کی قیمت کم رکھی گئی تھی۔ پنڈت مکند رام اس کے مالک تھے۔اردو کا ایک اہم اخبار ''اودھ پنچ'' تھا جو کہ 1877 میں جاری ہوا۔ یہ اخبار لکھنؤ سے نکلتا تھا اور اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں طنز و ظرافت سے لبریز مضامین، شاعری، پیروڈی وغیرہ شائع ہوتی تھی۔ 1877 میں ''پیسہ'' اخبار نکلنا شروع ہوا۔اس اخبار کی شہرت و مقبولیت بہت زیادہ تھی۔ یہ لاہور کے گوجرانوالہ جگہ سے نکلتا

تھا۔اس کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم تھے۔اس اخبار کی قیمت بی دوسرے اخبارات کے مقابلے بہت کم تھی۔اس اخبار نے ایک اہم کارنامہ یہ کیا کہ اس نے اخبار والوں کی توجہ اہل علم کی جانب پھیر دی کہ اخبار نکالنے کے لئے عالم کا ہونا ضروری ہے۔

اردو اخبارات کے لئے بیسویں صدی کامیاب مانی جاسکتی ہے۔اس صدی میں اردو اخبارات کو کافی فروغ حاصل ہوا۔کانگریس ملک میں سیاسی بیداری کے لئے جدوجہد کرتی نظر آتی ہے جو اخبارات کے مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔اسی دوران مسلم لیگ کا قیام وجود میں آیا۔اس کی تشہیر کے لئے بھی اخبارات نے اہم کردار ادا کیا۔ملک کی آزادی کے لئے سوراج تحریک کا بھی آغاز ہوا۔خلافت تحریک نے بھی زور پکڑا۔ایسے حالات سے اخبار متاثر بھی ہوا اور بدلتا بھی رہا۔1903 میں مولانا حسرت موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' اخبار نکالا۔اسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ''لسان الصدق'' جاری کیا۔آزاد نے ایک اخبار 1912 میں ''الہلال'' بھی جاری کیا۔وہ اپنے زمانے کا ہی نہیں آج بھی صحافت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے ''ہمدرد'' اور ''زمیندار'' جاری کیا۔یہ دونوں اخبارات کی اشاعت معیاری تھی۔

بیسویں صدی کے اہم اخباروں میں ایک روزنامہ ''ہند'' ہے جس کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے نکالا تھا۔اس کے بعد انھوں نے ایک اور اخبار 1947 میں ''اجالا'' کے نام سے جاری کیا۔اس کے بعد اخبارات کا سلسلہ جاری رہا۔1942 میں ''جنگ'' اخبار دہلی سے جاری ہوا۔اس کے مالک و مدیر خلیل الرحمٰن تھے۔1943 میں پورینہ سے سہ ماہی ''الاحسان'' فضل الرحمٰن کی ادارت میں نکلا۔1946 میں مولانا امیر حسن نے روزنامہ ''الہلال'' جاری کیا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی اردو صحافت کا سفر بدستور جاری رہا۔آزادی کے بعد تقریباً اٹھارہ اردو اخبار ملک کے کونے کونے سے نکلتے تھے۔جن میں چالیس کا تعلق ان خطوں سے تھا جو پاکستان میں آتا تھا۔ساتھ ہی کچھ اخبارات جو دہلی سے شائع ہوتے تھے پاکستان چلے گئے مثلاً ''جنگ'' اور ''انجام''۔اسی طرح کچھ اخبار وہاں سے دہلی آگئے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر عابد حسین نے جنوری 1948ء میں ''نئی روشنی'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔اردو کی قومی حیثیت ختم ہونے سے بعد میں اسے بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ ملک کے مختلف حصوں سے نئے نئے اخبارات کے جاری ہونے کا سلسلہ چلتا رہا۔1948ء میں پنجاب سے ''ہند سماچار''، مغربی بنگال سے ''آزاد ہند'' اور اتر پردیش سے ''آزاد'' نکلنے لگے۔1949ء میں آندھرا پردیش سے ''رہنمائے دکن''، ''سیاست''، ''ملاپ'' اور ''مصنف'' بھی نکلے۔اس کے بعد کارپوریٹ گھرانوں نے بھی اردو اخبارات کی دنیا میں قدم رکھا اور نئی جہت عطا کی۔1991ء میں راشٹریہ سہارا ماہنامہ کی شکل میں شروع ہوا اور 1999ء میں اس نے روزنامہ کی شکل اختیار کر لی ہفت روزہ ''عالمی سہارا'' بھی جاری کیا گیا۔دینک جاگرن نے اپنا اردو اخبار ''انقلاب'' بھی جاری کیا۔اکیسویں صدی میں اردو اخبارات کی کافی تعداد ہوگئی۔روزنامہ ''انقلاب'' بھی گیارہ شہروں سے نکالا جانے لگا۔اس طرح اردو صحافت کا سفر رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

13.5 پریم چند کی صحافت نگاری

بیسویں صدی کا سب سے اہم واقعہ ہندوستان کی آزادی کے لئے عوام کی جدوجہد تھی۔غلام ہندوستان میں مغربی تعلیم کے فروغ اور انگریزوں کی تعصّبانہ سیاسی اقدام نے منشی پریم چند کو صحافت کے میدان میں قدم رکھنے کے لئے راغب کیا۔پریم چند اپنے عہد میں سیاسی اور سماجی بیداری پیدا کرنے کے لئے صحافت سے منسلک ہوئے۔حالانکہ وہ باقاعدہ صحافی نہیں تھے لیکن صحافت سے ان کا رشتہ بہت گہرا تھا۔

صحافت کے راستے پر چلتے ہوئے انھیں اپنے خیالات کی حفاظت کے لئے مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب جدوجہد آزادی مسلسل آگے بڑھتے ہوئے عوام کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے لگی تھی اسی وقت سے پریم چند نے بھی اخبارات ورسائل کے لئے لکھنا شروع کیا۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کی اس قومی سطح پر کوششوں میں پریم چند کی آواز بلند ہوگئی اور ان کا حوصلہ بھی بڑھتا گیا۔ کئی برسوں کی محنت کے بعد انھوں نے ''ہنس'' رسالہ نکالا جو ترقی پسند مصنفین کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور انھیں متحد کرنے میں کامیاب رہا۔ ان کے زیر ادارت یہ رسالہ ترقی پسند رسائل وجرائد کی تاریخ میں ایک سنہرے ورق کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں سرگرم منشی پریم چند ان صحافیوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اختلاف کی ہمت پیدا کرنے اور منطقی حمایت کرنے کے لئے سماج میں پھیلی برائیوں کی پہچان کی تاکہ عقل وشعور سے کام لیا جاسکے۔ انھوں نے عوام کو منظّم کرنے کے لئے صحافت کی مشعل بھی روشن کی۔ ان کی صحافت نگاری انصاف پسندی اور بلند حوصلے کے ساتھ ہی رائے عامہ کی تشکیل کی دستاویز بھی ہے۔ پریم چند نے آج سے تقریباً ایک صدی پہلے (1905) رسالہ ''زمانہ'' میں ایک کالم لکھا تھا کہ دیسی چیزوں کو کس طرح سے فروغ دیا سکتا ہے تاکہ ہندوستانی عوام اپنے ملک کی چیزیں استعمال کرنے کی جانب راغب ہوں۔ ان کا یہ کام آج بھی اتنا ہی اہم ہے کیونکہ ملکی چیزوں کے استعمال کی ترغیب دینے والے اور سماج میں دیسی چیزوں کا شہرۂ عام کرنے والوں میں پریم چند کا نام اہم ہے۔

1922ء میں پریم چند بنارس سے شائع ہونے والے ہندی ماہنامے ''مریادا'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہاں رہتے ہوئے انھیں پبلشنگ کے کاروبار سے واقفیت کے سبب اس شعبہ میں دلچسپی پیدا ہوگئی تو انھوں نے خود اس کاروبار کو کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک ایسا پبلشنگ ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جہاں سے اعلیٰ اور معیاری کتابیں شائع ہوں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے 1923ء میں بنارس میں سرسوتی پریس کے نام سے پارٹنرشپ میں پریس قائم کیا۔ اس کاروبار میں نقصان ہوتا دیکھ کر ان کے پارٹنر نے کاروبار سے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا لین پریم چند اپنی متسقل مزاجی کے سبب اس کاروبار سے منسلک رہے اور نقصان برداشت کرتے رہے۔ اس کے بعد ممبئی سے پریم چند کو فلموں میں کہانیاں لکھنے کا موقع ملا۔ وہاں جاکر انھوں نے فلموں کے لئے کہانیاں بھی لکھیں لیکن ان میں اصلاحی عناصر کارفرما رہا۔ ممبئی کی تیز رفتار زندگی اور فلمی دنیا کی چمک دمک نے ان کا دل اس جانب سے پھیر دیا اور جلد ہی انھوں نے ممبئی کو خیرآباد کہہ دیا۔

پریم چند جب ملازمت کے سلسلے میں کانپور گئے تو وہاں ان کی ملاقات اس وقت کے مشہور رسالے ''زمانہ'' کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم سے ہوئی۔ نگم سے ان کی ملاقات جلد ہی دوستی میں بدل گئی اور یہ دوستی پریم چند کی وفات تک قائم رہی۔ کانپور میں پریم چند کا قیام دیانرائن نگم کے یہاں ہی رہا۔ حالانکہ ان کے قدردان وہاں بھی بڑی تعداد میں تھے لیکن نگم کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ دیانرائن نگم کا اثر پریم چند کی زندگی پر بہت پڑا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ ان کی وجہ سے پریم چند کی زندگی میں ایک نئے اور اطمینان بخش دور کا آغاز ہوا تو بیجا نہ ہوگا۔ کانپور میں دیانرائن نگم کی رفاقت اور ''زمانہ'' سے وابستگی کے بعد سے ہی پریم چند کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔ یہاں انھیں تصنیف وتالیف کے لئے بہترین مواقع فراہم ہوئے۔ ''زمانہ'' میں پریم چند مستقل قلم کار تھے۔ انھوں نے ''زمانہ'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ ان وجوہات کی بنا پر پریم چند کو ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا اور ان کے ادبی ذوق کو جلا ملی۔ جس سے ان کا تخلیقی شوق پروان چڑھتا گیا۔ کانپور میں قیام پریم چند کے لئے بہت ہی سازگار ثابت ہوا۔ وہاں دیگر ادیبوں اور صحافیوں نے پریم چند کے ذہن وفکر کی تشکیل وتعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' بھی زمانہ پریس کانپور سے ہی شائع ہوا۔ پریم چند کے افکار ونظریات کو بلندوں تک پہچانے میں رسالہ ''زمانہ'' کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔

1929ء میں پریم چند ہندی کے مشہور رسالے ''مادھوری'' کے مدیر مقرر ہوئے۔اس رسالے کی ادارت کے دوران ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ 1930ء میں اسی پریس سے انھوں نے اپنا رسالہ ''ہنس'' بھی جاری کیا تھا۔اس رسالے کو شروع کرنے کے بعد انھوں نے ''مادھوری'' سے علیحدگی اختیار کر لی۔ بہت جلد ''ہنس'' ہندی کا مقبول اور معیاری پرچہ بن گیا۔ یہاں سے پریم چند ایک اعلی مدیر کے حیثیت سے ادبی دنیا میں پہچانے جانے لگے۔''ہنس'' جاری کرنے کے بعد انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار ''جاگرن'' کے نام سے جاری کیا۔ان ادارت سے پریم چند کو معاشی نقصانات اٹھانے پڑے لیکن انھوں نے ہمت وحوصلے کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ چونکہ ان کا مقصد ان کے ذریعہ آمدنی بڑھانا نہیں بلکہ صالح ادب کا فروغ تھا اس لئے انھوں نے نقصان کا کبھی خیال نہیں کیا۔انھوں نے ان رسالوں کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمات انجام دیں ساتھ ہی اصلاح کا بھی کام کیا۔ پریم چند نے اپنے اصلاحی مضامین کے ذریعے سماجی اصلاح کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا اور اہل وطن کے دلوں میں جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کا حوصلہ پیدا کیا۔

پریم چند اپنے قلم کی طاقت سے اچھی طرح سمجھتے تھے۔اسی لئے بڑی ذمہ داریوں کی سنجیدگی سے بھی واقف تھے۔محدود دائرے میں رہ کر اور لگے بندھے اصولوں کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی تخلیقی ذمہ داریوں کو ایمانداری کے ساتھ پورا کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس لئے پریم چند نے اپنی الگ راہ نکالی اور صحافت کی دنیا میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔''ہنس'' کی ادارت کو وہ اپنی حماقت سمجھتے تھے۔12 فروری 1930ء کو انھوں نے اپنے عزیز دوست اور ''زمانہ'' کے مدیر دیا نرائن نگم کو لکھا تھا ''میں پھاگن یعنی نئے سال سے ایک ہندی رسالہ ''ہنس'' نکالنے جارہا ہوں۔ یہ ہے تو حماقت اور دردسر بہت اور نفع کچھ نہیں،لیکن حماقت کرنے کو جی چاہتا ہے۔زندگی حماقت میں گزر گئی ایک اور سہی۔نہ پہلے کبھی کامیابی کی صورت دیکھی اور نہ اب دیکھنے کی امید ہے۔''اس طرح مارچ 1930ء سے ''ہنس'' منظر عام پر آیا۔

''ہنس'' کی ابتدا ایسے وقت میں ہوئی جب ہندوستان میں آزادی کے لئے جدوجہد کی جارہی تھی۔تلک، گوکھلے، مدن موہن مالوی جی جیسے لوگ عوام میں بھی آزادی کی خواہش جگا چکے تھے۔مہاتما گاندھی کانگریس کے ذریعے 'عدم تعاون' تحریک چلا رہے تھے اور لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کے لئے کوشاں تھے۔زیادہ تر مصنفین اور دانشوران آزادی کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ایسے وقت میں پرقی پسند صحافیوں اور مصنفین کی جانب سے جدوجہد آزادی کو ترغیب دی گئی۔ بیدار عوام ہاتھوں میں مشعل لے کر عوامی تحریک چلانے لگی۔ ہندوستانی عوام کی بے جان روحوں میں جان پڑ گئی اور ان کا جوش وولولہ دیکھ کر صحافیوں اور ادبا وشعرا کے دماغ میں آزاد ہندوستان کا واضح عکس نظر آنے لگا۔

ہندوستان کی آزادی میں اردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا۔ بہت سارے صحافیوں کو اپنی جان کی قربانی دینی پڑی۔اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے بہت کوششیں کی گئیں اور بہت خوب بہایا گیا۔آزادی کی جنگ میں صحافت ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوئی۔اس ہتھیار کے بغیر آزادی حاصل کرنا مشکل امر تھا۔یہی وجہ رہی کہ پریم چند نے جہاں کہانیوں، ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے ذریعے سماج میں ہونے والی جدوجہد کو پیش کیا وہیں رسائل و جرائد کے ذریعے بھی مسلسل آزادی کی لڑائی میں اور سماجی اصلاح میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔اس کے لئے انھوں نے مختلف رسائل و جرائد کا سہارا لیا۔''ہنس''،''مادھری'' اور ''جاگرن'' وہ ایک ستون کی حیثیت سے لکھنے کا کام کرتے رہے۔

پریم چند کی صحافت نگاری بہت قوت رکھتی تھی۔الفاظ پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔نوٹ یا تبصرے میں کیسی زبان کا استعمال ہونا چاہیے یہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا۔جملوں کی سادگی، زبان کی سہل نگاری اور ترسیل اتنی عمدہ ہوتی تھی کہ کوئی آسانی سے چھوٹی سے چھوٹی خبر کو بھی نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔مثال کے لئے ''ہنس'' میں 1934ء کے شمارے میں شائع ہوئے ایک مضمون میں ان کی تحریر ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے

'ذات کی تفریق کومٹانے کی منصوبہ بندی' کے عنوان سے لکھا تھا۔اس میں لکھتے ہیں:

''بمبئی کے میئی یادو نے بھید بھاؤ مٹانے کے لئے یہ مشورہ دیا ہے کہ سبھی ہندو کی نچلی ذات کو برہمن کہا جائے اور ہندو لفظ کو ختم کر دیا جائے، جس سے تفریق کا احساس ہوتا ہے۔'' اس لائن پر تبصرہ کرتے ہوئے پریم چند لکھتے ہیں کہ ''مشورہ بہت مزے کا ہے۔ ہم اس دن کو ہندوستان کی تاریخ میں مبارک سمجھیں گے، جب سبھی ہری جَن برہمن کہلائیں گے۔'' دراصل پریم چند کو اس بات کی قلق تھی کہ ہم مختلف ذاتوں میں منقسم ہیں۔ برہمن، شتریہ، ویشہ اور ہری جَن۔ جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو عام نہیں سمجھ پاتے بلکہ ذات کی بنیاد پر برتری کا احساس ہمارے دل و دماغ میں کہیں نہ کہیں بیٹھا رہتا ہے اور جیسے ہی اسے موقع ملتا ہے سب سے اوپر آ کر حاوی ہو جاتا ہے۔ ذات پات کی تفریق کو ہم ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں کیونکہ اسے خون میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ''ہنس'' کے جنوری 1934ء کے شمارے میں پریم چند کا ایک چھوٹا سا تبصرہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ''اچھی اور بری فرقہ پرستی''۔ اس تبصرے میں وہ لکھتے ہیں ''انڈین سوشل ریفارمر نام کے ایک رسالے نے کہا ہے کہ فرقہ پرستی اچھی بھی ہے اور بری بھی۔ بری فرقہ پرستی کو اکھاڑ پھینکنا چاہئے مگر اچھی فرقہ پرستی وہ ہے جو اپنے علاقے میں بہت کارآمد کام انجام دے سکتی ہے۔ اس کی کیوں مخالفت کی جائے۔'' یہ خبر دینے کے بعد پریم چند اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ''اگر فرقہ پرستی اچھی ہو سکتی ہے تو غلامی بھی اچھی ہو سکتی ہے اور جھوٹ بی اچھا ہو سکتا ہے۔'' اس طرح پریم چند کی صحافت مدعوں پر مرکوز تھی۔ انھوں ہر اس موضوع پر اپنا قلم اٹھایا جس سے سماج کا، ملک کا یا فرد کا فائدہ ہوتا ہو۔ انھوں نے جنگ آزادی، عالمی حالات، ہندو مسلمان، چھوا چھوت، مزدور کسان، عوام، حکومت، ادب، فلسفہ، مذہب، معاشرہ، تعلیم، تہذیب و ثقافت، عورتوں کے مسائل سے لے کر قومی زبان تک کے انتخاب پر رپورتاژ، تبصرے اور مضامین لکھے۔ تحریروں کو لکھنے کے علاوہ انھوں نے ادارت کا کام بھی بخوبی انجام دیا۔ انھوں نے 34-1933 میں ہفت روزہ ''جاگرن'' کی ادارت کی۔ 1903 سے 1936 تک ''ہنس'' کی ماہنامہ رسالے کے طور پر ادارت کی۔

''ہنس'' کے پہلے شمارے میں پریم چند نے ملک کی آزادی اور محنت کشوں کی آواز کو اپنی صحافت کا مقصد قرار دے دیا تھا اور ''ہنس'' کے مقاصد بھی اسی راہ پر کام کرتے رہیں گے۔ اپنے مقاصد کا ایسے کھلے عام اعلان کرنے کی ہمت کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔ انھیں مقاصد کو مرکز میں رکھ کر پریم چند نے اپنے رسالے کو مسلسل ترقی کی راہ پر آگے بڑھایا۔ انگریزی حکمرانوں نے سرسوتی پریس اور ہنس پر جرمانہ بھی لگایا لیکن پریم چند اپنے مقاصد سے پیچھے نہیں ہٹے۔ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انھوں نے ملک و قوم کے لئے جو کچھ بھی ہو سکا وہ کیا اور مسلسل کوشاں رہے کہ ہندوستان کو آزاد کرایا جائے اور ایک نئے بھارت کی بنیاد رکھی جائے۔

انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور شاسن کرو نیتی' کے تحت ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کی تا کہ ان کی حکومت ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ اس کے علاوہ انگریز حکمرانوں نے ذات پات اور زبان کو لے کت بھی تفرقہ ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندو مسلم مسئلہ، کسانوں کے مسائل، مزدوروں پر مظالم، زبان کا مسئلہ، فرقہ پرستی جیسے بہت سارے مسائل تھے جن پر پریم چند نے بیباکانہ انداز میں لکھا۔ پریم چند ان مسائل کو سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے اور ان پر غور و فکر بھی کر رہے تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ایسی باتیں ہندوستان کو متحد نہیں ہونے دیں گی۔ اس سازش کو سمجھتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''فرقہ واریت کے نام پر مسلمانوں کے لئے 25% جگہ مختص کر دی گئی ہے۔ ہماری سمجھ میں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ حکومت ہماری قومی ترقی کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے، وہ نہیں چاہتی کہ ہمیں زندگی جینی آ جائے۔ اس طرح فرقہ واریت کو غذا کھلا کر وہ ہمارے قومی اتحاد کو ہوا میں اڑا دینا چاہتے ہیں۔ سرکار کا یہ روپ بہت خوفناک ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کی ترقی کے مخالف ہیں، ہمیں ان کے لئے

25% جگہ مختص کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ اعتراض ہے تو اس فرقہ واریت کو بڑھاوا دینے والی سوچ پر، جس سے قومیت کا گلا گھٹ رہا ہے۔ نوکریوں کے اس طرح سے حصوں میں بٹنے سے کیا ہوگا؟ فرقہ واریت اور بڑھے گی، مذہبی تعصب پیدا ہوگا، دلوں میں بغض وکینہ پیدا ہوگا، صلاحیتوں کی وقعت کم ہوگی، اہمیت رہے گی تو صرف فرقہ واریت کی۔''

پریم چند کا عہد بہت ہی نشیب وفراز کا عہد تھا۔ اس وقت گاندھی جی 'عدم تعاون' کی تحریک چلا کر ملک کو آزادی دلانا چاہتے تھے۔ اس تحریک کے ایک ستون کے طور پر پریم چند کی بہت شہرت تھی۔ وہ عملی طور پر تو کبھی سیاست کے میدان میں نہیں آئے البتہ صحافت کے ذریعے جنگ آزادی میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ عوام کے استحصال کے خلاف انھوں کھل کر آواز اٹھائی۔ سوراج حاصل کرنے کے لئے وہ ہمیشہ دل وجان سے تیار رہے۔ مختلف عنوانات کے تحت انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے تبصرے لکھے جن میں 'سوراج مل کر رہے گا 1931'، 'دمن کی سیما 1932'، 'کالے قانون کا برتاؤ 1933'، 'شکر پر ایک آئی ڈیوٹی 1933'، 'کوڑھ پر کھاج 1935' وغیرہ۔ ان تحریروں میں انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف لکھا اور ان کے مظالم کی مذمت بھی کی۔

پریم چند نے جس متحد ہندوستان کا خواب دیکھا تھا اس میں ہر چیز میں مساوات شامل تھا۔ اسی مساوات کو انھوں نے اپنی صحافت کے ذریعے زمین پر اتارنے کی کوشش کی۔ ان کا انداز بیان بہت موثر اور دلچسپ ہے۔ وہ بڑی سے بڑی بات کو بھی بہت ہی سہل انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ ان کے اندر ایک خاص قسم کی طرز گفتگو پوشیدہ ہے جو نہ صرف ان کی کہانیوں میں بلکہ ان کے تبصروں، اداریوں اور مضامین میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ادیب کے جذبات اور اس کی سنجیدگی کا ہر طرح کے قاری پر ایک جیسا اثر ہونا چاہئے۔ ان نے سوچنے اور لکھنے کی زبان بہت ہی عام فہم انداز کی ہے جس کا اثر قاری پر ہوتا ہے۔ ان کی صحافت نگاری میں انداز بیان کا جادو بھی اہمیت کا حامل ہے۔

پریم چند نے اپنی صحافت کا ایک بڑا اور اہم وقت ''ہنس'' کو دیا اور اسے اپنے خیالات اور اصولوں کے مطابق ہندوستان کا اہم رسالہ بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ ''ہنس'' کا قاری ہونے کا مطلب تھا ایک ایسا بیدار اور ہوشیار قاری ہونا جسے اپنے قرب وجوار، ملک ودنیا میں ہونے والے واقعات وحالات کا نہ صرف علم ہوتا بلکہ ان پر تبصرہ وتجزیہ کرنے کا شعور بھی پیدا ہوتا، ساتھ ہی اپنے ملک وسماج کی فلاح کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہوتا۔ ''ہنس'' بغیر کسی ڈر وخوف کے، بغیر کسی فکر کے سب کچھ اپنے قاری کی نذر کرتا رہا جو ایک ذمہ دار رسالے سے امید کی جاتی ہے۔ ''ہنس'' کو پڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ اس عہد کے حالات کو گزرے وقتوں میں وقوع پذیر ہونے والے حالات وواقعات کے پس منظر میں دیکھا اور سمجھنا اور مستقبل کے لئے بہتر عبارت لکھنے کی قابلیت پیدا کرنا۔ قومی اتحاد سے لے کر ملک کی آزادی، ذات پات سے لے کر تعلیم وتہذیب، سماجی مسائل سے لے کر سیاسی منظر نامے تک پریم چند نے اس رسالے کے ذریعے ہر شعبے میں انقلاب لانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ پریم چند اور ''ہنس'' کی جدوجہد کی کہانی صحافت کی دنیا میں اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔

پریم چند نے صحافت کو ایک اہم مقصد کے طور پر لیا۔ انھوں نے اسے فیشن یا ذریعۂ معاش کے طور پر نہیں استعمال کیا۔ وہ صحافت میں دولت کو شامل کرنے کے سخت خلاف تھے۔ صحافت میں اشتہارات کو وہ قطعی ناپسند کیا کرتے تھے۔ وہ صحافت کے بنیادی مقاصد اور اصولوں کے حمایتی تھے۔ وہ کسی طرح کے سیاسی دباؤ میں آکر کبھی بھی سرخم کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ جدید صحافت جس میں چمک دمک شامل ہے، ایسی صحافت سے ان کا کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی صحافت آج بھی صحافیوں کے لئے مشعل راہ ہے جو اصولوں کے لئے لڑنا سکھاتی ہے۔ عوام کی فلاح وبہبود کا کام کرنا چاہتی ہے۔ جو بے زبان کی زبان بن کر بولنا چاہتی ہے، ایسی تھی پریم چند کی صحافت۔ ایک مصنف کی حیثیت سے ان کا

رتبہ جتنا بلند ہے ایک صحافی کی حیثیت سے بھی ان کے مرتبے کو کم تر نہیں مانا جا سکتا۔ صحافت کے میدان میں ان کے کارنامے انمول ہیں۔

13.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے اردو صحافت کی تعریف جانا۔

آپ نے اسردو صحافت کے آغاز وارتقا کے بارے میں جانا۔

آپ نے پریم چند کی صحافت نگاری کے متعلق جانا۔

آپ نے رسالہ ''ہنس'' کے بارے میں مختلف معلومات حاصل کیں۔

آپ نے ہندوستان کے مختلف رسالوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

13.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ صحافت کی تعریف کرتے ہوئے اس کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

2۔ صحافت کی مختلف جہتیں کے متعلق معلومات فراہم کیجئے۔

3 ۔ ہنس کے خصوصی حوالے سے پریم چند کی صحافت نگاری کے اوصاف بیان کیجئے۔

13.8 سوالات کے جواب

جواب 1: اردو زبان میں مستعمل لفظ ''صحافت'' عربی زبان کے لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی صفحہ، کتاب یا رسالے کے ہیں۔ لفظ ''صحف'' سے بنا ہے ''صحیفہ'' جس کے معنی کتاب یا رسالہ، لکھا ہوا، خط، یا مکتوب کے ہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق ''صحیفہ کے لغوی معنی وہ چیز ہے جس پر لکھا جا سکے، اسی مناسبت سے روق کی ایک جانب یعنی صفحہ کو بھی صحیفہ کہتے ہیں۔ جدید عربی میں صحیفہ بمعنی جریدہ اور اخبار بھی مستعمل ہے۔ قرآن مجید میں نامۂ اعمال، خط یا مکتوب، حکم نامہ یا فرمان اور کتب آسمانی، سچے رسولوں پر نازل کی جانے والی کتابوں اور احکام و ہدایات کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔''

ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز بہت ہی پُر آشوب دور میں شروع ہوا۔ اس وقت 1857ء کی بغاوت کے بعد ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے حالات بہت خراب تھے۔ ایسے حالات میں صحافت کی ابتدا اور انگریزوں کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانا ان کے لئے سخت مشکل لے کر آیا لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری اور اردو صحافت ترقی کی منازل طے کرتی رہی۔

انگریز جب ہندوستان پر قابض ہوئے تو انھوں نے پہلا انگریزی اخبار 29 جنوری 1780 میں نکالا۔ اس اخبار کا نام ''کلکتہ جنرل ایڈورٹائز'' تھا جس کو جیمس اگسٹس ہکی (James Augustus Hicky) نے جاری کیا تھا۔ یہ چار صفحات پر مشتمل ہفت روزہ اخبار تھا جس میں ہندوستانی نامہ نگاروں کے علاوہ یورپی خبروں کا خلاصہ بھی دیا جاتا تھا۔ برصغیر کا دوسرا اخبار ''انڈیا گزٹ'' کے نام سے نومبر 1780 میں شروع ہوا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر بی میزنک (B. Messink) اور پیٹر ریڈ (Peter Reed) تھے۔ یہ اخبار اپنے اجرا کے تین سال بعد ہفتہ وار سے سہ روزہ ہو گیا اور کلد ہی سہ روزہ سے روزنامہ بن گیا۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے علمی و ادبی ذوق کی تسکین کے لئے ایک سہ ماہی رسالہ Asiatic Miscellany of Bengal Register جاری کیا۔

اس کے بعد مقامی زبانوں میں بھی اخبارات جاری ہونے لگے۔ 1830 میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اسی کے

ساتھ ہی اردو اخبارات کی اشاعت ہونے لگی۔ ہندوستان کا پہلا مقامی اخبار بنگالی زبان میں 1816 میں ''بنگال گزٹ'' کے نام سے جاری ہوا۔ یہ تقریباً ایک سال تک نکلتا رہا۔ 1818 میں پہلا بنگالی رسالہ ''ڈگ درشن'' جاری ہوا۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا۔ رام موہن رائے نے ''مراۃ الاخبار'' کے نام سے فارسی زبان کا پہلا اخبار 20 اپریل 1822 میں جاری کیا۔ دوسرا اخبار جو فارسی زبان میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔ اردو صحافت کی ابتداء 1822ء میں کلکتہ سے شروع ہوئی جہاں سے سب سے پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' نکلا۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے 1837ء میں ''اردو اخبار'' جاری کیا۔

اردو اخبارات کے لئے بیسویں صدی کامیاب مانی جاسکتی ہے۔ اس صدی میں اردو اخبارات کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ کانگریس ملک میں سیاسی بیداری کے لئے جدوجہد کرتی نظر آتی ہے جو اخبارات کے مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اسی دوران مسلم لیگ کا قیام وجود میں آیا۔ اس کی تشہیر کے لئے بھی اخبارات نے اہم کردار ادا کیا۔ ملک کی آزادی کے لئے سوراج تحریک کا بھی آغاز ہوا۔ خلافت تحریک نے بھی زور پکڑا۔ ایسے حالات سے اخبار متاثر بھی ہوا اور بدلتا بھی رہا۔ 1903 میں مولانا حسرت موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' اخبار نکالا۔ اسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ''لسان الصدق'' جاری کیا۔ آزاد نے ایک اخبار 1912 میں ''الہلال'' بھی جاری کیا۔ وہ اپنے زمانے کا ہی نہیں آج بھی صحافت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے ''ہمدرد'' اور ''زمیندار'' جاری کیا۔ یہ دونوں اخبارات کی اشاعت معیاری تھی۔

بیسویں صدی کے اہم اخباروں میں ایک روزنامہ ''ہند'' ہے جس کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے نکالا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور اخبار 1947 میں ''اجالا'' کے نام سے جاری کیا۔ اس کے بعد اخبارات کا سلسلہ جاری رہا۔ 1942 میں ''جنگ'' اخبار دہلی سے جاری ہوا۔ اس کے مالک و مدیر خلیل الرحمٰن تھے۔ 1943 میں پورینہ سے سہ ماہی ''الاحسان'' فضل الرحمٰن کی ادارت میں نکلا۔ 1946 میں مولانا امیر حسن نے روزنامہ ''الہلال'' جاری کیا۔

جواب 2: موجودہ دور میں صحافت کی کئی جہتیں ہیں جنھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ مطبوعہ صحافت (Printed Journalism)

2۔ برقی صحافت (Electronic Journalism)

مطبوعہ صحافت سے مراد خبروں کا کاغذ پر چھپی ہوئی شکل میں ترسیل ہونا ہے۔ اس کے اندر روزنامچہ ہفت روزہ اخبار، علمی و ادبی مجلّے، پیشہ وارانہ رسالے، سہ ماہی اور سالانہ جریدے اور طباعتی صحافت میں پوسٹرز (Posters)، اسٹیکرز (Stickers)، ہینڈ بلز (Hand bills)، ٹی بورڈز (T-boards) وغیرہ کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ برقی صحافت میں ریڈیو، ٹیلیویژن، فلم، وی۔سی۔آر۔، سلائیڈرز اور ہینڈ پروجیکٹر کو شامل کیا جاتا ہے۔ مطبوعہ صحافت میں روزانہ اخبارات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ دنیا بھر میں روزانہ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں سینکڑوں زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ روز کی خبریں مطبوعہ شکل میں اخباروں میں مل جاتی ہیں۔ آج کے دور میں پوری دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے قریب ہو گئے ہیں۔ ہر ملک کے حالات و واقعات اخباروں میں شائع کئے جاتے ہیں۔ دور دراز کے ممالک کی خبریں حاصل کرنا اور ان کے بارے میں جاننے کا اشتیاق عوام میں پیدا ہوا ہے۔ اس طرح مختلف ممالک میں رہنے والے لوگ ایک خاندان کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ مطبوعہ صحافت میں روزانہ نکلنے والے اخبارات اسی لئے بہت مقبول ہیں کہ ان میں خبروں کی سرخیاں عوام کا ذہن اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور اہم خبروں کے بارے میں وہ سب سے پہلے جان پاتے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ہمہ گیری میں اضافہ کرنے کے لئے ٹیلی ٹیکس، ٹیلی کانفرنسنگ، کیبل ٹی۔وی۔ مواصلاتی سیارے کے ذریعے براہ راست نشریات، ویڈیو ٹائپ رائٹر، ویڈیو ٹرمینل، ویڈیو ٹیلیکس، وائل لیس سسٹم اور نیوز فوٹو ٹرانسمیشن نے سمعی اور بصری صحافت میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ برقی صحافت کا تیسرا اور جدید آلہ انٹرنٹ ہے جس کے ذریعہ پوری دنیا سمٹ کر ایک چھوٹی سی ڈیوائس یعنی موبائل میں آچکی ہے۔ انٹرنٹ کا استعمال کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں ایک بٹن دبانے پر پوری دنیا کے حالات کو با آسانی اور سب سے تیزی کے ساتھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے ذریعہ ابلاغ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔

جواب 3: ہندوستان کی تحریک آزادی میں سرگرم منشی پریم چند ان صحافیوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اختلاف کی ہمت پیدا کرنے اور منطقی حمایت کرنے کے لئے سماج میں پھیلی برائیوں کی پہچان کی تاکہ عقل وشعور سے کام لیا جاسکے۔ انھوں نے عوام کو منظّم کرنے کے لئے صحافت کی مشعل بھی روشن کی۔ رسالہ 'زمانہ'' میں پریم چند مستقل قلم کار تھے۔ انھوں نے ''زمانہ'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ ان وجوہات کی بنا پر پریم چند کو ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا اور ان کے ادبی ذوق کو جلا ملی۔ ء میں پریم چند ہندی کے مشہور رسالے ''مادھوری'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس رسالے کی ادارت کے دوران ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ 1930ء میں اسی پریس سے انھوں نے اپنا رسالہ ''ہنس'' بھی جاری کیا تھا۔ ''ہنس'' جاری کرنے کے بعد انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار ''جاگرن'' کے نام سے جاری کیا۔ ان ادارت سے پریم چند کو معاشی نقصانات اٹھانے پڑے لیکن انھوں نے ہمت وحوصلے کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ چونکہ ان کا مقصد ان کے ذریعہ آمدنی بڑھانا نہیں بلکہ صالح ادب کا فروغ تھا اس لئے انھوں نے نقصان کا کبھی خیال نہیں کیا۔ انھوں نے ان رسالوں کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمات انجام دیں ساتھ ہی اصلاح کا بھی کام کیا۔ پریم چند نے اپنے اصلاحی مضامین کے ذریعے سماجی اصلاح کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا اور اہل وطن کے دلوں میں جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کا حوصلہ پیدا کیا۔

''ہنس'' کے پہلے شمارے میں پریم چند نے ملک کی آزادی اور محنت کشوں کی آواز کو اپنی صحافت کا مقصد قرار دے دیا تھا اور ''ہنس'' کے مقاصد بھی اسی راہ پر کام کرتے رہیں گے۔ اپنے مقاصد کا ایسے کھلے عام اعلان کرنے کی ہمت کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔ انھیں مقاصد کو مرکز میں رکھ کر پریم چند نے اپنے رسالے کو مسلسل ترقی کی راہ پر آگے بڑھایا۔ انگریزی حکمرانوں نے سرسوتی پریس اور ہنس پر جرمانہ بھی لگایا لیکن پریم چند اپنے مقاصد سے پیچھے نہیں ہٹے۔ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انھوں نے ملک وقوم کے لئے جو کچھ بھی ہوسکا وہ کیا اور مسلسل کوشاں رہے کہ ہندوستان کو آزاد کرایا جائے اور ایک نئے بھارت کی بنیاد رکھی جائے۔

پریم چند کی صحافت نگاری بہت قوت رکھتی تھی۔ الفاظ پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ نوٹ یا تبصرے میں کیسی زبان کا استعمال ہونا چاہیے یہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا۔ جملوں کی سادگی، زبان کی سہل نگاری اور ترسیل اتنی عمدہ ہوتی تھی کہ کوئی آسانی سے چھوٹی سے چھوٹی خبر کو بھی نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔

13.9 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
جرائد	رسالے	اقتصادی	معاشی
گزٹ	سرکاری اعلان نامہ	بصری	دیکھنے سے متعلق

منطق	موثر گفتگو	صوتی	سننے سے متعلق
پُرآشوب	پریشانی	مستفید	فیض یافتہ
منظّم	ربط پیدا کرنا	سامعین	سننے والے
اشتیاق	شوق	عمرانیات	انسانی معاشرے کا علم
معراج	اوپر چڑھنا	ستون	کھمبا

ذرائع ابلاغ — وہ ذریعہ جس سے عام لوگوں تک خبریں پہنچائی جا سکے۔

13.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ ڈاکٹر افضل مصباحی، اردو صحافت آزادی کے بعد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2013ء

2۔ انور علی دہلوی، اردو صحافت، اردو اکادمی، دہلی، 2000ء

3۔ پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر سرور الہدی، اردو صحافت۔ ماضی اور حال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2012ء

4۔ پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، 2017ء

5۔ عتیق احمد، مضامین پریم چند، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 1981ء

6۔ اصغر علی انجینئر، پریم چند حیات اور فن، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، دہلی، 1981ء

7۔ پریم چند، باکمالوں کے درشن، لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، 1932ء

اکائی:14 پریم چند کے مضامین

14.1 اغراض ومقاصد
14.2 تمہید
14.3 مضمون کی تعریف وخصوصیت
14.4 مضمون کے اقسام
14.5 مضمون کے اجزائے ترکیبی
14.6 پریم چند کی مضمون نگاری
14.6.1 سوانحی مضامین
14.6.2 ادبی مضامین
14.6.3 معاشرتی مضامین
14.6.4 سیاسی مضامین
14.6.5 قومی یکجہتی سے متعلق مضامین
14.6.6 مذہبی مضامین
14.6.7 تہذیبی وثقافتی مضامین
14.6.8 تعلیم وتدریس وعلوم وفنون سے متعلق مضامین
14.7 آپ نے کیا سیکھا
14.8 اپنا امتحان خود لیجئے
14.9 سوالات کے جواب
14.10 فرہنگ
14.11 کتب برائے مطالعہ

14.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم مضمون کی تعریف جانیں گے۔

اس اکائی میں ہم مضمون کی اقسام کے بارے میں جانیں گے۔

اس اکائی میں ہم مضمون نگاری کے اجزائے ترکیبی کے متعلق جانیں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کی مضمون نگاری پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کی مضامین کے حوالے سے ادبی خدمات کا جائزہ لیں گے۔

14.2 تمہید

پریم چند کی ادبی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا خاکہ بڑا متنوع ہے۔ وہ اپنے عہد کی تقریباً تمام ادبی اور لسانی انجمنوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے رکب بھی تھے اور ان جلسوں کی صدارت بھی کرتے تھے۔ انھوں پریس بھی قائم کیا اور ناشر بھی بنے۔ 'ہنس' اور 'جاگرن' نام کے دو ہندی رسالوں کی ادارت کا کام بھی انجام دیا۔ 'زمانہ' رسالے کے لئے بھی لمبے وقت تک تحریریں اور تبصرے لکھتے رہے۔ صحافت میں بھی ان کا کارنامہ غیر معمولی نہیں ہے۔ وہ کتابوں پر بھی تبصرے لکھا کرتے تھے۔ ممبئ جا کر فلموں کے لئے انھوں نے کہانیاں بھی لکھیں۔ افسانوں اور ناولوں کے علاوہ ادبی اصناف میں انھوں نے تقریباً بیس سوانحی مضامین لکھے جو ''باکمالوں کے درشن'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے اور بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھیں۔ لیکن ان سب اصناف میں سب سے اہم چیز ان کے مضامین ہیں۔ ان کے اردو مضامین کی تعداد ساٹھ کے قریب ہوگی۔ اس میں ہندی کے مضامین شامل نہیں ہیں۔ مضامین کے موضوعات پر نظر ڈالی جائے تو یہاں بھی تنوع اور وسعت دیکھنے کو ملتی ہے جیسے ان کی دیگر تخلیقات کا خاصہ ہے۔ انھوں نے سیاسی، سماجی، اصلاحی مضامین کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ ادبی مضامین پر توجہ صرف کی۔ ان مضامین میں سنسکرت، ہندی، فارسی اور شعرا پر بھی مضامین موجود ہیں۔ اس کے علاہ ناول نگاروں، افسانہ نگاروں، فن ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، مصوروں اور فن مصوری پر بھی مضامین ان کے ادبی سرمایے کا بیش قیمتی حصہ ہیں۔ ان مضامین کی نوعیت صرف رسمی مضمون کی نہیں ہے بلکہ اس میں تنقیدی و تجزیاتی عناصر کی بھی شمولیت ہے۔ پریم چند کی دیگر اصناف کے ساتھ ہی ان کے مضامین بھی ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔

14.3 مضمون کی تعریف وخصوصیت

اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لئے دو ذرائع استعمال ہوتے ہیں۔ پہلا تحریری اور دوسرا تقریری۔ تحریری سے مراد یہ ہے کہ خیالات یا افکار و نظریات کاغذ پر لکھے ہوئے ہوں اور تقریری سے مراد یہ ہے کہ خیالات کو بول کر سنائے جائیں۔ ان دونوں طریقوں میں تحری کا اثر مستقل اور پائدار ہوتا ہے جبکہ تقریر کا اثر محدود اور مختصر ہوتا ہے۔ اس لئے اہل علم اور دانشوران اپنے خیالات کو تحریری شکل میں پیش کرتے ہیں تا کہ سامنے والے پر اس کا دیرپا اثر ہو سکے۔ تحریری شکل میں افکار و خیالات کی پیشکش کی ایک قسم مضمون نگاری بھی ہے۔ ادبی اصناف میں مضمون نویسی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کسی بھی موضوع پر ایک مربوط اور منظّم نثری تحریر کو مضمون کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے لفظ 'essay' استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ 'essay' فرانسیسی زبان کے لفظ 'essai' سے مشتق ہے جس کے معنی "to try" یا "to attempt" کے ہیں۔ یعنی کہ کچھ کہنے کی کوشش کرنا۔ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ لفظ 'essay' لاطینی زبان کے لفظ 'exagium' سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی کسی مسئلہ کو عام الفاظ میں پیش کرنا یا تحریر کرنا۔ بعض ماہر لسانیات کا خیال ہے کہ لفظ 'essai' خود عربی زبان کے لفظ 'السعی' سے ماخوذ ہے یا اس کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ 'السعی' کے لغوی معنی 'کوشش' کے ہیں جو فرانسیسی زبان کے معنی کے بہت قریب ہے۔ یعنی آسان الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ essay یا مضمون ایسی صنف ہے جس میں کسی واقعے، خیال یا موضوع پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی

جاتی ہے تا کہ اس موضوع کے ہر گوشے کو ایک جگہ سمیٹا جا سکے اور کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات کو مربوط اور مدلل انداز سے پیش کرنا کہ قاری اس کو پڑھ کر با آسانی سمجھ سکے۔ یہ ادب کی ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ لکھنے والا صاف اور واضح طریقے سے اپنے خیالات کو بلا تامل پیش کر سکتا ہے۔ایسی تحریر کو مضمون کہتے ہیں۔The Encyclopedia of America میں مضمون کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"The essay as a literacy genre is very broad, covering many subforms a wide range of subject, and a variety of styles. The essay and artistically wrought and imaginatively developed worke of nonfiction many reveal an authors personality, express his sepeculations of life or events, or make a formal statement about his attitude towards a precise objective subject."

یعنی ''ادبی طرز تحریر کے طور پر مضمون بہت وسیع ہے، جو بہت سی ذیلی اقسام، موضوع کا ایک وسیع دائرہ، اور مختلف طرز کا احاطہ کرتی ہیں۔ فنکارانہ طور پر تیار کیا گیا مضمون اور غیر فکشن کا تصوراتی طور پر تیار کردہ کام مصنفین کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے، اس کی زندگی کے مفروضوں کا اظہار کرتا ہے یا کسی معروضی موضوع اور اس کے رویے کے بارے میں ایک باضابطہ بیان دینا ہے۔''

کسی موضوع پر تحریر لکھنے کا دوسرا نام مضمون نگاری ہے۔انسان کا ذہن خیالات کا جنگل ہوتا ہے۔وہ مسلسل کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اور علم و مطالعے کی کثرت سے سوچنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت مزید پروان چڑھتی رہتی ہے۔انسان مستقل کسی نہ کسی چیز کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔وہ خود کے بارے میں، اپنے خاندان کے بارے میں، اپنے معاشرے کے بارے میں، اپنے ملک و قوم کے بارے میں اور پوری دنیا کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ان سارے موضوعات پر اس کی غور و فکر کا ایک مخصوص انداز اور مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے۔اگر وہ اپنے اس انداز فکر، زاویۂ نگاہ اور ذہن میں مرتسم خیالات کو قلم کے ذریعے ایک خاص ترتیب کے ساتھ کاغذ پر منتقل کر دے تو وہ مضمون بن جاتا ہے اور اسی منتقل کرنے کو مضمون نگاری کہتے ہیں۔دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کسی طے شدہ عنوان پر تفصیلی اور مستند معلومات جمع کر کے، اس کے ممکنہ ذیلی موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے ترتیب و تسلسل اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کا نام مضمون نگاری ہے۔

مضامین میں قلم کار اپنے ذاتی تاثرات کے ساتھ ساتھ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو بھی سلجھاتے نظر آتے ہیں۔مضمون نگاری کا موجد مونتین (Montaigne) ہے۔اس کے مضامین میں بھی زندگی کی پرکھ ملتی ہے اور یہ مضمون کسی بھی موضوع پر اس کے خیالات کی عکاسی بہ آسانی کرتے ہیں۔

ایک اچھے مضمون میں چند باتوں کا ہونا ضروری ہے:

(1) مضمون کا پیرائے بیان بالکل سادہ ہو اور اس میں کسی قسم کی پیچیدگی اور پُر تکلف اسلوب نہ ہو۔اس کو مضمون کا عیب سمجھا جاتا ہے۔

(2) مضمون میں جو خیالات یا جو باتیں لکھی جا رہی ہیں اس میں بھی دلچسپی موجود ہو، صرف الفاظ اور انداز بیان کا دلچسپ ہونا کافی نہیں ہوتا ہے۔

(3) مضمون نگار کے دل و دماغ میں جو باتیں ہوں وہ پڑھنے والے تک من وعن پہنچے۔یعنی کہ خیالات کی ترسیل مکمل طور پر ہو جس سے کہ مضمون لکھنے کا جو مقصد ہے وہ پایۂ تکمیل پا سکے۔

(4) مضمون میں جو خیالات پیش کئے جائیں، وہ اس طرح مربوط ہوں جس طرح زنجیر کی کڑیاں آپس میں جڑی رہتی ہے۔درمیان میں کسی طرح کے خلا کا احساس نہیں ہونا چاہئے۔

(5) مضمون کا ہر نیا پیراگراف دوسرے پیراگراف سے فکری سطح پر منسلک ہونا چاہیے۔

14.4 مضمون کے اقسام

مضمون درج ذیل قسم کے ہو سکتے ہیں:

(1) علمی مضمون

(2) معاشرتی وسیاسی مضمون

(3) تاریخی مضمون

(4) طنزیہ ومزاحیہ مضمون

(5) تحقیقی وتنقیدی مضمون

(6) توضیحی مضمون

(1) علمی مضمون: علمی مضامین سے مراد ایسے مضامین سے ہے جس میں علم وادب سے متعلق باتوں کا ذکر کیا جائے۔ایسے مضامین میں ادب،فن،آرٹ،فلسفہ،جغرافیہ،معاشیات،عمرانیات،اقتصادیات،سیاسیات اور سائنس وغیرہ کے موضوعات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

(2) معاشرتی وسیاسی مضمون: معاشرتی مضامین میں معاشرے کے مسائل، زندگی بسر کرنے کے طریقے اور ضروریات زندگی سے متعلق موضوعات کو پیش کیا جاتا ہے۔سیاسی مضمون میں ملک وصوبے کے سیاسی منظرنامے پر روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ سیاسی حالات پر عوام کی نظر بھی جائے اور وہ حالات کو سمجھ سکیں۔

(3) تاریخی مضمون: تاریخی مضامین وہ ہیں جن میں تاریخی واقعات وحالات کا ذکر کیا جائے۔مثال کے طور پر اکبر بادشاہ کے زمانے میں فرانسیسی سیاح برنیر ہندوستان میں سیاحت کی غرض سے آیا۔اس کی سیاحت کا مقصد ہندوستان کا گہرائی سے مطالعہ کرنا اور یہاں کے حالات پر اپنی رائے قائم کرنا تھا۔اس نے یہاں کی صنعت وحرفت، ایجاد وانکشاف اور مخصوص اشغال وذوق کو دیکھا اور اپنے مضمون میں ذکر کیا۔اس طرح کے مضمون کو تاریخی مضمون کہتے ہیں۔

(4) طنزیہ ومزاحیہ مضمون: اردو ادب میں اس قسم کے مضامین کو انشائیہ بھی کہتے ہیں۔اس طرح کے مضمون میں طنزیہ ومزاحیہ باتیں، خاکے، ہلکے پھلکے شگفتہ مضامین اور اخباروں کے کالم وغیرہ شامل کئے جاتے ہیں۔اس میں کسی بھی موضوع پر جو کچھ لکھا جاتا ہے اس میں طنز کے ساتھ مزاح بھی ہوتا ہے تاکہ ہلکے پھلکے انداز میں مضمون نگار اپنے خیالات کی ترسیل کر سکے اور قاری اس کے مقصد تک بہ آسانی رسائی حاصل کر سکے۔

(5) **تحقیقی وتنقیدی مضمون:** جب کسی ادبی موضوع پر تنقیدی وتحقیقی نقطۂ نظر سے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے تو اسے تحقیقی وتنقیدی مضمون کہتے ہیں۔اس طرح کے مضامین شعرا اور ادبا کی تخلیقات کے متعلق لکھے جاتے ہیں۔اس میں تحقیقی وتنقیدی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ادب مضمون کے لئے گہرے مطالعے کی ضرورت درپیش آتی ہے تاکہ مخصوص موضوع کا گہرائی سے احاطہ کیا جاسکے اور حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے مضمون قلمبند کیا جائے۔

(6) **توضیحی مضمون:** توضیحی مضمون اس کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع کی وضاحت کی گئی ہو۔یعنی کہ کسی بھی چیز، واقعہ یا کسی خیال کو تفصیلی انداز میں پیش کیا گیا ہو جس کے ذریعہ مخصوص موضوع کے ہر پہلو پر روشنی پڑ سکے۔اس قسم کے مضمون میں بہت گہرائی سے باتوں کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ موضوع کا کوئی بھی گوشہ اچھوتا نہ رہ جائے۔

14.5 مضمون کے اجزائے ترکیبی

ہر ادبی صنف کے کچھ اہم حصے ہوتے ہیں اور جب یہ تمام حصے اس میں یکجا ہو جاتے ہیں تو وہ اس کے مجموعے سے ایک صنف منظر عام پر آتی ہے۔کسی بھی صنف کے یہ تمام حصے اس کے اجزاء کہلاتے ہیں۔مضمون بھی چونکہ ایک صنف ہے اس لئے اس کے بھی تین اجزاء ہیں۔جب یہ تینوں اجزاء کسی تحریر میں یکجا ہو جاتے ہیں تو وہ مضمون کہلاتا ہے۔مضمون کے اجزاء درج ذیل ہیں:

(1) تمہید

(2) متن یا تفصیل

(3) اختتام یا خاتمہ

تمہید: تمہید مضمون کے شروع میں ایسی عبارت یا سطر لکھنے کو کہتے ہیں جس کے مطالعے سے ناظرین کو مضمون پڑھنے کا شوق اور ضرورت محسوس ہو۔تمہید کے لئے اختصار سے کام لینا ہوتا ہے۔اس کی ابتدا میں کبھی کبھی ایک جملہ ہی کافی ہو جاتا ہے اور کبھی ایک سے زائد جملوں سے کام لینا پڑتا ہے۔لیکن ہر صورت میں اختصار لازمی جز ہے۔اگر مضمون کی تمہید طویل ہے تو اسے عیب سمجھا جاتا ہے۔تمہید ایسی ہو کہ قاری پڑھتے ہی اس میں دلچسپی لینے لگے اور اس کی توجہ مضمون کی جانب ہو جائے۔مضمون کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار کافی حد تک تمہید کے اوپر ہی ہوتا ہے۔لہٰذا یہ کوشش کرنی چاہیے کہ تمہید میں لکھے جانے والے جملے مختصر، جامع اور دل آویز ہوں اور ان میں ایسی رعایت مخفی ہو کہ اس کو پڑھنے میں ذہن متن مضمون کی جانب بہ آسانی منتقل ہو جائے۔

متن یا تفصیل: تمہید کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔اس حصہ میں عنوان سے متعلق جملہ معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔اس حصے کو نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کیا جاتا ہے کیونکہ یہی پورے مضمون کا اہم حصہ ہوتا ہے۔مضمون نگار اس حصہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔اس میں مضمون نگار کو تمام خیالات کو منظّم اور مربوط انداز میں سلیقے کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مضمون نگار جو بھی خیالات پیش کرے اس کا انداز مدلل ہو۔اس سے کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے اور خوش اسلوبی کے ساتھ وہ مضمون کے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچادے۔یہ حصہ جس قدر عمدہ ہو فا مضمون اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

خاتمہ: مضمون کے آخری حصے میں ایسی تحریر لکھنی چاہیے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ مضمون اختتام کی جانب ہے۔اختتام مضمون میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جن خیالات کو پیش کیا جارہا تھا ان سے قاری بھی اتفاق کرے اور اس کے ذہن میں وہ ساری باتیں

بیٹھ جائیں جو مضمون میں موجود ہیں۔ مضمون کا خاتمہ ایسی عبارت پر ہونا چاہئے جو نہ صرف پُر اثر ہو بلکہ قاری کو غور وفکر کی بھی دعوت دے۔ ایک پُر اثر اور اچھا مضمون ہمیشہ اپنے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

14.6 پریم چند کی مضمون نگاری

پریم چند نے مضمون مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں اور ان کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ انھوں نے سوانحی مضامین، ادبی مضامین، معاشرتی مضامین، سیاسی مضامین، قومی یکجہتی سے متعلق مضامین، مذہبی مضامین، تہذیبی وثقافتی مضامین اور تعلیم وتدریس وعلوم وفنون سے متعلق مضامین لکھے۔ ان مضامین کے مطالعے سے مختلف موضوعات پر ان کے افکار ونظریات کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ یہ تمام مضامین ان شخصیات کی مختلف النوع خدمات کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کاوش ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے ایک طرف تو معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہیں دوسری جانب ان شخصیات کے متعلق پریم چند کا جو نقطۂ نظر رہا ہے اس کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان مضامین سے پریم چند کے وسیع مطالعے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

14.6.1 سوانحی مضامین

پریم چند رنے مختلف تاریخی، مذہبی، سیاسی اور ادبی شخصیات پر سوانحی مضامین لکھے ہیں جن میں کچھ مضامین مختصر ہیں اور طویل ہیں۔ ان سوانحی مضامین کا مجموعہ دو جلدوں میں ''باکمالوں کے درشن'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پہلی جلد 1928 میں اور دوسری جلد 1932 میں منظر عام پر آئی۔ ان جلدوں میں جن شخصیات کے اوپر مضامین لکھے ہیں ان کے نام ہیں۔ اکبر اعظم، راجہ ٹوڈرمل، راجہ مان سنگھ، رانا پرتاپ سنگھ، رنجیت سنگھ، گوپال کرشن گوکھلے، ٹامس گینس برو، گیری بالڈی، سوامی وویکانند، رینالڈس، رام کرشن بھنڈارکر، جون آف آرک، رانا جنگ بہادر، سر سید احمد خاں، مولانا وحید الدین سلیم، بدر الدین طیب جی، مولوی عبد الحلیم شرر، منشی بشن نرائن وغیرہ۔ ان مضامین کے علاوہ اور بھی شخصیات پر مضامین موجود ہیں جو ان دو جلدوں میں شامل نہیں ہیں بلکہ مختلف اخبار ورسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

اکبر اعظم پر پریم چند نے جو مضمون لکھا ہے اس میں اکبر کے سوانحی حالات قلمبند کئے ہیں۔ اس میں اکبر اعظم کے والد ہمایوں کی بے سروسامانی اور مشکلات، اپنوں کیسے وفائی اور بے مروتی کے ساتھ غریب الوطنی کا ذکر بہت ہی رقت آمیز اسلوب میں کیا گیا ہے۔ مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے اکبر کی پیدائش کے وقت ہمایوں کے حالات بہت خراب تھے اور انھیں مشکل حالات میں اکبر نے پرورش پائی اور بہت کچھ سیکھا۔ پریم چند نے اکبر کی سیرت وکردار، مردم شناسی، طرز حکمرانی، معاملہ فہمی، جنگی حکمت عملی اور فوج کے نظم ونسق وفتوحات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

راجہ ٹوڈرمل بادشاہ اکبر کے دربار میں نورتنوں میں سے ایک رتن تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں اس کی قسمت چمکی اور اکبر نے اس کو بہت عزت بخشی۔ ابتدا میں اس نے اکبر کی حکموت میں ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں لیکن بعد میں اپنی زبردست انتظامی اور مالیاتی صلاحیتوں کے پیش نظر اسے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اس مضمون میں راجا ٹوڈرمل کی شخصیت ومزاج اور اس کی جملہ خدمات کے تمام نشیب وفراز کو قلمبند کیا گیا ہے۔

راجہ مان سنگھ بھی بادشاہ اکبر کے دربار میں نورتنوں میں سے ایک رتن تھا۔ یہ ایک امیر راجپوت راجہ بھگوان داس کا بیٹا تھا۔ وہ نہایت بہادر اور پُر جوش جنگجو تھا۔ اس مضمون میں پریم چند نے اس کی بہادری اور وفاداری کے کئی قصے لکھے ہیں۔ بادشاہ اکبر نے اسے جب کبھی بھی

جیسی بھی ذمہ داری سونپی اس نے بحسن وخوبی پورا کیا۔اس مضمون سے راجہ مان سنگھ کے کارناموں کا پتہ چلتا ہے۔

رانا پرتاپ سنگھ کے بارے میں پریم چند نے لکھا ہے کہ میواڑ کی سسو ڈیہ راجپوت سلطنت کا تیرہواں حکمران تھا۔اکبر کے دور حکومت میں جتنے بھی راجپوت راجہ گزرے ہیں ان تمام میں سب سے زیادہ غیور، حمیت قومی سے معمور اور خوددار تھا۔اس مضمون میں پریم چند نے رانا پرتاپ کے بچپن سے لے کر وفات تک کے واقعات کا احاطہ کیا ہے۔

مضمون گوپال کرشن گوکھلے میں انھوں نے گوکھلے کے سیاسی وسماجی اور تعلیمی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ گوکھلے متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ قابل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے صحافی بھی تھے۔انھوں نے اپنی پُر جوش تقریروں سے عوام کو سیاسی اور سماجی طور پر بیدار کرنے کا کام کیا۔اس مضمون میں گوکھلے کی سیرت وکردار اور قومی خدمات کا ذکر بھرپور انداز میں ملتا ہے۔

14.6.2 ادبی مضامین

غیر افسانوی نگارشات میں ایک بڑی تعداد پریم چند کے ادبی مضامین کی ہے۔انھوں نے کتابوں پر تبصرے، دیباچے اور شعرا پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ان مضامین کے ذریعہ پریم چند کی تنقیدی بصیرت اور تجزیاتی صلاحیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ناول ''کرشن کنور'' پر لکھا ہوئے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک تاریخی ناول ہے جسے کا انداز غیر ادبی ہے۔مضمون کی ابتدا میں پریم چند ناول کی تعریف اور اس کے فن پر بات کرتے ہیں اور اس کے بعد پورے ناول کا فنی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

''آئین قیصری'' اور ''محاربات عظیم'' مولوی ذکا اللہ کی دو تاریخی تصانیف ہیں۔پریم چند کا یہ مضمون مذکورہ دونوں کتابوں کے تنقیدی جائزہ پر مشتمل ہے۔اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ 'کتاب آئین قیصری' میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے ہندوستان کی معاشی، سیاسی، سماجی، تعلیمی، تجارتی اور دفتری امور میں اصلاحات اور ترقی کو پیش کرتی ہے۔پریم چند کا خیال ہے کہ برٹش حکومت کے طرز حکمرانی کو ذکا اللہ نے مبالغہ کے ساتھ لکھا ہے۔دوسری کتاب 'محاربات عظیم' میں پریم چند نے لکھا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے دور حکومت میں تمام اہم واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے۔اس کتاب کے متعلق پریم چند کا خیال ہے کہ اس کی طرز تحریر ناقص ہے۔

'ڈرامہ جنگ روس وجاپان' مولوی ظفر علی خاں کا ڈرامہ ہے۔یہ ایک تبصراتی مضمون ہے جس کو پریم چند نے ایک کمزور ڈرامہ بتایا ہے اور اس میں فن ڈرامہ کی کوئی خاصیت موجود نہیں ہے۔

مضمون 'اردو زبان اور ناول' ناول نگاری کی صورت حال اور اس کی بے قدری کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔پریم چند نے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ عہد حاضر میں ناول کے قاری کم ہو گئے ہیں۔ناول کی بے قدری کے متعلق پریم چند لکھتے ہیں کہ اکثر ناول نگار مسلم ہیں اور ان کے ناول کے ہیرو بھی مسلم ہیں لیکن ہیروئن ہندو ہے اس کی وجہ سے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔اس سے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اردو کے مسلم ناول نگاروں کے اس انداز کی وجہ سے غیر مسلم اردو داں طبقے میں اردو ناول جیسی پزیرائی ہونی چاہیے ویسی ہوئی نہیں۔

پنڈت سدرشن کے افسانوی مجموعے 'بہارستان' کے دیباچہ کو بھی پریم چند نے لکھا ہے۔اس دیباچے میں سدرشن کے فکر وفن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔پریم چند نے سدرشن کے افسانوں میں سادگی اور اسلوب کی دلکشی کو بطور خاص اجاگر کیا ہے۔اس دیباچے سے تصنیف وتالیف اور شعروادب سے متعلق پریم چند کے خیالات ونظریات اور مقصد کا صاف صاف اندازہ ہوتا ہے۔

مضمون 'علامہ راشد الخیری کے سوشل افسانے' میں پریم چند نے ان کی افسانہ نگاری کی خصوصیت، ان کی فکر ونظر، معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں ان خیالات ونظریات اور ان کے اسلوب نگارش پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔پریم چند نے لکھا ہے کہ مسلم معاشرے کی اصلاح راشد

الخیری کا اصل مقصد تھا اور اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

مضمون 'کلام اکبر پر ایک نظر' میں پریم چند نے اکبر الہ آبادی کے کلام، ان کے افکار و خیالات، موضوعات، ان کی زبان و اسلوب کی تفہیم بڑے دلکش پیرائے میں کی ہے۔ پریم چند نے کلام اکبر کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ان کے سنجیدہ کلام پر روشنی ڈالی ہے اور دوسرے حصے میں ان کے ظریفانہ کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

14.6.3 معاشرتی مضامین

پریم چند نے اپنی افسانوی تخلیقات کے ذریعہ معاشرتی مسائل کی جانب توجہ تو کی ہی ہے لیکن معاشرتی موضوعات پر لکھے گئے مضامین میں انھوں نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان مضامین کے ذریعے وہ سماجی فکر اور مصلح ملت کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

مضمون 'خاندان مشترکہ' میں پریم چند نے مشترکہ خاندان کے فوائد اور نقصانات کا تفصیلی طور پر جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ آج کے دور میں مشترکہ خاندان کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح کی طرز زندگی سے انسان اپنی من پسند زندگی گزارنے سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی آزادی مجروح ہو جاتی ہے۔

مضمون 'مہاجنی تمدن' میں پریم چند نے دور جدید کے انسان کی دولت پرستی اور پیسے کی حرص پر چوٹ کی ہے۔ اس میں انھوں نے سود خوری کے نظام کو بھی نشانہ بنایا ہے جس کے ذریعہ مہاجن اور بینکر لوگ پیسے کی لالچ کے چکر میں اپنا ایمان کھو دیتے ہیں۔ انھیں جائز و ناجائز کا کچھ بھی علم نہیں ہوتا۔

پریم چند نے خواتین کی بہبودی کے متعلق بھی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے خواتین کے حقوق کے تحفظ کی حمایت کی اور مسائل کے حل کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ ایسے مضامین میں 'ناری جاتیوں کے ادھیکار'، 'طلاقوں کی سنکھیا کیوں بڑھتی جا رہی ہے'، 'ودھواؤں کے گزارے کا بل' وغیرہ اہم ہیں۔ ہندو مذہب میں خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف پریم چند نے ہمیشہ آواز اٹھائی ہے۔ خواتین کے حقوق اور جائداد میں ان کے حصے کے حق پر بھی انھوں نے لکھا ہے۔ طلاق کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اس کی روک تھام کے لئے بھی انھوں نے کارآمد مشوروں سے نوازا ہے۔

چھوا چھوت اور اندوشواس کے متعلق بھی پریم چند نے قلم اٹھایا ہے۔ ایسے مضامین میں 'اچھوتوں کو مندروں میں جانے دینا پاپ ہے'، 'مندر پرویش اور ہریجن' اور 'مندر پرویس اور سرکار' کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ 'اچھوتوں کو مندروں میں جانے دینا پاپ ہے' کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسکول میں زیر تعلیم اعلیٰ ذات کے طالب علموں نے کاشی میں احتجاجی جلوس نکالا تھا جس میں یہ نعرہ لگایا گیا تھا کہ اچھوتوں کو مندروں میں جانے دینا پاپ ہے۔ اس مضمون میں پریم چند نے اسی بات پر ناراضگی جتائی ہے اور اسے ہندوؤں کے لئے شرمناک قرار دیا ہے۔ 'اندھوشواش' کے زیر عنوان مضمون میں پریم چند نے لکھا ہے کہ کچھ ہوشیار قسم کے لوگ سادھو، سنت، سنیاسی اور جوگی بن کر لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ عوام کو اس سے بچ کر رہنے کی ضرورت ہے۔ معاشرتی برائیوں کے خلاف پریم چند نے بڑھ کر آواز اٹھائی۔ چاہے بچوں کی شادی کو مسئلہ ہو، بیواؤں کے ساتھ برے سلوک کا مسئلہ ہو، ہریجنوں کو مسئلہ ہو یا سماجی نابرابری کا مسئلہ ہو، ہر موضوع پر پریم چند نے بیباک ہو کر لکھا اور اصلاح کی کوشش کی۔

14.6.4 سیاسی مضامین

پریم چند کا سماجی شعور تو پختہ تھا ہی ان کا سیاسی شعور بھی بالیدہ تھا۔ وہ اپنے عہد کی تمام تحریکات سے بخوبی واقف تھے۔ قومی اور بین

الاقوامی سیاسی حالات پران کی گہری نظر تھی۔ سیاسی موضوعات پر انھوں نے ہندی زبان میں زیادہ تر مضامین لکھے ہیں۔ اردو زبان میں جو مضامین موجود ہیں ان میں ''سودیشی تحریک''، ''آزادی کی لڑائی''، ''موجودہ تحریک کے راستے میں رکاوٹیں'' اور ''ترکی میں آئینی سلطنت'' شامل ہیں۔ مضمون ''سودیشی تحریک'' جب لکھا گیا اس وقت ملک میں سودیشی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کو شروع کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوستان میں بنی چیزوں کا استعمال زیادہ سے زیادہ کیا جائے اور ودیشی مال کو نہ خریدا جائے۔ اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لوگوں کو جتنے کپڑے کی ضرورت تھی اتنا کپڑا یہاں تیار نہیں ہو پاتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ولایت میں بننے والا کپڑا ہندوستانی کپڑوں کی بنسبت مہین ہوتا تھا۔ ہندوستان کے رئیس لوگ اور ولایت سے واپس آئے لوگ ودیشی باریک کپڑے کو پسند کرتے تھے۔ اس لئے کپڑوں کے معاملے میں سودیشی تحریک ناکام ہو رہی تھی۔

''آزادی کی لڑائی'' طویل مضمون ہے۔ اس کے چھ حصے ہیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں ''آزادی کی لڑائی''، ''کیا مسلمان کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں؟''، ''آزادی کی لڑائی میں کون آگے ہیں؟''، ''دیہاتوں میں پروپیگنڈے کی ضرورت''، ''ہندو مسلم بانٹ بکھرے کا پرشن'' اور ''مشین گن اور شانتی''۔ مضمون کے پہلے حصے میں مہاتما گاندھی کے ذریعہ شروع کی گئی تحریک نمک ستیہ گرہ کی تعریف کی گئی ہے۔ کیونکہ انگریزوں نے نمک جیسی چیز پر بھاری ٹیکس لگایا تھا جس کی مخالفت گاندھی جی نے کی تھی۔ مضمون کے دوسرے حصے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انگریزوں نے یہ افواہ پھیلا رکھی تھی کہ مسلمان کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں۔ اسی افواہ کی پُر زور تردید میں پریم چند نے مدلل بحث کی ہے۔ مضمون کے تیسرے حصے میں پریم چند نے لکھا ہے کہ آزادی کی لڑائی میں انھیں یہ امید تھی کہ یونیورسٹیوں کے پروفیسران اس میں حصہ لیں گے لیکن ایک بھی پروفیسر نے اس میں حصہ نہیں لیا اور طالب علموں کی بھی کوئی خاص تعداد اس تحریک میں سامنے نہیں آئی۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ وکیلوں کے ایک بڑے طبقے نے بھی خود کو آزادی سے دور رکھا۔ اس طرح پریم چند نے ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو آزادی کی تحریک میں پیچھے ہٹ گئے۔ چوتھے حصے میں پریم چند نے لکھا ہے کہ تمام تحریکات جیسے نمک ستیہ گرہ اور سودیشی تحریک سب شہروں تک ہی محدود رہ گئی ہے انھیں گاؤں اور قصبوں میں بھی جانا چاہئے تا کہ بڑی تعداد میں لوگ اس کا حصہ بن سکیں۔ اس مضمون میں اس دور کے ہندوستان کی ہنگامہ خیز صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند نے آزادی کے لئے بہت کوششیں کیں۔

مضمون ''موجودہ تحریک کے راستے میں رکاوٹیں'' میں پریم چند نے حصول آزادی میں سامنے آنے والے والی دقتوں اور پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت 'عدم تعاون تحریک' بھی شروع ہو گئی تھی لیکن اس میں جتنا زور ہونا چاہئے تھا اور جتنی تعداد میں لوگ شامل ہونے چاہئے تھے وہ نہیں ہو سکا تھا۔ پریم چند کا خیال تھا کہ اس کی وجہ ہندوستان کی غریبی ہے۔ جہاں سارا معاملہ معاشی مسائل پر آ کر رک جاتا ہے ایسے میں کامیابی کی امید رکھنا فضول ہے۔ پریم چند نے اس وقت کے ملکی حالات، معاشی مجبوریوں اور عوام کی نفسیات کا احاطہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوراج کی راہ بہت مشکل ہے۔ سوراج حاصل کرنے میں اور بھی بہت ساری رکاوٹوں کا تفصیلی ذکر اس مضمون میں موجود ہے۔

مضمون ''ترکی میں آئینی سلطنت'' میں پریم چند نے لکھا ہے کہ ہندوستان اور مصر کی طرح ترکی میں بھی نوجوان محبان وطن کی جماعت پیدا ہو گئی تھی تو تقریر و تحریر کی آزادی اور ملک کے لئے آئین کی ضرورت کو لے کر عوام میں بیداری پیدا کر رہی تھی۔ چنانچہ سلطان عبدالحمید نے عوام کی رائے کا احترام کیا اور آئینی حکومت کا اعلان کر دیا۔

سیاست کے موضوع پر لکھے مضامین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سیاسی منظر نامے پر بھی نظر رکھتے تھے اور ان پر غور و فکر کیا کرتے تھے۔

14.6.5 قومی یکجہتی سے متعلق مضامین

پریم چند قومی یکجہتی کے زبردست حمایتی تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور انسان دوستی کے حامل ادیب تھے۔ انھوں نے ایسے کئی مضامین لکھے جس میں قومی یکجہتی کا پیغام دیا گیا ہے اور ملک میں امن و امان کے قیام کو فروغ دینے کی بات کی گئی ہے۔ ان مضامین میں ''ملکانہ راجپوت مسلمانوں کے شدھی''، ''قحط الرجال''، ''قومی اتحاد کیونکر ہوسکتا ہے'' اور ''اردو میں فرعونیت'' اہم ہیں۔

مضمون ''ملکانہ راجپوت مسلمانوں کے شدھی'' پریم چند نے 'شدھی تحریک' اور اس تحریک کی جانب سے ملکانہ راجپوت مسلمانوں کے مذہب کو تبدیل کرنے کے تناظر میں لکھا ہے۔ سوامی دیانند سرسوتی کے جانشین سوامی شردھانند نے اس تحریک کو بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں شروع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تحریک کے تحت آٹھ ہزار مسلمانوں کو ہندو بنایا گیا تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو دھرم میں واپس لایا جائے۔ ملکانہ راجپوت کو جب ہندو بنانے کی مہم شروع کی گئی تو فرقہ وارانہ تنازعہ پیدا ہو گیا۔ پریم چند خود آریہ سماجی تھے لیکن آریہ سماج کی جانب سے چلائی جانے والی اس تحریک کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد قائم رہے اور آریہ سماج والے جب کسی کو ہندو بناتے تو اس کی تشہیر کرتے جس سے فساد پیدا ہوتا تھا۔ انھیں شدھی تحریک کے پس پردہ سیاسی مفاد سمجھ میں آ گیا تھا اس لئے انھوں اس مضمون میں اس کی کھل کر مخالفت کی جس کی وجہ سے قومی اتحاد کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔

مضمون ''قحط الرجال'' ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت، قومی یکجہتی اور آپسی محبت کی اہمیت و افادیت کو سامنے لاتا ہے۔ یہ اس وقت لکھا گیا جب شدھی تحریک اور سنگٹھن کی جانب سے جارحانہ سرگرمیاں شدت پکڑ چکی تھیں۔ ان تحریکات نے ہندوؤں کو یہ بتایا کہ ان کا مذہب خطرے میں ہے اور مسلمانوں کے خلاف بدگمانیاں پیدا کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہندو قوم مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔ پریم چند لکھتے ہیں کہ ہندو قوم مسلسل جزر و تشدد سے کام لے رہی تھی جبکہ مسلمان ہمت اور صبر کو ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ پریم چند کو امید تھی کہ کانگریس کے لیڈر بھگوان داس، پنڈت نہرو، لالہ سری پرکاش وغیرہ شدھی اور سنگٹھن کے خلاف آواز بلند کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مضمون سے اندازہ ہوتا ہے پریم چند مذہب سے اوپر اٹھ کر ملک و قوم کی فلاح چاہتے تھے۔

مضمون ''قومی اتحاد کیونکر ہوسکتا ہے'' بھی ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے متعلق لکھا گیا ہے۔ اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت فرقہ وارانہ فسادات زوروں پر تھے۔ پہلے صرف گاؤکشی اور قربانی کے مسئلے پر ہنگامے ہوا کرتے تھے لیکن اب نماز، اذان، شنکھ، جلوس وغیرہ پر بھی تنازعے ہوتے رہتے تھے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے ایسے کاموں کے پیچھے دانشوروں اور اہل علم طبقے کا ہاتھ ہے۔ آزادی کے لئے اتحاد ضروری ہے لیکن فرقہ واریت نے سب کچھ خاک کر دیا۔ اس مضمون میں انھوں نے تنگ نظری اور تعصب کو چھوڑ کر متحد رہنے پر زور دیا ہے۔

14.6.6 مذہبی مضامین

پریم چند نے مذہبی مضامین بھی لکھے ہیں۔ وہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے تھے اس لئے مورتی پوجا کے قائل نہیں تھے۔ مذہبیت ان کے مزاج پر غالب نہیں تھے بلکہ وہ عقلیت پسند اور آزاد خیال کے شخص تھے۔ تنگ نظری اور تعصب سے وہ کوسوں دور تھے۔ انھوں نے مذہبی تعلیمات اور مذہبی رہنماؤں پر مضامین لکھے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں تمام مذاہب کے لئے احترام تھا اور تمام رہنماؤں کے لئے عقیدت بھی رکھتے تھے۔ ان کے مذہبی مضامین میں ''رہنمایان ہند''، ''بھرت''، ''حضرت محمد کی پنیہ اسمرتی'' وغیرہ اہم ہیں۔

''رہنمایان ہند'' میں پریم چند نے اولً ہندو مذہب اور اس کے عقائد و اذکار کا مختصراً تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد پچھلے وقت

سے لے کر عہد حاضر تک کے اہم ہندو مذہبی رہنماؤں کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے روحانی کمالات اور خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔اس کے بعد ہندو مذہب کی کتابوں جیسے ویدوں، اپنیشدوں، اسمرتیوں اور گیتا وغیرہ کی اہمیت اور ان میں موجود تعلیمات اور ہدایات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اس مضمون میں پریم چند نے لکھا ہے کہ ہندو مذہب میں غیر مجسم یا غیر مرئی اور مجسم دونوں قسم کے خدا کی پرستش کی گنجائش ہے۔ان کے خیال میں ہندو مذہب میں اتنی وسعت ہے کہ ایک ہندو شخص دنیا کے ہر نبی اور پیغمبر کی بلا تکلف پرستش کر سکتا ہے۔انھوں نے ہندو مذہب کے رہنماؤں کو دو درجوں میں بانٹا ہے۔اول میں وہ بھگوان کے اوتاروں جیسے شری رام، شری کرشن اور گوتم بدھ وغیرہ کو رکھتے ہیں۔دوم میں وہ ریشیوں اور علمائے مذہب، شنکراچاریہ، رامانج، سری رام کرشن جیسی شخصیات کو رکھتے ہیں۔ان تمام کے بارے میں اس مضمون میں تفصیلی گفتگو درج ہے۔

مضمون ''بھرت'' میں پریم چند نے شری رام کے سوتیلے بھائی بھرت کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔بھرت کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ان میں صبر وضبط، اعلیٰ ہمتی اور بے نفسی رام سے بہت زیادہ تھی لیکن ان سب کے باوجود ان کو اتنی شہرت ومقبولیت نہیں سکی۔رام سے بھرت کی عقیدت ومحبت، ان کی قربانی، صاف باطن اور صداقت کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔رام کے بن واس جانے کے بعد وہ راج گدی کی پیشکش کو ٹھکرا کر ان کی کھڑاؤں کو راج گدی پر رکھ کر ان کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں۔دوسری طرف رام ان سے اتنا بدگمان ہیں کہ ہنومان کو بھیج کر بن واس سے واپسی پر بھرت کے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہتے ہیں۔پریم چند نے بڑی مہارت کے ساتھ بھرت کے بے عیب، بے داغ اور بلند کردار اور ان کی دلکش شخصیت کو پیش کیا ہے۔

مضمون ''حضرت محمد کی پنیہ اسمرتی'' ایک چھوٹا سا مضمون ہے جس میں انھوں نے اسلام کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی سیرت وکردار پر گفتگو کی ہے۔تاریخ دانوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ اسلام تلوار کی زور پر پھیلا اور اس نے جنگ کی تعلیم دی۔پریم چند نے اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا اور اس سے ہندوؤں کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی۔پریم چند کے مذہبی مضامین ان کی غیر جانبدارانہ رویے اور مذہبی وسعت نظری کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

14.6.7 تہذیبی وثقافتی مضامین

پریم چند کے ادبی خزانے میں تہذیب وثقافت اور آرٹ وفن سے متعلق مضامین بھی موجود ہیں جس سے فنون لطیفہ اور تہذیب و ثقافت سے ان کی دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ان میں ''ہندو تہذیب اور رفاہ عام''، ''دور قدیم وجدید''، ''ہنسی''، ''گالیاں''، ''فن تصویر'' اور ''ہندوستانی مصوری'' کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

مضمون ''ہندو تہذیب اور رفاہ عام'' یورپ کے ان دانشروان اور مصنفین کے اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ہندوستانی تہذیب میں رفاہ عامہ اور عوامی فلاح و بہبودی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔اس طرح کے تھوڑے بہت جو کام ہو رہے ہیں وہ عیسائی مشنریوں سے تحریک پا کر اور یورپی عوام کے جذبۂ خدمت خلق کو دیکھ کر کئے جا رہے ہیں۔پریم چند نے لکھا ہے کہ یہ اعتراضات جھوٹ ہیں۔انھوں نے ان اعتراضات کا جواب بہتر طریقے سے دیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ممکن ہے مادی تکلفات اور آسائشوں کے لحاظ سے قدیم ہندوستانی تہذیب کا پلّہ ہلکا نظر آئے لیکن روحانی اور اخلاقی اعتبار سے وہ بلندی پر ہے۔یہ مضمون قدیم ہندو تہذیب کے ان روشن پہلوؤں کو بہتر طریقے سے پیش کرتا ہے جن کا تعلق رفاہ عامہ اور فلاح و بہبودی سے ہے۔اس میں کئی تاریخی حوالے اور شواہد بھی موجود ہیں۔

مضمون ''دور قدیم وجدید'' میں پریم چند نے قدیم تہذیب کے اقدار، خصوصیات، اس کے امتیازات اور انسانی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں اس کے کردار اور آدمی کو انسان بنانے کے جوہر پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد جدید تہذیب کے نقائص خود پروری، حسن اخلاق سے دوری، خودغرضی، مادی ذہن، شہرت کی خواہش، تکلفات، ریاکاری اور دولت کی ہوس جیسے منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ پریم چند دور قدیم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دور میں نفس اور اخلاق کی تہذیب تھی۔ تہذیب میں کئی تصنع اور بناوٹ نہیں تھی۔ اب اخلاقی پہلو خارج کر دیا گیا ہے اور خود پسندی کا عروج ہے۔ ہر قوم خود کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھ رہی۔ پریم چند اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ وقت کے ساتھ پرانی قدریں منہدم ہوگئی ہیں۔

مضمون ''ہنسی'' انوکھا اور پُر لطف موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر پریم چند نے تہذیبی، نفسیاتی اور ادبی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ہنسی کے تعلق سے لکھا ہے کہ پرانے زمانے میں درباری مسخرے ہر ملک وقوم کے دربار میں ہوتے تھے۔ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مضمون کے آخری حصے میں انھوں نے سنسکرت ادب کے کچھ ظریفانہ نمونے بھی پیش کئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ طنز و ظرافت ابتدا سے ہی ہر ادب کا لازمی حصہ رہی ہے۔

مضمون ''فن تصویر'' میں فن مصوری کی تشریح وتوضیح، اس کی باریکیوں، فوٹو گرافی اور مصوری کے امتیازات، یورپ میں مصوری کے آغاز وارتقا اور ہندوستانی مصوری جیسے امور پر مختصراً گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے شاعری اور مصوری کا موازنہ بھی کیا ہے۔ ہندوستانی مصوری کے بارے میں پریم چند نے لکھا ہے کہ یہاں فن مصوری درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اجنتا اور ایلورہ کی غاروں میں بنائی گئی تصویریں ہندوستان میں اس فن کو عروج کمال تک پہنچا دیتی ہیں۔ دور اکبر میں بھی مصوری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ بررون ملک کے فن مصوری پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

14.6.8 تعلیم وتدریس وعلوم وفنون سے متعلق مضامین

پریم چند ایک مصلح قوم کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ تعلیم وتدریس اور مختلف علوم وفنون اور صنعت وحرفت سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ اس کی وجہ سے پریم چند نے مختلف قدیم وجدید علوم وفنون پر بھی مضامین ومقالات قلمبند کئے ہیں۔ پریم چند پیشے سے مدرس تھے اس لئے درس وتدریس کے مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اس قسم کے مضامین میں ''زراعتی ترقی کیوں کر ہوسکتی ہے''، ''دیسی اشیا کیوں کر فروغ ہوسکتا ہے''، ''صوبۂ متحدہ میں ابتدائی تعلیم''، ''کلا بھون''، ''ہندو فن حکمت''، ''قدیم ہندو علم ریاضی''، ''ہاتھی دانت''، ''ہندوستانی ریلوں کی ساٹھ سالہ تاریخ'' وغیرہ شامل ہیں۔ مضمون ''زراعتی ترقی کیوں کر ہوسکتی ہے'' ہندوستان میں زراعت کے مسائل اور اس کے حل کے حوالے سے لکھا ہے۔ آبادی کی کثرت اور اناج کی قلت کے مسئلے پر پچھلے ڈیڑھ سو سال سے مغربی ممالک کے دانشوران غور وفکر رہے ہیں کہ آبادی کو کم کرنا مسئلے کا بہتر حل ہے۔ لیکن پریم چند کا خیال ہے کہ اناج کی پیدائش کو بڑھانے کے طریقوں پر توجہ دینی چاہئے۔ اس ضمن میں انھوں نے انگلستان، فرانس اور ڈنمارک میں ہونے والی زراعتی ترقی کا حوالہ دیتے ہوئے ہندوستان میں زراعتی نظام کی ترقی پر زور دینے کی بات کہی ہے۔ اس کے بعد پریم چند کاشتکاروں کی تعلیم پر بھی توجہ دینے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ تعلیم کی مدد سے انھیں جدید زراعتی تکنیک کو سمجھنے میں مدد ملے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دیہاتوں کے مدرسوں کو بھی کاشتکاری میں کسانوں کی مدد کرنے کے لئے تجویز پیش کی ہے۔

مضمون ''دیسی اشیا کیوں کر فروغ ہوسکتا ہے'' میں پریم چند نے ہندوستان میں بننے والی چیزوں کی خرید وفروخت کے بارے میں تجاویز پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک میں بننے والی دیسی چیزوں کو خریدنا اور ان کے استعمال کو بڑھاوا دینا چاہئے تاکہ

ملک معاشی طور سے مضبوط بن سکے۔اس ضمن میں انھوں نے دیسی چیزوں کے اشتہارات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ بازاروں،گلیوں اور عوامی مقامات پر اشتہارات چسپاں کئے جائیں تا کہ شہر کے لوگ ان اشیا کے بارے میں جانیں اور اسے خریدیں۔ساتھ ہی انھوں نے لکھا ہے یہی کام شہری علاقوں کے علاوہ گاؤں میں بھی شروع کرنا چاہئے اور ایسی جگہوں پر دیسی اشیا کم قیمت پر مہیا کرائی جائے۔ملک کے معیشت کو فروغ دینے کے لئے انھوں اس طرح کی کئی کارآمد تجاویز پیش کی ہیں۔

اپنے مضمون ''صوبۂ متحد میں ابتدائی تعلیم'' میں بطور مدرس انھوں نے اپنے تجربات پیش کئے ہیں۔ پریم چند نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس میں گزارا۔اس دوران انھوں نے شہروں کے ساتھ ہی دیہاتوں میں بھی پڑھایا۔لوور پرائمری سے لے کر اسکول تک کے نصاب سے ان کی واقفیت تھی۔جس کی وجہ سے وہ تمام تعلیمی مسائل سے آگاہ تھے۔آزادی سے قبل آگرہ اور اودھ کو صوبۂ متحدہ کہا جاتا تھا۔ان دونوں صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنایا گیا تھا۔اس مضمون میں اسی صوبے کی ابتدائی تعلیم کی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کا نظام بہت کمزور تھا۔ یہاں کے تعلیمی نصاب میں اصلاح کی ضرورت تھی۔حکومت پچاس بچوں پر صرف ایک مدرس کا تقرر کرتی تھی اور اس پر ڈاک خانے کے کام کا بھی بوجھ ڈالا جاتا تھا۔وہ اسی نظام میں اصلاح چاہتے تھے اور مدرس کی کم تنخواہ کو بڑھانے کی سفارش بھی کی تھی۔

''کلا بھون'' کے نام سے بڑودہ ریاست کے مہاراجہ نے ایک نہایت معیاری اور عصری تقاضوں کی تکمیل کرنے والا صنعتی کالج قائم کیا تھا جس کا نام انڈسٹریل کالج تھا۔ مذکورہ مضمون اسی کالج کے تعارف اور معیار تعلیم پر مرکوز ہے۔ پریم چند نے اس فلاحی کام کے لئے ریاست کے مہاراجہ کی تعریف بھی کی ہے اور ان کا احسان بھی مانا ہے۔اس مضمون میں کالج میں چلنے والے کورسز، داخلے کے طریقے، وظائف کی سہولت اور عملی تربیت کے معیار وغیرہ پر مفصل گفتگو کی ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ ہمارے ملک کو اسی طرح کے کالجوں کی ضرورت ہے تا کہ طلبا روزگار حاصل کر سکیں۔

مضمون ''ہاتھی دانت'' ہاتھی کے دانت کے سلسلے میں معلوماتی مضمون ہے۔اس میں ہاتھی دانت سے بنائی جانے والی اشیا، ہاتھیوں کی اقسام، ان کے دانتوں کی اقسام پر خصوصی معلومات موجود ہے۔سب سے پہلے پریم چند نے انسانوں اور جانوروں کے دانتوں کی ساخت اور اس کے استعمالات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دانت تین قسم کے ہوتے ہیں قینچی نما، نوکیلے اور چکّی جیسے۔ پہلے قسم کے دانت کترنے کے کام آتے ہیں۔ دوسرے قسم کے دانت چیر پھاڑ کرنے کے کام آتے ہیں اور تیسرے قسم کے دانت چبانے کے کام آتے ہیں۔انھوں نے بتایا ہے کہ ہاتھی دانت صرف ہاتھی سے نہیں بلکہ دریائی گھوڑے اور دریائی جانور والرس سے بھی حاصل کیا جاتا ہے۔اس کے بعد انھوں نے ہاتھوں کی اقسام کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہاتھی دانت کی خصوصیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ہڈی سے مشابہ ہوتا ہے۔کبھی کبھی تو دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔چین اور جاپان میں ہاتھی دانت پر بہت نفاست سے نقش کاری کی جاتی ہے اور یہ دونوں ممالک اس فن صنعت کے لئے مشہور ہیں۔ہاتھی دانت کے موضوع پر یہ مضمون اچھی معلومات فراہم کرتا ہے۔

14.7 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے مضمون کی تعریف اور اقسام کے بارے میں جانا۔

آپ نے مضمون کے اجزائے ترکیبی کے متعلق جانا۔

آپ نے پریم چند کی مضمون نگاری کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی۔

آپ نے پریم چند کے مضامین کے موضوعات پر تفصیلی معلومات حاصل کی۔

آپ کو پریم چند کے مضامین کے حوالے سے ان کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور معاشی خیالات کو جاننے کا موقع ملا۔

14.8 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ مضمون کسے کہتے ہیں؟ اس کے اوصاف بیان کیجئے۔

2۔ مضمون کی اقسام کے متعلق معلومات فراہم کیجئے۔

3۔ پریم چند کی مضمون نگاری پر نوٹ لکھئے۔

4۔ پریم چند کے ادبی مضامین کے اوصاف بیان کیجئے۔

5۔ پریم چند کے سماجی و اصلاحی مضامین پر نوٹ لکھئے۔

14.9 سوالات کے جواب

جواب 1: تحریری شکل میں افکار و خیالات کی پیشکش کی ایک قسم مضمون نگاری بھی ہے۔ ادبی اصناف میں مضمون نویسی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کسی بھی موضوع پر ایک مربوط اور منظّم نثری تحریر کو مضمون کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے لفظ 'essay' استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ 'essay' فرانسیسی زبان کے لفظ 'essai' سے مشتق ہے جس کے معنی "to try" یا "to attempt" کے ہیں۔ یعنی کہ کچھ کہنے کی کوشش کرنا۔ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ لفظ 'essay' لاطینی زبان کے لفظ 'exagium' سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی کسی مسئلہ کو عام الفاظ میں پیش کرنا یا تحریر کرنا۔ بعض ماہر لسانیات کا خیال ہے کہ لفظ 'essai' خود عربی زبان کے لفظ 'السعی' سے ماخوذ ہے یا اس کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ 'السعی' کے لغوی معنی 'کوشش' کے ہیں جو فرانسیسی زبان کے معنی کے بہت قریب ہے۔ یعنی آسان الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ essay یا مضمون ایسی صنف ہے جس میں کسی واقعے، خیال یا موضوع پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ اس موضوع کے ہر گوشے کو ایک جگہ سمیٹا جا سکے اور کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات کو مربوط اور مدلل انداز سے پیش کرنا کہ قاری اس کو پڑھ کر با آسانی سمجھ سکے۔ یہ ادب کی ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ لکھنے والا صاف اور واضح طریقے سے اپنے خیالات کو بلا تامل پیش کر سکتا ہے۔ ایسی تحریر کو مضمون کہتے ہیں۔

مضامین میں قلم کار اپنے ذاتی تاثرات کے ساتھ ساتھ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو بھی سلجھاتے نظر آتے ہیں۔ مضمون نگاری کا موجد مونتین (Montaigne) ہے۔ اس کے مضامین میں بھی زندگی کی پرکھ ملتی ہے اور یہ مضمون کسی بھی موضوع پر اس کے خیالات کی عکاسی بہ آسانی کرتے ہیں۔

ایک اچھے مضمون میں چند باتوں کا ہونا ضروری ہے:

(1) مضمون کا پیرائے بیان بالکل سادہ ہو اور اس میں کسی قسم کی پیچیدگی اور پُر تکلف اسلوب نہ ہو۔ اس کو مضمون کا عیب سمجھا جاتا ہے۔

(2) مضمون میں جو خیالات یا جو باتیں لکھی جا رہی ہیں اس میں بھی دلچسپی موجود ہو، صرف الفاظ اور انداز بیان کا دلچسپ ہونا کافی نہیں ہوتا ہے۔

(3) مضمون نگار کے دل و دماغ میں جو باتیں ہوں وہ پڑھنے والے تک من و عن پہنچے۔ یعنی کہ خیالات کی ترسیل مکمل طور پر ہو جس سے کہ مضمون لکھنے کا جو مقصد ہے وہ پایۂ تکمیل پا سکے۔

(4) مضمون میں جو خیالات پیش کئے جائیں، وہ اس طرح مربوط ہوں جس طرح زنجیر کی کڑیاں آپس میں جڑی رہتی ہے۔ درمیان میں کسی طرح کے خلا کا احساس نہیں ہونا چاہئے۔

(5) مضمون کا ہر نیا پیراگراف دوسرے پیراگراف سے فکری سطح پر منسلک ہونا چاہیے۔

جواب 2: مضمون درج ذیل قسم کے ہو سکتے ہیں:

(1) علمی مضمون

(2) معاشرتی وسیاسی مضمون

(3) تاریخی مضمون

(4) طنزیہ ومزاحیہ مضمون

(5) تحقیقی وتنقیدی مضمون

(6) توضیحی مضمون

(1) علمی مضمون: علمی مضامین سے مراد ایسے مضامین سے ہے جس میں علم وادب سے متعلق باتوں کا ذکر کیا جائے۔ ایسے مضامین میں ادب، فن، آرٹ، فلسفہ، جغرافیہ، معاشیات، عمرانیات، اقتصادیات، سیاسیات اور سائنس وغیرہ کے موضوعات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

(2) معاشرتی وسیاسی مضمون: معاشرتی مضامین میں معاشرے کے مسائل، زندگی بسر کرنے کے طریقے اور ضروریات زندگی سے متعلق موضوعات کو پیش کیا جاتا ہے۔ سیاسی مضمون میں ملک وصوبے کے سیاسی منظرنامے پر روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ سیاسی حالات پر عوام کی نظر بھی جائے اور وہ حالات کو سمجھ سکیں۔

(3) تاریخی مضمون: تاریخی مضامین وہ ہیں جن میں تاریخی واقعات وحالات کا ذکر کیا جائے۔ مثال کے طور پر اکبر بادشاہ کے زمانے میں فرانسیسی سیاح برنیر ہندوستان میں سیاحت کی غرض سے آیا۔ اس کی سیاحت کا مقصد ہندوستان کا گہرائی سے مطالعہ کرنا اور یہاں کے حالات پر اپنی رائے قائم کرنا تھا۔ اس نے یہاں کی صنعت وحرفت، ایجاد وانکشاف اور مخصوص اشغال وذوق کو دیکھا اور اپنے مضمون میں ذکر کیا۔ اس طرح کے مضمون کو تاریخی مضمون کہتے ہیں۔

(4) طنزیہ ومزاحیہ مضمون: اردو ادب میں اس قسم کے مضامین کو انشائیہ بھی کہتے ہیں۔ اس طرح کے مضمون میں طنزیہ ومزاحیہ باتیں، خاکے، ہلکے پھلکے شگفتہ مضامین اور اخباروں کے کالم وغیرہ شامل کئے جاتے ہیں۔ اس میں کسی بھی موضوع پر جو کچھ لکھا جاتا ہے اس میں طنز کے ساتھ مزاح بھی ہوتا ہے تاکہ ہلکے پھلکے انداز میں مضمون نگار اپنے خیالات کی ترسیل کر سکے اور قاری اس کے مقصد تک بہ آسانی رسائی حاصل کر سکے۔

(5) تحقیقی وتنقیدی مضمون: جب کسی ادبی موضوع پر تنقیدی وتحقیقی نقطۂ نظر سے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے تو اسے تحقیقی وتنقیدی مضمون کہتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین شعرا اور ادبا کی تخلیقات کے متعلق لکھے جاتے ہیں۔ اس میں تحقیقی وتنقیدی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ادب مضمون کے لئے گہرے مطالعے کی ضرورت درپیش آتی ہے تاکہ مخصوص موضوع کا گہرائی سے احاطہ کیا جا سکے اور حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے مضمون قلمبند کیا جائے۔

(6) توضیحی مضمون: توضیحی مضمون اس کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع کی وضاحت کی گئی ہو۔یعنی کہ کسی بھی چیز، واقعہ یا کسی خیال کو تفصیلی انداز میں پیش کیا گیا ہو جس کے ذریعہ مخصوص موضوع کے ہر پہلو پر روشنی پڑ سکے۔اس قسم کے مضمون میں بہت گہرائی سے باتوں کو پیش کیا جاتا ہے تا کہ موضوع کا کوئی بھی گوشہ اچھوتا نہ رہ جائے۔

جواب 3: پریم چند نے مضمون مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں اور ان کی نوعیت بھی مختلف ہے۔انھوں نے سوانحی مضامین، ادبی مضامین، معاشرتی مضامین، سیاسی مضامین، قومی یکجہتی سے متعلق مضامین، مذہبی مضامین، تہذیبی وثقافتی مضامین اور تعلیم وتدریس وعلوم وفنون سے متعلق مضامین لکھے۔ان مضامین کے مطالعے سے مختلف موضوعات پر ان کے افکار ونظریات کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔یہ تمام مضامین ان شخصیات کی مختلف النوع خدمات کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کاوش ہے۔

پریم چندر نے مختلف تاریخی، مذہبی، سیاسی اور ادبی شخصیات پر سوانحی مضامین لکھے ہیں جن میں کچھ مضامین مختصر ہیں اور طویل ہیں۔ ان سوانحی مضامین کا مجموعہ دو جلدوں میں ''باکمالوں کے درشن'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔پہلی جلد 1928 میں اور دوسری جلد 1932 میں منظر عام پر آئی۔ان جلدوں میں جن شخصیات کے اوپر مضامین لکھے ہیں ان کے نام ہیں۔اکبر اعظم، راجہ ٹوڈرمل، راجہ مان سنگھ، رانا پرتاپ سنگھ، رنجیت سنگھ، گوپال کرشن گوکھلے، ٹامس گینس برو، گیری بالڈی، سوامی وویکانند، رینالڈس، رام کرشن بھنڈارکر، جون آف آرک، رانا جنگ بہادر، سرسید احمد خاں، مولانا وحید الدین سلیم، بدرالدین طیب جی، مولوی عبدالحلیم شرر، منشی بشن نرائن وغیرہ۔ان مضامین کے علاوہ اور بھی شخصیات پر مضامین موجود ہیں جو ان دو جلدوں میں شامل نہیں ہیں بلکہ مختلف اخبار ورسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

پریم چند نے ادبی مضامین بھی لکھے۔انھوں نے کتابوں پر تبصرے، دیباچے اور شعرا پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ان مضامین کے ذریعہ پریم چند کی تنقیدی بصیرت اور تجزیاتی صلاحیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔معاشرتی موضوعات پر لکھے گئے مضامین میں انھوں نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان مضامین کے ذریعے وہ سماجی فکر اور مصلح ملت کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

سیاسی موضوعات پر انھوں نے ہندی زبان میں زیادہ تر مضامین لکھے ہیں۔اردو زبان میں جو مضامین موجود ہیں ان میں ''سودیشی تحریک''، ''آزادی کی لڑائی''، ''موجودہ تحریک کے راستے میں رکاوٹیں'' اور ''ترکی میں آئینی سلطنت'' شامل ہیں۔مضمون ''سودیشی تحریک'' جب لکھا گیا اس وقت ملک میں سودیشی تحریک شروع ہو چکی تھی۔اس تحریک کو شروع کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوستان میں بنی چیزوں کا استعمال زیادہ سے زیادہ کیا جائے اور ودیشی مال کو نہ خریدا جائے۔اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لوگوں کو جتنے کپڑے کی ضرورت تھی اتنا کپڑا یہاں تیار نہیں ہو پاتا تھا۔دوسری بات یہ تھی کہ ولایت میں بننے والا کپڑا ہندوستانی کپڑوں کی بنسبت مہین ہوتا تھا۔ہندوستان کے رئیس لوگ اور ولایت سے واپس آئے لوگ ودیشی باریک کپڑے کو پسند کرتے تھے۔اس لئے کپڑوں کے معاملے میں سودیشی تحریک ناکام ہو رہی تھی۔

پریم چند قومی یکجہتی کے زبردست حمایتی تھے۔وہ ہندو مسلم اتحاد اور انسان دوستی کے حامل ادیب تھے۔انھوں نے ایسے کئی مضامین لکھے جس میں قومی یکجہتی کا پیغام دیا گیا ہے اور ملک میں امن وامان کے قیام کو فروغ دینے کی بات کی گئی ہے۔ان مضامین میں ''ملکانہ راجپوت مسلمانوں کے شدھی''، ''قحط الرجال''، ''قومی اتحاد کیونکر ہوسکتا ہے'' اور ''اردو میں فرعونیت'' اہم ہیں۔

پریم چند نے مذہبی مضامین بھی لکھے ہیں۔وہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے تھے اس لئے مورتی پوجا کے قائل نہیں تھے۔مذہبیت ان کے مزاج پر غالب نہیں تھے بلکہ وہ عقلیت پسند اور آزاد خیال کے شخص تھے۔تنگ نظری اور تعصب سے وہ کوسوں دور تھے۔انھوں نے مذہبی تعلیمات

اور مذہبی رہنماؤں پر مضامین لکھے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں تمام مذاہب کے لئے احترام تھا اور تمام رہنماؤں کے لئے عقیدت بھی رکھتے تھے۔ان کے مذہبی مضامین میں ''رہنمایان ہند''، ''بھرت''، ''حضرت محمد کی پنیہ اسمرتی'' وغیرہ اہم ہیں۔

پریم چند کے ادبی خزانے میں تہذیب وثقافت اور آرٹ وفن سے متعلق مضامین بھی موجود ہیں جس سے فنون لطیفہ اور تہذیب و ثقافت سے ان کی دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ان میں ''ہندو تہذیب اور رفاہ عام''، ''دور قدیم و جدید''، ''ہنسی''، ''گالیاں''، ''فن تصویر'' اور ''ہندوستانی مصوری'' کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

پریم چند پیشے سے مدرس تھے اس لئے درس وتدریس کے مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔اس قسم کے مضامین میں ''زراعتی ترقی کیوں کر ہوسکتی ہے''، ''دیسی اشیا کیوں کر فروغ ہوسکتا ہے''، ''صوبۂ متحد میں ابتدائی تعلیم''، ''کلا بھون''، ''ہندو فن حکمت''، ''قدیم ہندو علم ریاضی''، ''ہاتھی دانت''، ''ہندووستانی ریلوں کی ساٹھ سالہ تاریخ'' وغیرہ شامل ہیں۔

14.10 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
متنوع	قسم قسم کا	تامل	تکلف
مربوط	ربط کیا گیا	خلا	خالی جگہ
مدلل	دلیل سے ثابت	یکجا	اکٹھا کیا گیا
منظّم	ربط پیدا کرنا	عبارت	تحریر،اسلوب
قاری	پڑھنے والا	سطر	لائن
من وعن	ہو بہو	اختصار	مختصر
ترسیل	بھیجنا	انحصار	دارومدار
مشتق	لیا گیا	متن	مضمون کی عبارت
اشیا	سامان	سیاح	سفر کرنے والا
قحط	سوکھا	رجال	مرد
غیر مرئی	جو دکھائی نہ دے	مفصل	تفصیل کے ساتھ
فلاح و بہبود	فائدہ و بھلائی	رفاہ عامہ	عوام کی بھلائی
زراعت	کاشتکاری	معیشت	معاشی صورت حال

14.11 کتب برائے مطالعہ

1۔ ڈاکٹر قمر رئیس، مضامین پریم چند، یونیورسٹی پبلشر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1960ء

2۔ عتیق احمد، مضامین پریم چند، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 1981ءء

3۔ سید محمد عصیم، پریم چند کا فنی وفکری مطالعہ، ترکمان گیٹ، دہلی، 1984ء

4۔ پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، 2017ء
5۔ ڈاکٹر جعفر رضا، پریم چند کہانی کار رہنما، لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، 1969ء
6۔ اصغر علی انجینئر، پریم چند حیات اور فن، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، دہلی، 1981ء
7۔ پریم چند، باکمالوں کے درشن، لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، 1932ء
8۔ پروفیسر علی احمد فاطمی، پریم چند نئے تناظر میں، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 2006ء
9۔ منشی پریم چند، واردات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2012ء
10۔ پرکاش چندر گپتا، پریم چند، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1992ء

اکائی:15 پریم چند کے خطوط اور اداریے

15.1 اغراض ومقاصد
15.2 تمہید
15.3 خطوط نویسی کا فن
15.4 پریم چند کے خطوط
15.4.1 ادبی خطوط
15.4.2 صحافتی خطوط
15.4.3 سیاسی وسماجی خطوط
15.4.4 شخصی وذاتی خطوط
15.5 اداریہ نویسی کا فن
15.5.1 اداریوں کی اقسام
15.5.2 اداریہ نگار کے اوصاف
15.6 پریم چند کے اداریے
15.7 آپ نے کیا سیکھا
15.8 اپنا امتحان خود لیجئے
15.9 سوالات کے جواب
15.10 فرہنگ
15.11 کتب برائے مطالعہ

15.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم خطوط نگاری کے فن سے متعارف ہوں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کے خطوط پر گفتگو کریں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند خطوط کے موضوعات کے متعلق جانیں گے۔
اس اکائی میں ہم اداریہ کے فن پر گفتگو کریں گے۔

اس اکائی میں ہم پریم چند کے اداریوں کا جائزہ لیں گے۔

15.2 تمہید

پریم چند کے ناول ہوں یا افسانے، ڈرامے ہوں یا انشائیے، تبصرے ہوں، کالم ہوں، خطوط ہوں یا اداریے، سبھی میں کسی نہ کسی زاویے سے قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے مذہبی توہم پرستی کی مخالفت کی اور قوم کو روشن خیالی کی جانب راغب کیا۔ ذہنی بیداری کی بدولت جو مذہبی وسماجی اصلاحات ہوئیں اور پھر معاشی وسیاسی تحریکات وجود میں آئیں پریم چند ان سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا افسانوی اور غیر افسانوی ادب ہندوستانی معاشرے میں مثبت تبدیلیوں کا علامیہ ہے۔ معاصر منظر نامے پر ان کی مضبوط گرفت تھی اس لئے وہ سماجی وسیاسی مسائل پر گہرائی سے گفتگو بھی کر سکتے تھے اور اصلاحی افکار ونظریات کی پیشکش بھی کرتے تھے۔ ان کی عظمت اس میں مضمر ہے کہ انھوں نے تاریخ وتہذیب کے دریچوں سے گزر کر فلاحی اثرات قبول کئے۔ رومان اور حقیقت کی آمیزش سے خلق کی گئی ان کی موثر ادبی فضا دلوں کو چھو لینے کا کام کرتی ہے اور اس کا دیرپا اثر قائم رہتا ہے۔

15.3 خطوط نویسی کا فن

خالق کائنات نے تمام مخلوقات میں صرف انسان کو ہی یہ تحفہ عطا کیا ہے کہ وہ زبان سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے، اپنی باتوں کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار وترسیل بھی کر سکتا ہے۔ اس اظہار کا وسیلہ زبان ہے۔ پوری دنیا میں مختلف زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں۔ زبان سے جب کسی بات کا اظہار کیا جاتا ہے تو اس کو صرف سامنے موجود شخص ہی سن سکتا ہے یعنی جب ہمیں کسی شخص مخصوص سے اپنی بات کہنی ہو یا اس تک کوئی بات پہنچانی ہو تو اس کے لئے دوسرے شخص کا سامنے ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن خط ایک ذریعۂ اظہار ہے جس کی مدد سے ہم اپنی بات کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ہماری بات تحریری شکل میں ہو تبھی دوسرے شخص کے سامنے نہ ہونے پر بھی ہم اس سے اپنے دل کی تمام باتیں کہہ سکتے ہیں اور اسی خط کے ذریعہ ہم اس کی تمام باتیں سن بھی سکتے ہیں۔ یعنی دو انسان کے درمیان آپسی گفتگو جو تحریری شکل میں ہو اسے ہم خط کہتے ہیں۔ اس خط کو عرف عام میں 'آدھی ملاقات' بھی کہا جاتا ہے۔

'خط' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'سطر یا تحریر' کے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں یہ لفظ اصطلاحی طور پر ''تحریر'' کے معنی میں بھی اور مکتوب یا مراسلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

'فرہنگ آصفیہ' میں لفظ خط کے معنی ہیں: مکتوب، نوشتہ یا رقبہ۔

خط میں مکتوب نگار اپنے جذبات وخیالات قلم بند کر کے جس کو خط لکھنا ہو یعنی مکتوب الیہ کو بھیجتا ہے۔ ادب میں خطوط نگاری کو باقاعدہ بطور صنف حیثیت حاصل ہے۔ اس کی حدود اور قواعد مقرر ہیں اور اس کی اپنی الگ شناخت بھی ہے۔ مکتوب نگار اپنی باتوں یا جذبات کا اظہار مکتوب الیہ کو تحریری شکل میں کرتا ہے اسے ہم خط کہتے ہیں۔ اس میں بنیادی حیثیت پیغام رسانی کو حاصل ہے۔ یعنی کہ مکتوب نگاری ترسیل خیالات کا ایک وسیلہ ہے۔ خط نہ صرف مکتوب الیہ کے اندورن راز کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ شخصیت وکردار کی مکمل عکاسی بھی ہوتی ہے۔

خطوط نگاری یا مکتوب نگاری ایک ایسا فن ہے اور اس کی ادبی حیثیت تبھی ثابت ہوتی ہے جب تمام زندگی کی محنت وتجربہ اس میں شامل ہو۔ خط کی تعریف کرتے ہوئے مشہور محقق مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''خط خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔''

مشہور ناقد پروفیسر آل احمد سرور نے خط کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''خط کیا ہے؟ بقول غالبؔ کے جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے اسے دور کے لوگوں تک پہنچانا، گفتگو کو تحریر کا، مکالمے کو مراسلے کا جامہ پہنانا۔ اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے۔ جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت، ذاتی تاثرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ وہ خط جن میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشا پردازی کی شان، تکلف کا اظہار ہو، خطابت کا جوش دکھایا جائے خط نہیں مضمون ہے۔''

خطوط نگاری کو ادب لطیف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے بہت زیادہ اصول وضوابط نہیں بنائے گئے ہیں۔ اس لئے کافی حد تک یہ فنی جکڑ بندیوں سے آزاد ہے۔ خط کے لئے نہ تو موضوع کی قید ہے نہ ہی ہیئت کی۔ لیکن ادبی خطوط اپنی داخلی کیفیات اور خصوصیات کے لحاظ سے ذرا منفرد ہوتے ہیں۔ اس میں چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے تا کہ کوئی ایسی بات خط میں نہ لکھی جائے جو معیوب معلوم ہو۔

خط دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلا ذاتی یا نجی خط۔ دوسرا کاروباری یا دفتری خط۔ ذاتی خطوط میں لکھنے والا کوئی بھی بات لکھ سکتا ہے جو اس کے ذہن میں ہو یا کسی خیال کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس قسم کے خط میں وہ کسی سے شکایت کر سکتا ہے، کسی کو کوئی خبر دے سکتا ہے، کسی سے کسی مسئلہ پر گفتگو کر سکتا ہے، غرضیکہ ایسے سیکڑوں موضوعات ہیں جو ذاتی خط کا حصہ بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذاتی خط کا کوئی طے شدہ ڈھانچہ یا فارمیٹ نہیں ہوتا۔ وہ کسی بھی طریقے سے لکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف کاروباری یا دفتری خط ہوتے ہیں۔ ان میں کاروبار یا دفتر سے متعلق باتوں کا ہی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک طے شدہ فارمیٹ ہوتا ہے اور اسی فارمیٹ پر مکتوب نگار اپنا مدعا کم سے کم الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

خط کا بنیادی وصف اس کا اختصار ہوتا ہے۔ اس کی طوالت کو فنی نقطۂ نظر سے عیب سمجھا جاتا ہے۔ مکتوب نگاری اپنے ادبی حسن کے لحاظ سے ایک نہایت ہی نازک فن ہے جہاں غیر ضروری تکلف اور بناوٹ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ خط میں جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہو وہ بے ساختہ اور برجستہ ہونا چاہیے۔

اچھے خط کی ایک خوبی اس میں موجود لطافت بھی ہے۔ خط کا موضوع چاہے جیسا بھی ہو لیکن انداز بیان اس طرح ہونا چاہئے کہ پڑھنے والے کو اس میں دلچسپی پیدا ہو۔ لطیف انداز بیان خط میں بیان احساسات وجذبات کی ترجمانی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ خوش خطی بھی خط کے لئے ضروری ہے۔ خط صاف ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوتا کہ اس کو پڑھنے میں آسانی ہو اور کسی طرح کی کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

مکتوب نگار کے لئے کوئی اسلوب مقرر نہیں کیا گیا ہے لیکن پھر بھی اس کی زبان سادہ اور سلیس ہونی چاہئے۔ خط میں مشکل اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے احتراز کرنا چاہئے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ خطوط نگاری کے کوئی اصول وضوابط نہ ہونے پر بھی چند اہم باتوں کا خیال رکھتے ہوئے خط تحریر کرنا چاہیے۔ خط لکھنے والی کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور اس کے مزاج کے مطابق اس میں تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے لیکن ادبی خطوط کے زمرے میں وہی خط آئیں گے جن میں ادب کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

15.4 پریم چند کے خطوط

مکاتیب، مکتوب نگار کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کسی بھی ادیب کی زندگی اور اس کی ذہنی ونفسیاتی پیچیدگیوں کی مکمل تعبیر وتفہیم کے لئے اس کے مکاتیب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہم اس کی مکمل شخصیت کو پہچان سکتے ہیں۔ پریم چند کے خطوط کا مطالعہ کر کے بھی

ہم ان کے خیالات وافکار کو جان سکتے ہیں۔انھوں کئی موضوعات پر خطوط لکھے ہیں جن میں ادبی، صحافتی، سیاسی اور ذاتی خط بھی شامل ہیں۔ان سبھی خطوط سے زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق پریم چند کے نظریات پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی شخصیت کے اوصاف بھی سامنے آتے ہیں۔

15.4.1 ادبی خطوط

پریم چند نے خطوط کے ذریعہ اپنے نظریات اور تنقیدی خیالات کا بھی اظہار کیا ہے۔ادبی خطوط شعروادب سے متعلق ان کے نظریات کو سمجھنے میں قاری کے لئے معاون ثابت ہوتے ہیں۔پریم چند کے خطوط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھیں نئی آنے والی تصنیفات کے مطالعے کا شوق تھا۔اگر ان کی نظر سے کوئی ایسی کتاب گزرتی جو انھیں پسند آتی تو وہ مصنف کو توصیفی خط ضرور لکھا کرتے تھے۔ان خطوط کی بنا پر ان کی رائے اور اختلاف جاننے کا بھی موقع ملتا تھا۔مثال کے طور پر ڈراما ''انارکلی'' کے مطالعے کے بعد اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈراما نگاری امتیاز علی تاج کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''انارکلی اردو کا پہلا ڈراما ہے جسے میں نے اول سے آخر تک ایک ہی سانس میں پڑھا۔یہ تو میں نہیں بتا سکتا کہ میں نے اردو کے سب ڈرامے پڑھ ڈالے ہیں مگر جتنے پڑھے ہیں ان میں مجھے جتنی کشش انارکلی میں ملی اتنی کسی اور ڈرامے میں نہیں ملی۔میں تو اسے انگریزی کے بہترین ڈراموں کے مقابل رکھنے کو تیار ہوں۔'دور جدید' اس کے ایک ایک لفظ میں منقوش ہے۔پارسی طرز کی زنجیروں سے آپ نے ڈرامے کو تکلخت آزاد کر دیا۔کہیں کہیں تو آپ نے نزاکت فہمی کا کمال کر دکھایا ہے۔'انارکلی' بہت عرصے تک مجھے یاد رہے گا۔اکبر کا کیریکٹر مجھے بہت بہترین معلوم ہوا۔بس اگر شکایت ہے تو یہی کہ آپ نے جہانگیر کے ہاتھوں دلآرام کا قتل کرا کے میرے دل کو سخت صدمہ پہنچایا۔حتیٰ کہ اس ڈرامے والے جہانگیر سے مجھے سخت نفرت ہوگئی۔کوئی سچا عاشق اتنا بے رحم ہوسکتا ہے۔اسے دل تسلیم نہیں کرتا۔معاف کیجئے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈراما کے فنی تقاضوں سے بخوبی واقف تھے۔حالانکہ انھوں نے بھی دو ڈرامے ''کربلا'' اور ''روحانی شادی'' کے نام سے تحریر کئے اور فنی لحاظ سے ان میں بہت خامیاں موجود ہیں لیکن انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ڈراما کے فنی تقاضے کیا ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے لکھا ہے کہ ڈراما کو پارسی طرز سے الگ کر دیا کیونکہ ڈراما ایک لمبے عرصے تک پارسی تھیٹر کے طرز پر چلتا رہا جہاں تجارتی مقاصد کی کارفرمائی نظر آتی تھی اور صنفی حیثیت معدوم تھی۔''انارکلی'' کے متعلق پریم چند کا خیال تھا کہ اس نے ڈراما میں جدید رنگ بھر دیا۔

پریم چند کے خطوط سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔رسالہ ''زمانہ'' کا ایک شمارہ خواجہ حیدر علی آتش نمبر کے طور پر نکالا گیا تھا۔اسی رسالہ میں آتش کے منتخب اشعار بھی شامل کئے گئے تھے جس پر پریم چند نے سخت تنقید کی اور کہا کہ ایسے اشعار کی موجودہ عہد میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔مذکورہ شمارے پر تنقیدی رائے دیتے ہوئے پریم چند نے جو خط لکھا ہے اس سے پریم چند کے ادبی نظریات اور ان کی تنقیدی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔خط ملاحظہ فرمائیں۔

''اس زمانے میں گوناگوں اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل ہماری تمام تر توجہ کے مستحق ہیں مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ رسالہ 'زمانہ' کا قریب قریب ایک پورا نمبر محض آتش کے کلام کے تبصرے کو نذر ہوگیا۔میں آتش کی استادی کا قائل ہوں۔لکھنؤ کی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلتاً کم ہے۔مگر پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ بہ استثنا ان حضرات کے جو لکھنؤی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور سب طبائع کو موجودہ معیار اور ذوق صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔لٹریچر کا موضوع ہے تہذیب، اخلاق، مشاہدہ، جذبات، انکشاف حقائق اور واردات وکیفیات قلب کا اظہار۔جو شاعری حسن وعشق کو آئینہ وشانہ خنجر ومحشر، سبزہ وخط، دہن وکمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو۔وہ ہرگز اس قابل

نہیں کہ آج ہم اس کا ورد کریں۔''

پریم چند کے خطوط سے صنف غزل کے بارے میں بھی ان کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ غزل میں مشکل پسندی کے مخالف تھے۔ وہ غزل میں اضافتیں اور دوراز فہم تشبیہات واستعارات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ غزل میں عام فہم انداز اور سادہ زبان کا استعمال کیا جائے تا کہ مقصد کی ترسیل آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ پریم چند نے اپنے ڈراما 'کربلا' میں بھی کچھ غزلیں شامل کی ہیں جن پر منشی دیا نرائن نگم نے چند اعتراضات کر دیے تھے جن کے جواب میں پریم چند خط لکھتے ہیں:

''خیالات کی نزاکت نہ دیکھئے۔ یہ دیکھئے کہ غزل سلیس، عام فہم، سلجھی ہوئی ہے یا نہیں۔ گانے کے لئے موزوں ہے یا نہیں۔ غالب کی غزل یا ناسخ کی یا عزیز کی یا چکبست کی گانے کے کام کی نہیں ہوتیں وہاں اضافتیں، استعارے اس قدر ہوتے ہیں کہ وہ بعید از فہم ہو جاتی ہیں۔''

پریم چند نے اپنے خطوط میں نئی آنے والی کتابوں پر تبصرہ کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ نہ صرف نئی آنے والی کتابوں کو پڑھا کرتے تھے بلکہ نئے مصنفین کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ہی ان کی کتابوں پر تبصرہ بھی کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان کا تبصرہ جلد چھپ کر منظر عام پر آ جائے۔ اس سلسلے میں وہ مدیروں سے خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ قائم کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی کتابوں پر بھی ادیبوں سے تبصرہ کرنے کی خواہش رکھتے تھے اور اچھے تبصروں پر خوشی کا اظہار بھی کرتے تھے۔

15.4.2 صحافتی خطوط

پریم چند چونکہ ایک مدیر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں اس لئے ان کے خطوط کے مجموعے میں صحافتی خطوط بھی شامل ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم نے ان کی اس صلاحیت کو پہچان لیا تھا اور انھیں اس پیشے میں آنے کی ترغیب دی۔ پریم چند نے ادارت کی دنیا میں قدم رکھا تو ''مادھوری'' اور ''مریادا'' ان دونوں رسالوں کی ادارت سنبھالی۔ 1921 میں پریم چند نے ملازمت چھوڑ کر پہلے سرسوتی پریس قائم کیا اور اس کے بعد ہندی زبان کا ایک رسالہ ''ہنس'' کے عنوان سے جاری کیا۔ اس رسالے کو جاری کرنے کے بعد انھیں بہت نقصان بھی ہوتا رہا لیکن انھوں نے اس کو بند نہیں کیا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں صحافت سے کتنی دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس رسالے پر بہت محنت صرف کی کیونکہ وہ اسے ہندوستان کا ایک معیاری رسالہ بنانا چاہتے تھے۔ اس رسالے کے ذریعہ انھوں نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے قلمکاروں کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان کے رسالے میں ہندوستان کی تمام زبانوں کی شاہکار تخلیقات ترجمہ کر کے شائع ہوتی تھیں تا کہ ایک زبان کا دیب دوسری زبان کے ادیب اور اس کی تخلیق سے شناسائی حاصل کر سکے۔ اس ضمن میں 12 مئی 1935 کو حسام الدین غوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں تو بمبئی سے آ کر اپنے تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گیا۔ میرا ما ہوار رسالہ 'ہنس' تو نکلتا ہی تھا۔ اس کا مقصد آپ پر مندرجہ بالا عنوان سے واضح ہو جائے گا۔ یعنی وہ ہندی رسم الخط کے ذریعے ہندوستان کی سبھی زبانوں کی ادبیات سے بہترین مواد فراہم کر کے پبلک کو دے گا اور اسی طرح قومی ادب کی بنیاد ڈالے گا۔ جس میں ہر ایک زبان کے مصنف اوعر ادیب موجود ہوں گے۔ فی الحال ایک زبان والوں کو دوسری زبان سے ایک بت گانگی سی ہوتی ہے۔ بنگلہ والوں کو گجراتی کی کچھ خبر نہیں اور نہ مراٹھوں کو بنگلہ کی کچھ خبر ہوتی ہے۔ صوبجاتی ادبیات میں کیا کیا جواہر بھرے ہوتے ہیں اور روز بروز پیدا ہوتے جاتے ہیں اس کی طرف کسی کو توجہ نہیں۔ 'ہنس' نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ اس میں تلگو، کناڈی، بنگلہ، مراٹھی، گجراتی اور ملیالم وغیرہ زبانوں کے باکمالوں کے تخلیقی کارنامے رہتے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ سبھی زبانوں کے

ادیبوں سے ہم واقف ہو جائیں۔ زبان کی حدود کے باعث کسی باکمال بزرگ کی ادبیات سے فیض اٹھانے سے ہم کیوں محروم رہیں۔ اردو کے لئے بھی ایک حصہ وقف ہے۔ پہلے نمبر کے لئے ہم نے ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور سید محی الدین قادری زورؔ کے مضامین شائع کئے ہیں۔''

پریم چند نے اپنے خطوط میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اخبارات و رسائل کی ترقی و تنزلی پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ یہاں دونوں زبانوں کی صحافت پر موازنہ بھی ملتا ہے۔ پریم چند اپنے خطوط میں دونوں زبانوں کے رسائل و جرائد کی تعداد پر خوشی کا اظہار بھی کرتے ہیں اور ان کی خستہ حالی پر افسوس بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ہندی اور اردو کا موازنہ کرتے ہوئے بنارسی داس چترویدی کے نام لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ 'وشال بھارت' اب بھی گھاٹے میں جا رہا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ پہلا ہندی اخبار، جسے ہندی کا سب سے اعلیٰ ماہنامہ تسلیم کیا جاتا ہے، اس کی یہ حالت ہو۔ کیا یہی ہماری ترقی یافتہ ذہنیت کا معیار کا؟ اردو کے اخبار بازی لیے جاتے ہیں پچاس سے بھی زیادہ بلند پایہ اردو ماہنامے ہیں اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو دو روپیہ ڈھائی روپے قیمت کا پانچ سو صفحوں کا سالنامہ نہ نکالتا ہو۔ یقیناً ان کا ادبی ذوق بہت ہے۔ وہ حوصلہ افزائی کرنا جانتے ہیں۔''

پریم چند نے دیانرائن نگم کو بہت سارے خط لکھے ہیں۔ ایک خط سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ پریم چند کو صحافت کے میدان میں لانے کے خواہاں تھے اور رسالہ ''زمانہ'' کی ادارت کی پیشکش بھی کی تھی لیکن پریم چند نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا اور اس کی وجہ انھوں نے اردو اخبارات و رسائل کی خستہ حالی بتائی تھی۔ پریم چند نے ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد اپنے چھوٹے اور بڑے بھائی کے اشتراک سے سرسوتی پریس قائم کیا تھا۔ اس پریس کے قیام میں فراقؔ گورکھپوری نے بھی کچھ رقم لگائی تھی۔ پریم چند کو یہ امید تھی کہ پریس کے قیام سے دو فائدے ہوں گے۔ پہلا یہ کہ ان کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن جائے گا اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی کتابیں خود شائع کر کے فروخت کر سکیں گے۔ لیکن ان کا خیال غلط ثابت ہوا۔ ان کا پریس ہمیشہ نقصان میں چلتا رہا جس کی وجہ سے وہ مقروض بھی ہو گئے۔ دیانرائن نگم کو ایک خط میں پریس کے نقصان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے اپنی کاوشوں سے اب تک کوئی مالی منفعت نہیں پہنچی۔ 'ہنس' کا تو خیر کوئی زیادہ خرچ نہیں ہے لیکن 'جاگرن' کے اخراجات ناقابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں۔ میرے دماغ پر یہ بڑا بار ہے کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پاؤں۔ تقریباً دو سو روپے مہینے کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ یہ کب تک چلتا رہے گا؟ ایک مرتبہ اسے جاری کر چکنے کے بعد بند کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اگر کچھ اشتہار مل جائیں تو اس مشکل پر قابو پا سکتا ہوں۔ آپ اپنے کسی دوست کی وساطت سے مجھے کچھ اشتہار دلوا دیں۔ مجھے ماہانہ صرف سو روپے کی اشتہار بھی مل جائیں تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ مجھے اپنی ذاتی ضرورتوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ کتابوں اور کہانیوں وغیرہ سے گزر بسر کا تو سامان ہو ہی جاتا ہے لیکن اس رسالوں کو کیسے جاری رکھا جائے۔ مسئلہ یہ ہے؟''

پریم چند کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انھیں پریس کے کاروبار میں مسلسل نقصان ہونے لگا تو اس نقصان کی بھرپائی کے لئے انھوں نے فلمی دنیا سے منسلک ہو کر کچھ روپیہ کمانے کی کوشش کی۔ انھیں ایک فلم کمپنی سے آفر بھی ملا تھا اور انھیں مجبوراً فلمی دنیا میں قدم رکھنا پڑا تا کہ 'ہنس' اور 'جاگرن' کو جاری رکھا جا سکے۔ لیکن فلمی دنیا کے تقاضوں کو وہ پورا نہ کر سکے۔ وہاں جس طرح کے مناظر اور کہانیوں کی مانگ تھی وہ پریم چند کا مزاج نہ تھا۔ پریم چند اپنی تخلیقات میں اصلاح کو اول حیثیت دیتے تھے اور فلموں میں بھی انھوں نے یہی رخ اپنایا۔ وہ فلموں کے

ذریعے اخلاقیات کوفروغ دینے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے زرین پہلوؤں کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے لیکن فلمی دنیا کی چمک دمک اور تجارتی مقصد نے انھیں ان چیزوں سے روکے رکھا اور بلآخر انھیں فلمی دنیا میں ناکامی ہوئی۔ انھوں نے 1934 میں ''اجنٹا سنے ٹون'' نام کی فلمی کمپنی میں ایک سال کا کنٹریکٹ سائن بھی کیا تھا لیکن اس کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکنے کی وجہ سے انھیں فلم انڈسٹری کو چھوڑنا پڑا۔

پریم چند چونکہ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہے اور مذکورہ تحریک کا مقصد ہی اصلاح معاشرے تھا لہٰذا جب فلم کمپنی سے منسلک ہونے کی بات آئی تو پریم چند نے وہاں بھی اصلاحی پہلو کو سامنے رکھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ فلم ایک ایسا ذریعۂ ترسیل ہے جو سماج کے ہر طبقے تک پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے یہ خواہش کی کہ فلموں کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کیا جائے لیکن ان کا یہ خواب پورا نہیں ہو سکا۔ حسام الدین غوری کے نام ایک خط میں اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''سنیما سے کسی اصلاح کی توقع کرنا بے کار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی۔ اسے اس سے بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے۔ انھیں تو اپنے پیسے سے مطلب ہے۔ یہ بس ان کی نظروں میں جائز ہے۔ پبلک کا مذاق اتنا گر گیا ہے کہ جب تک یہ مخرب، حیا سوز نظارے نہ ہوں اس تصویر میں مزہ نہیں آتا۔ مذاق کی اصلاح کا بیڑا کون اٹھائے۔ سنیما کے ذریعے مغرب کی ساری بے ہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جارہی ہیں۔ اور ہم بت بس ہیں۔ پبلک میں تنظیم نہیں نہ نیک و بد کا امتیاز ہے۔ آپ اخباروں میں کتنی ہی فریاد کر لیجئے وہ بے کار ہے۔ اور اخبار والے بھی تو صاف گوئی سے کام نہیں لیتے۔ جب ایکٹریسوں اور ایکٹروں کی تصویریں دھڑا دھڑ چھپیں اور ان کے کمال کے قصیدے گائے جائیں تو کیوں نہ ہمارے نوجوان پر اثر ہو۔ سائنس ایک برکت ایزی ہے مگر نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ کر لعنت ہو رہی ہے۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے اور اس دائرے سے نکل جانا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔''

پریم چند کے صحافتی خطوط میں ان کے ادب اور رسائل و جرائد کو لے کر جو خیالات تھے ان کا انکشاف ہوتا ہے۔ انھوں نے صحافت کی بہت خدمت کی اور اس کے لئے جد و جہد کرتے رہے۔ حالانکہ ان کے سامنے مشکلات آتی رہیں لیکن انھوں نے کبھی ہار نہیں مانی اور حوصلے کے ساتھ دقتوں کا سامنا کیا۔ یہی میدان صحافت میں ان کی کامیابی کا ضامن ہے۔

15.4.3 سیاسی و سماجی خطوط

پریم چند ایک مصنف تھے اور ہر مصنف اپنے عہد و ماحول سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اس کی تخلیقات میں اس کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پریم چند گہرا سماجی و سیاسی شعور رکھتے تھے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں سماج کے ہر طبقے کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ مزدور اور کسان طبقے کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانا چاہتے تھے اور ان کے ساتھ کھڑے بھی تھے۔ ان کی تخلیقات کی طرح ان کے خطوط میں بھی ان کے اس نقطۂ نظر کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ پریم چند کسی پارٹی سے وابستہ نہ تھے۔ دیا نرائن نگم نے ایک بار ان سے سوال پوچھا تھا کہ وہ کسی پارٹی سے وابستہ ہیں یا نہیں تو اس کے جواب میں انھوں نے خط میں لکھا تھا جو 17 فروری 1923 میں لکھا گیا، لکھتے ہیں:

''آپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس پارٹی میں ہوں۔ میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں اس لئے کہ دونوں میں کوئی پارٹی کچھ عملی کام نہیں کر رہی ہے۔ میں تو اس آنے والی پارٹی کا ممبر ہوں جو عوام الناس کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے۔ سوراجیہ خلافت پارٹی کی طرف سے جو کانسٹی ٹیوشن نکلتا ہے اس سے البتہ مجھے کلی اتفاق ہے۔ مگر تعجب یہی ہے کہ یہ ایک پارٹی سے کیوں نکلا۔ میرے خیال میں دونوں پارٹیاں اس معاملے میں متفق ہیں۔''

سوراجیہ خلافت پارٹی 9 جنوری 1923 کو قائم ہوئی تھی جس کی بنیاد چترنجن داس اور موتی لعل نہرو نے رکھی تھی۔ اس پارٹی کے

زیادہ تر ارکان نیشنل کانگریس پارٹی کے ہی تھے۔ اس میں خاص طور سے وہ لوگ شامل تھے جنھوں نے گاندھی جی کا فیصلہ جو انھوں نے انگریزوں کے قانوں کے نافرمانی کے ضمن میں کیا تھا، اس کے سخت مخالف تھے۔ گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف ہر قسم کی سول نافرمانی یا مزاحمت کو ترک کرنے کی بات کہی تھی اور اس پارٹی میں ایسے ہی ممبران شامل تھے جو گاندھی جی کے خیال کی مخالفت کر رہے تھے۔ گاندھی جی نے یہ فیصلہ ''چوری چورا ہتیا کانڈ'' کے بعد لیا تھا۔ اس سانحے میں انگریزی حکموت کے سپاہیوں نے ہندوستانی عوام کا گولی مار کر قتل عام کر دیا تھا۔ ''سوراجیہ خلافت پارٹی'' انگریزی حکموت سے ہندوستانی عوام کی سیاسی آزادی اور خود مختار حکموت کی مانگ کر رہی تھی۔ اس دور میں ''انڈین نیشنل کانگریس'' اور ''سوراجیہ خلافت پارٹی'' دونوں موجود تھیں۔ پریم چند نے انھیں دونوں پارٹیوں کے پس منظر میں مذکورہ بالا خط تحریر کیا ہے۔

انگریزی حکومت نے طرز حکمرانی میں جزوی اصطلاحات کی اسکیم شروع کی تھی۔ اس اسکیم کے تحت حکومت نے 1919 میں مانٹیگو چلمسفورڈ ریفارم ایکٹ (Montagu-Chelmsford Reform Act 1919) بنایا جو 1921 سے نافذ ہوا۔ اس ایکٹ کے بنانے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں آہستہ آہستہ سلیف گورنمنٹ کے اداروں کو متعارف کرایا جائے۔ پریم چند کے خطوط سے اس بات کا خلاصہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے اداروں کو کڑی شرائط کے ساتھ محدود اختیارات ہی دیے گئے تھے۔ انھیں حکومت کی اس اسکیم سے اتفاق نہیں تھا۔ 21 دسمبر 1921 کے ایک خط میں دیا نرائن نگم کو اس بابت لکھتے ہیں:

''میں پیس ڈکلیریشن کا تو عمداً ذکر نہ کروں گا لیکن ریفارمس اسکیم کا ذکر نہ کرنا غیر ممکن ہے اور اسکیم یا ایکٹ کے متعلق میں مسٹر چنتامنی وغیرہ ہم سے متفق نہیں ہوں میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے۔ حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ آسامیاں زیادہ مل جائیں گی۔ اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے اسی طرح آئندہ یہ حاکم ہو کر رعایا کا گلا کاٹے گی اس کے سوا اور کوئی جدید اختیار نہیں دیا گیا۔ جو اختیار دیے گئے ہیں ان میں بھی اتنی شرطیں لگا دی گئی ہیں کہ ان کا دینا نہ دینا برابر ہو گیا ہے۔''

جنگ آزادی کے متعلق پریم چند کے خیالات یہ تھے کہ انگریزوں سے کڑا مقابلہ کئے بغیر ملک کو آزادی نہیں مل سکتی۔ وہ ایک طرف تو انگریزی حکومت سے سخت بدظن تھے دوسری طرف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طلباء سے بھی ناراض تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے ہمارے طلبا صرف انگریزوں کی غلامی کر سکتے ہیں۔ ایک بار دیا نرائن نگم نے گاندھی جی کے ''نمک ستیہ گرہ'' کو قبل از وقت قرار دیا تھا جس کے جواب میں پریم چند لکھتے ہیں:

''نمک کو آپ قبل از وقت خیال کرتے ہیں۔ جس طرح موت ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے، ساہوکار کا تقاضہ ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح ایسے سارے کام جس میں مالی یا وقتی نقصان کا اندیشہ ہو قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں۔ اس تحریک کی قبولیت ہی بتلا رہی ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں ہے۔ اس موقع پر بھی صاف ظاہر ہوا کہ دو فیصدی انگریزی خواں اصحاب تحریک کے ساتھ ہیں تو 98 فیصد اس کے خلاف ہیں۔ قومی اعتبار سے یونیورسٹین اور اسکولوں پر قوم کا جتنا پیسہ صرف ہوا وہ قریباً ضائع ہو گیا ہے۔ یہ لوگ سرکار کے آدمی ہوئے قوم کے نہیں۔ غیر انگریزی داں، کاروباری اور پیشہ ور طبقوں ہی نے اس تحریک میں جان ڈال دی ہے۔ اگر تعلیم یافتہ لوگوں کے بھروسے ملک بیٹھا رہے تو شاید قیامت تک آزادی نصیب نہ ہوگی۔''

پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے حمایتی تھے۔ وہ دونوں مذاہب میں آپسی مل جول کو فروغ دینے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ وہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان میں کسی طرح کا مذہبی تعصب نہیں تھا۔ اس زمانے میں آریہ سماج کی جانب سے ایک تحریک چلائی جا رہی تھی

جس کا نام ''شدھی تحریک'' تھا، وہ اس تحریک کے سخت خلاف تھے کیونکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کو ہندو مذہب میں لایا جا رہا تھا جس کی وجہ سے جگہ جگہ تنازعہ پیدا ہو رہا تھا۔ 22 اپریل 1923 کے ایک خط میں دیا نرائن نگم کو لکھتے تھے:

''میں نے ادھر لکھنا بند سا کر رکھا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ ملکانا شدھی پر ایک مختصر مضمون لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔ تین چار دن میں بھیج دوں گا۔ آریہ سماج والے بھنائیں گے۔ لیکن مجھے امید ہے آپ زمانہ میں اس مضمون کو جگہ دیں گے۔''

مذکورہ تحریک کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد میں خلل واقع ہو رہا تھا اور فرقہ وارانہ فساد بھی پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ دونوں مذاہب میں نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ پریم چند ہندو مسلم اتحاد کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دونوں قوموں کے اتحاد کے بغیر ملک کا آزاد ہونا ناممکن ہے۔ دونوں قوموں میں اتحاد قائم رکھنے کے سلسلہ میں ان سے جو بھی ہو سکتا تھا وہ کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ غیر جانبداری سے کام لیتے تھے۔ اگر کہیں فرقہ وارانہ لڑائی ہو بھی جاتی تو وہ اس کی سخت مذمت کیا کرتے تھے۔ 17 جولائی 1933 کے ایک خط میں بنارسی داس چترویدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اسلام کا وش (زہر) ورکش (درخت) میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ لیکن 'چترپٹ' میں اس کا جو اشتہار چھپا ہے اس سے میں بخوبی بھانپ سکتا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ فرقہ پرستی پھیلانے کی یہ انتہائی شرانگیز اور سستی کوشش ہے جس کا پول کھولنا ضروری ہے۔ میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس بارے میں کچھ لکھوں گا اور جب کہ آپ نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، میں دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اقلیت میں ضرور ہیں لیکن ہمیں اس کی پرواہ نہ کرنا چاہیے۔ ہمارا مقصد مقدس ہے..... اگر آپ یہ کتاب مجھے بھیج دیں تو میں اس موضوع پر پورا ایڈیٹوریل لکھوں گا۔''

''اسلام کا وش ورکش'' نام کی کتاب چترسین شاستری نے لکھی تھی جو ہندی کے نامور ادیب تھے۔ اس کتاب میں اسلام کے خلاف بیانات تھے جو صرف مذہبی تعصب پر مبنی تھے اور جس کا مقصد ہندو اور مسلم کے درمیان فساد پیدا کرنا تھا۔ اس کتاب کی پریم چند نے خوب مذمت کی۔

15.4.4 شخصی و ذاتی خطوط

پریم چند کے ادبی خزانے میں کئی قسم کے خطوط موجود ہیں جن کے ذریعہ ان کی حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی ذاتی زندگی، گھریلو معاملات و مسائل، کنبہ، افراد خانہ کے متعلق بہت ساری باتیں ان کے خطوط کی مدد سے منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کی والدہ سوتیلی تھیں جن کا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ ان کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ازدواجی زندگی سے پریم چند خوش نہیں تھے کیونکہ گھر میں آپسی جھگڑے بہت ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت اذیت میں رہتے تھے۔ سوتیلی ماں سے بھی ان کی بیوی کی ان بن ہوتی رہتی تھی۔ پریم چند اس شادی کو نبھانا نہیں چاہتے تھے لیکن مجبوراً انھیں نباہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ان کی خانگی زندگی کے مسائل و مشکلات کا پتہ ایک خط سے چلتا ہے جو انھوں نے مئی 1906ء میں منشی دیا نرائن نگم کو لکھا تھا:

''برادرم اپنی بپتی کس سے کہوں۔ ضبط کئے کئے کوفت ہو رہی ہے جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی تر ددات کا تانتا بندھا.... بیوی صاحبہ نے اب ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی۔ میکے جاؤں گی۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا ناچار رکھیت کا منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی۔ وہ رودھو کر چلی گئیں۔ میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔ آج ان کو گئے آٹھ روز ہوئے، نہ خط، نہ پتر۔ میں ان سے پہلے ہی خوش نہ تھا۔ اب تو صورت سے بیزار ہوں غالباً اب کی جدائی دائمی ثابت ہو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں بلا بیوی کے رہوں گا.... ادھر نانہال سے والدہ کی

طرف سے ضد ہے کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے۔ جب کہتا ہوں میں مفلس ہوں، کنگال ہوں، کھانے کو میسر نہیں تو والدہ صاحبہ کہتی ہیں تم اپنی رضامندی ظاہر کرو تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی۔ سنتا ہوں بیوی حسین ہے باشعور ہے۔ بہر حال اب کی تو گلا چھڑا ہی لوں گا۔''

مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند اپنی بیوی کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان سے ناراض تھے۔ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ جب وہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی تو انھوں نے نہ اسے روکا نہ ہی پہنچانا ہی ضروری سمجھا۔ اپنی خانگی میں وہ اتنے عاجز آ چکے تھے کہ انھوں نے خواہش کی کہ یہ جدائی دائمی ثابت ہو جائے تا کہ اس سے انھیں نجات مل جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بد سلیقہ اور تیز مزاج تھی اس لئے روز کے جھگڑوں سے پریشان ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ اندرناتھ کو انھوں نے ایک خط لکھا جس سے یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے دوسری شادی ایک بیوہ عورت سے کی تھی جس کے ساتھ وہ بہت خوش تھے۔ ان کی دوسری بیوی سلیقہ مند ہونے کے ساتھ ہی سمجھدار بھی تھی۔ وہ ان کے ہم مزاج ہونے کے علاوہ ہمیشہ ساتھ ہر لمحہ کھڑی رہی۔ پریم چند نے کہانی لکھنا بھی دوسری شادی کے بعد شروع کیا۔ وہ عدم تعاون تحریک میں بھی ان کے ساتھ رہی۔ خط میں انھوں نے دونوں بیویوں کے بارے میں لکھا ہے:

''میری شادی شدہ زندگی رومان سے قطعی بے بہرہ رہی۔ اس میں کوئی قابل ذکر بات نہیں، میری پہلی بیوی 1904 میں انتقال کر گئی۔ بے چاری بدقسمت اور معمولی شکل وصورت کی عورت تھی۔ گو کہ اس سے مطمئن نہ تھا لیکن روایتی شوہروں کی طرح اس سے نباہ کرتا رہا۔ اس کی وفات کے بعد میں نے ایک بال ودھوا سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ کافی خوشی کی زندگی گزر رہی ہے۔ اس نے کچھ ادبی ذوق بھی پیدا کر لیا ہے۔ اور کبھی کبھی کہانیاں بھی لکھتی ہے۔ وہ نڈر، دلیر، مخلص اور سمجھوتہ نہ کرنے والی عورت ہے... تحریک عدم تعاون میں شریک ہو کر جیل ہو آئی ہے۔ میں اس سے خوش ہوں۔''

پریم چند کے کئی خطوط ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری زندگی معاشی مسائل اور تنگ دستی کا شکار رہے۔ وہ اپنے اخراجات کے لئے اکثر دیا نرائن نگم سے قرض بھی لیا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگر آپ خط لے جانے والے کے ہاتھ پانچ روپے بھیج سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ کے پرانے قرضے اب تک ادا نہیں ہوئے۔ میں نے کوشش کی اور ناکام رہا۔ مگر خیر اب اگلے مہینے سے قسط وار دینا شروع کروں گا۔''

معاشی تنگی کی وجہ سے وہ ہفتہ وار اخبار ''آزاد'' میں مستقل کالم لکھنے کے لئے معاوضہ بھی طلب کیا کرتے تھے حالانکہ ان کی دیا نرائن نگم سے گہری دوستی تھی۔ اس کا ذکر ایک خط میں کرتے ہیں:

''میں اول سے اور اب تک حسب اوقات اور فرصت 'آزاد' کے لئے تھوڑا بہت لکھتا رہا ہوں مگر آپ جانتے ہیں یہ مادیت کا زمانہ ہے ہر ایک انسان اپنی محنت کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور چاہتا ہے۔ اس لئے میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ از راہ کرم جتنے مضامین یا نوٹ شائع کریں ان کی اجرت کسی ایک شرح سے مثلاً آٹھ آنے فی کالم مقرر فرما دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ 'آزاد' پر کوئی ناقابل برداشت بار نہ ہوگا۔ کیونکہ میں کسی ہفتے میں چار کالم سے زیادہ نہ لکھ سکوں گا اور 'آزاد' کو زیادہ سے زیادہ صرف دس روپے میری نذر کرنے پڑیں گے۔''

پریم چند کے خطوط کے اسلوب کی بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کی عبارتوں میں ایسی کوئی پیچیدگی یا تصنع نہیں ملتا جو مشکل پیدا کرے بلکہ ان کی تحریر میں بے ساختگی ہے۔ ان کے خطوط کچھ طویل ہیں اور کچھ مختصر لیکن ہر خط کا مقصد واضح ہے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو مسلسل خط لکھا کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا ان کے خطوط کے جواب بھی جلد دینے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے خطوط سے ہمیں ان کے حالات اور اس عہد کے حالات کا بھی علم ہوتا ہے۔ انھوں نے بہت ہی سہل انداز بیان کا استعمال کرتے

ہوئے اپنی باتیں دوسروں تک پہنچائی ہیں۔ پریم چند کے مکاتیب بھی اردو مکتوب نگاری کی روایت کی روشن کڑی ہے۔انھوں نے مکتوب نگاری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ایک اچھے مکتوب نگار کی حیثیت سے پریم چند کا نام اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

15.5 اداریہ نویسی کا فن

اداریہ نویسی ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق صحافت سے ہے۔اداریہ کو جاننے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم ادارت کے کام کو سمجھ لیں تا کہ اداریہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ادارت اور اداریہ یہ دونوں الگ نوعیت کے کام ہیں لیکن اس کو کرنے والا ادارتی عملہ ہوتا ہے۔ادارت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تدابیر، انتظام، حکم اور توجیہ ہیں۔انگریزی زبان میں اس کے لئے Editing لفظ استعمال ہوتا ہے۔ادارت سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی تحریر کو زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک کرنا تا کہ وہ شائع ہونے کے قابل ہو سکے۔یعنی کسی بھی تحریر میں کوئی خامی ہو تو اس کی نوک پلک درست کرنے کا کام ہی ادارت کہلاتا ہے۔کوئی بھی تحریر چھپنے سے قبل ادارت کی منزل سے ہو کر گزرتی ہے۔ادارت کا کام اشاعت کے ہر شعبے میں ہوتا ہے۔رسالوں، کتابوں، خبروں، کالموں اور مضامین کے لکھنے اور شائع ہونے کے درمیان اس کی پروف ریڈنگ، لائن ایڈیٹنگ، زبان و بیان اور املا و جملہ کی درستگی یہ سبھی کام ادارت کی ذیل میں آتے ہیں۔ادارت کی ذمہ داری کا کام مدیر، مدیر اعلیٰ اور معاون مدیر مل کر نبھاتے ہیں۔کسی بھی ادارے کی ضرورت کے مطابق ان مدیران کی تعداد کم اور زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔یعنی ادارت میں کسی بھی رسالے یا اخبار میں آئے مضمون پر نظر ثانی کی جاتی ہے۔

کسی بھی تحریر کے لئے قابل اشاعت ہونا درجہ بہ درجہ مکمل طور پر تکنیکی عمل ہے۔اس میں اخلاقیات اور جمالیات کا بھی دخل ہوتا ہے۔اس میں ان دونوں باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔اخلاقیات سے مراد یہ ہے کہ زندگی میں کس جگہ پر کس سے کس لہجے میں گفتگو کرنی ہے، کس سے کیسے پیش آنا ہے اور اگر کچھ لکھ رہے ہیں تو اس میں کیسی زبان استعمال کرنی ہے اور انداز بیان کیسا ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ اخلاقیات کی بہت سی شاخیں ہیں۔جیسے عام زندگی کی اخلاقیات، ڈاکٹر کی اخلاقیات، استاد کی اخلاقیات وغیرہ۔اسی طرح اشاعتی عمل کی اخلاقیات بھی ہے جس کا خیال ادارت میں رکھنا ضروری ہے۔مثلاً کتاب یا رسالے میں کون سے مضامین شائع ہونے ہیں، کس کو کچھ ترمیم کر کے شائع کیا جا سکتا ہے، کس میں کچھ اضافہ کر کے چھاپے جانے کے قابل بنایا جا سکتا ہے اور کس کو یکسر نظر انداز کر دینا ہے۔ان سب باتوں کا خیال کرنا ادارتی ذمہ داریوں کے تحت ضروری ہے تا کہ ایک عمدہ تحریر عوام یا قاری تک پہنچ سکے۔جمالیات سے مراد ظاہری خوبصورتی سے ہے۔ویسے تو جمالیات کی بھی بہت ساری شاخیں ہیں لیکن ادارتی نقطۂ نظر دیکھا جائے تو رسالے یا کتاب کا سرورق، اس کا رنگ، صفحۂ فہرست، عنوانات یا سرخیاں، سرخیوں کا انداز یہ تمام باتیں جمالیات کے ذیل میں آتی ہیں۔

کسی بھی رسالے یا اخبار کے چند اصول اور قواعد و ضوابط ہوتے ہیں۔اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی مضمون نگار اپنی تحریریں اس رسالے میں اشاعت کت لئے بھیجتا ہے۔اس موقع پر ادارتی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ ادارتی کمیٹی کو یہ دیکھا ہوتا ہے کہ مضمون ان کے قواعد و ضوابط کی نفی تو نہیں کر رہا۔اگر ایسا ہے تو اس میں کچھ ترمیم و اضافے کی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں۔اگر گنجائش نکل سکتی ہو تو ترمیم کر کے مضمون شائع کر دیا جاتا ہے اور اگر ایسا ہونا ممکن نہیں ہوتا تو اس تحریر کو خارج کر دیا جاتا ہے۔

'اداریہ' کے لغوی معنی اداریہ نگار کی فکر، تحریر یا اس کا مخصوص انداز میں اپنی اظہار رائے کرنا ہے۔اداریہ کے لئے انگریزی میں لفظ Editorial کا استعمال کیا جاتا ہے۔اداریہ ایک قسم کا مضمون ہوتا ہے جس میں اخبار یا رسالے کے ادارتی عملے کا کوئی رکن تحریر کرتا ہے۔جہاں

تک اداریے کے موضوع کا سوال ہے اس میں حالات حاضرہ پر گفتگو کی جاتی ہے۔ اگر اخبار کا اداریہ ہے تو اس میں سیاسی، سماجی یا معاشی حالات پر اظہار رائے کیا جاتا ہے۔ اگر کسی ادبی رسالے کا اداریہ ہے تو عہد حاضرہ کے ادبی رجحانات ونظریات پر گفتگو کی جائے گی۔ اگر سیاسی رسالہ ہے سیاسی معاملات پر گفتگو ہوگی۔ اقتصادی رسالہ ہے تو اس کے اداریہ میں معاشی مسائل اور نشیب وفراز کا ذکر کیا جائے گا۔ خواتین کا رسالہ ہے تو فیشن، پکوان، روزمرہ کی زندگی، بچوں کی پرورش، خواتین کی ترقی، تعلیم نسواں، خانگی مسائل وغیرہ پر اداریہ لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن ان تمام موضوعات میں اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اداریہ حقائق پر مبنی ہو اور اس کا انداز بیان سنجیدہ ہو۔

اخبارات یا رسائل کے لئے اداریے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اخبار ہو، ہفتہ وار ہو، پندرہ روزہ ہو، یا ماہنامہ، سہ نامہ یا شش ماہی رسالہ ہو سب میں اداریہ لازمی جز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اداریے کو کسی بھی اخبار یا رسالے کی ریڑھ کی ہڈی مانا گیا ہے۔ اداریہ کے ذریعے مدیر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ سماج کو آئینہ بھی دکھانے کا کام کرتا ہے اور اصلاح کا بھی فریضہ نبھاتا ہے۔ مدیر کا کام یہ بھی ہے کہ وہ قارئین کے لئے اچھے مواد کا انتخاب کرے اور اداریہ میں اس کی اہمیت پر روشنی بھی ڈالے۔ اداریہ کسی بھی رسالے یا اخبار کی شناخت بھی ہوتا ہے۔ اس میں اس کے مقصد کا ذکر بھی ہوتا ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ اداریہ کو پڑھ کر قاری اس بات کو معلوم کرسکتا ہے کہ اخبار یا رسالہ کس مقصد کے تحت نکالا جارہا ہے۔ اس لئے اداریہ اس کی روح مانا جاتا ہے اور اس میں ایسا معروضی مواد شامل ہونا چاہیے جو اہم ہونے کے ساتھ ساتھ اداریہ کے بنیادی مقصد کی تکمیل بھی کرتا ہو۔ اداریہ کا طرز بیان سنجیدہ ہوتا ہے۔ اس سنجیدگی کی وجہ سے ہی لوگ اسے پڑھنے میں دلچسپی لیتے ہیں اور کسی مسئلہ سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کے بعد حقائق کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

15.5.1 اداریوں کی اقسام

مواد کے اعتبار سے اداریہ کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆ معلوماتی دارایے

☆ استدلالی اداریے

☆ تفریحی اداریے

ان کے علاوہ اداریوں کو معاشی اداریے، سیاسی ادایے، معاشرتی اداریے اور سائنسی اداریے وغیرہ میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

معلوماتی اداریے:

اس قسم کے اداریے کسی بھی موضوع پر معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سیاسی، سماجی، معاشی یا رجحانات وغیرہ پر کسی بھی واقعے کا حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے جس سے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

استدلالی اداریے:

استدلالی اداریے میں مدیر قاری کے سامنے کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور دلائل کے ساتھ اس کو صحیح ثابت کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ اس کی رائے کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف بھی ہوسکتی ہے۔ اپنے مخصوص انداز فکر کے ساتھ وہ اختتام میں اپنی رائے پر زور دیتا ہے۔

تفریحی اداریے:

اس قسم کے اداریوں کا رواج کم ہے کیونکہ اداریوں میں سنجیدگی کا عنصر غالب رہتا ہے۔ لیکن اس قسم کے اداریے میں مدیر اپنی بات کو یا

کسی موضوع پر اپنے خیالات کو نہایت ہی ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرتا ہے۔تفریحی اداریہ ادارتی صفحے کی ثقالت کو ختم کر دیتا ہے اور خوشگوار احساس کراتا ہے۔

15.5.2 اداریہ نگار کے اوصاف

اداریہ لکھنے والے پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس لئے اس کے اندر کئی اوصاف کو ہونا ضروری ہے تا کہ اس ذمہ داری کو وہ بخوبی نبھا سکے۔اداریہ نگار کو زبان پر دسترس ہونا ضروری ہے۔اس کی وجہ سے وہ تمام واقعات، خیالات، افکار ونظریات کی ترسیل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے جس کے لئے اسے موزوں الفاظ اور مدلل انداز بیان کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔اس لئے زبان کا برمحل استعمال آنا اور الفاظ پر اچھی پکڑ ہونا اداریہ لکھنے والے کے لئے ضروری ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں کسی بھی چیز کو منطق کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔اداریہ نگار کو چاہئے کہ جب بھی کسی واقعہ کا ذکر کرے یا کسی بات کو پیش کرے تو اس میں منطقی انداز اپنائے اور عقل کو استدلال کے ساتھ اپنی بات قارئین کے سامنے لائے۔اس کے ساتھ ہی اداریہ نگار کا اخبار کی پالیسی سے بخوبی آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔اخبار کا مکتب فکر کیا ہے اس بات کا علم ہونا ضروری ہے۔

اداریہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مطالعے میں وسعت پیدا کرے کیونکہ اس کو معاشرے کے تمام مسائل پر لکھنا ہوتا ہے۔ اگر اس کا علم محدود ہوگا تو وہ دلائل وتجاویز کے ساتھ اپنی بات سامنے نہیں رکھ پائے گا اور قارئین کو متاثر بھی نہیں کر سکے گا۔اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سماج کی تہذیب وثقافت اور معاشرتی حالات سے بھی واقفیت رکھتا ہوتا کہ اس کے قلم سے کوئی ایسی بات نہ لکھ جائے جس سے کسی طبقۂ خاص کو ٹھیس پہنچے۔اس لئے مطالعے کی وسعت اس کے لئے ضروری ہے۔

اداریہ نگار میں رہنمائی کا جذبہ ہونا چاہئے تا کہ اپنی تحریروں میں وہ ایسا مواد شامل کرے جس سے عوام کو صحیح اور غلط کی پہچان ہو سکے۔ اس کے اندر قوت فیصلہ بھی ہونا چاہیے اور اس کے لئے غور وفکر کی ضرورت پڑتی ہے۔جب وہ اعلیٰ فکری صلاحیتوں کا مالک ہوگا تو نظریات و تصورات کو قبول کرنے کے بجائے اپنے علم اور بالغ النظری کی مدد سے صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہوگا اور کامیاب اداریہ نگار بن سکے گا۔

15.6 پریم چند کے اداریے

میٹرک کی کامیابی کے فوراً بعد پریم چند کو ایک اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے عارضی ملازمت مل گئی۔ملازمت کے دوران ہی انھیں سرکاری ٹیچر ٹریننگ کے لئے الہ آباد ٹریننگ کالج بھیج دیا گیا۔یہاں ٹریننگ کا امتحان پاس کرنے کے بعد الہ آباد ماڈل اسکول کے صدر مدرس کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ابھی الہ آباد آئے انھیں چند مہینے ہی گزرے تھے کہ ان کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔کانپور میں ان کی ملاقات اس وقت کے مشہور رسالے ''زمانہ'' کے مدیر منشی دیانرائن نگم سے ہوئی۔یہ ملاقات بہت جلد دوستی میں بدل گئی اور پریم چند کی وفات تک قائم رہی۔ کانپور میں ان کا قیام زیادہ تر دیانرائن نگم کے یہاں رہا۔ان دونوں کی دوستی منفرد اور بے مثال تھی۔دیانرائن نگم کی رفاقت پریم چند کی زندگی میں اہم موڑ لے کر آئی۔کانپور کے قیام، دیانرائن نگم سے رفاقت اور ''زمانہ'' سے وابستگی کے بعد ہی پریم چند کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ یہاں انھیں تصنیف وتالیف کے بہترین مواقع میسر ہوئے۔پریم چند ''زمانہ'' کے مستقل قلمکار تھے۔اسی کے ساتھ انھوں نے اس رسالے کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔قیام کانپور کے دوران لکھنے پڑھنے، ''زمانہ'' سے وابستگی، تصنیف وتالیف اور ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے سے ان کے ادبی ذوق کو جلا ملی۔وہ ان صحبتوں کو اپنی زندگی کا بہترین زمانہ قرار دیتے ہیں۔

1922ء میں پریم چند بنارس سے شائع ہونے والے ہندی زبان کے ماہنامے ''مریادا'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہاں پبلشنگ کے کاروبار سے دلچسپی پیدا ہوئی تو انھوں نے خود اس کاروبار کو شروع کیا۔ وہ ایک ایسا پریس قائم کرنا چاہتے تھے جہاں سے اعلیٰ ومعیاری کتابیں شائع ہوں۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے بنارس میں 1923ء میں 'سرسوتی پریس' قائم کیا۔ یہ پریس شراکت داری سے قائم ہوا تھا لیکن پریس میں مسلسل نقصان ہونے کی وجہ سے ان کے شراکت دار نے اپنا پیسہ واپس لے لیا۔ اس کے بعد بھی انھوں نے یہ پریس مستقل مزاجی کے ساتھ چلایا اور نقصان کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

1929ء میں پریم چند ''مادھوری'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ ایک مشہور رسالہ تھا۔ اس کے ذریعہ ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ 1930ء میں پریم چند نے اپنا رسالہ ''ہنس'' جاری کیا۔ اس رسالے کے جاری ہونے کے بعد وہ ''مادھوری'' سے الگ ہو گئے اور اپنی ساری توجہ ''ہنس'' کی ادارت واشاعت پر مرکوز کر دیں۔ پریم چند کی محنت اور توجہ کی بنا پر بہت جلد ہی یہ رسالہ ہندی کا مشہور اور معیاری رسالہ بن گیا۔ ''ہنس'' کے ذریعہ پریم چند ایک بہترین مدیر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ''ہنس'' کے بعد انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار ''جاگرن'' جاری کیا۔ اس کو جاری کرنے میں پریم چند کو بہت زیادہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے مستقل مزاجی سے اسے جاری رکھا۔ چونکہ ان کا مقصد صالح ادب کو فروغ دینا تھا اس لئے ان رسالوں اور اخبار کے ذریعہ بھی انھوں نے سماج اور ادب کی اصلاح کا کام لیا۔ انھوں نے مضامین اور اداریوں کے ذریعہ بھی سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کو ہی اولیت دی۔ اسی کے ساتھ عوام کے دلوں میں جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کی لو بھی جلائی۔

''ہنس'' کی ادارت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پریم چند نے اس دور کے نئے مصنفین کو اپنے رسالے میں جگہ دی۔ ان کی نگاہ صلاحیت پر بھی شخصیت پر نہیں۔ ان کے ادبی دوستوں کا ایک خاص حلقہ تھا جن سے وہ گھریلو اور ادبی گفتگو کیا کرتے تھے لیکن اپنے دوستوں کو انھوں نے کبھی غیر ضروری ترجیح نہیں دی اور نہ کبھی اپنے ادبی وغیر ادبی مقصد کے لئے استعمال کیا۔ ادبی چیلنج کو انھوں نے اپنے بل پر قبول کیا اور ساری لڑائی اکیلے لڑی۔ وہ اپنے افکار وخیالات اور تصنیفات کے لئے ہمیشہ خود اعتماد رہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی تخلیقات میں وقت کے ساتھ تبدیلی بھی کی۔ یہ رونہ انھوں نے نہ صرف ''ہنس'' میں اپنایا بلکہ ''مریادا''، ''مادھوری'' اور ''جاگرن'' میں بھی ان کی خدمات اسی طرح کی رہیں۔

''ہنس'' اس وقت جاری ہوا جب ملک کی آزادی کے لئے عوام نے کمر کس لی تھی۔ مہاتما گاندھی کانگریس کے ذریعے 'عدم تعاون' تحریک چلا رہے تھے۔ زیادہ تر اہل علم، مصنفین اور شعرا آزادی کے لئے اپنے اپنے طریقے سے جدوجہد کرتے نظر آرہے تھے۔ پریم چند کے رسالے کے آئیڈیل مہاویر پرساد دویدی، گنیش شنکر ودھیارتھی، آچاریہ شِو پوجن سہائے اور نرالا تھے۔ ''مریادا''، ''مادھوری''، ''جاگرن''، ''پرتاپ'' اور ''ہنس'' کے مقاصد تقریباً ایک ہی تھے۔ ''ہنس'' کا شمارہ پریم چند کے خیالات ونظریات کا عکاسی کرتا ہے۔ پریم چند ہر قسم کی غلامی کے خلاف تھے۔ سیاسی، مذہبی، معاشی، سماجی اور فکر کی آزادی اگر نہ ملے تو انسان کو کوڑھ مغز بنا دیتی ہے۔ اس معاملے میں پریم چند کے خیالات بہت واضح تھے۔ پریم چند نے ''ہنس'' کے ذریعے بہت سارے سماجی مسائل کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

پریم چند کا رسالہ ''ہنس'' کا پہلا شمارہ 1930 میں نکلا۔ اس کے نکلتے ہی ہندی ادب وصحافت میں قومی اصلاح کی ایک لہر چل پڑی۔ جہاں ہندوستان میں جنوبی علاقہ، گجرات، مدھیہ پردیش، میواڑ، مالوا، بہار، بنگال، اڑیسہ، مدراس اور کنڑ وغیرہ خطے میں سیکڑوں لوگ ''ہنس'' کے قاری تھے۔ وہیں نیپال، بھوٹان، جاپان، افریقہ، جرمنی وغیرہ غیر ممالک میں بھی اس رسالے کا بے صبری سے انتظار کرنے والے قارئین

موجود تھے۔ ''ہنس'' ملک کی آزادی اور سماجی برائیوں کے خلاف لڑتا رہا۔ بحیثیت مدیر پریم چند نے نقصان میں چلنے کے باوجود حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے اسے جاری رکھا۔ یہ رسالہ کبھی اپنے مقاصد سے پیچھے نہیں ہٹا اور اس کی وجہ پریم چند کی کڑی مشقت ہے۔

15.7 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے خطوط نگاری کا فن اور اس کی اہمیت کے بارے میں جانا۔

آپ نے اداریہ نویسی کے فن کے بارے میں جانا۔

آپ نے پریم چند کی خطوط نگاری کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کی۔

آپ نے پریم چند کی ادارت کے بارے میں جانا۔

آپ کو پریم چند کے افکار و خیالات کو خطوط کے ذریعے جاننے میں مدد ملی۔

15.8 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ خطوط کے فن اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

2۔ پریم چند کے خطوط کی انفرادیت بتائیے۔

3۔ پریم چند کی خطوط نگاری پر مضمون لکھئے۔

4۔ اداریہ کسے کہتے ہیں اس پر مختصر نوٹ لکھئے۔

5۔ پریم چند کے اداریوں پر ایک مضمون قلمبند کیجئے۔

15.9 سوالات کے جواب

جواب 1: خطوط نگاری کو ادب لطیف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے بہت زیادہ اصول وضوابط نہیں بنائے گئے ہیں۔ اس لئے کافی حد تک یہ فنی جکڑ بندیوں سے آزاد ہے۔ خط کے لئے نہ تو موضوع کی قید ہے نہ ہی ہیئت کی۔ لیکن ادبی خطوط اپنی داخلی کیفیات اور خصوصیات کے لحاظ سے ذرا منفرد ہوتے ہیں۔ اس میں چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ کوئی ایسی بات خط میں نہ لکھی جائے جو معیوب معلوم ہو۔

خط دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلا ذاتی یا نجی خط۔ دوسرا کاروباری یا دفتری خط۔ ذاتی خطوط میں لکھنے والا کوئی بھی بات لکھ سکتا ہے جو اس کے ذہن میں ہو یا کسی خیال کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس قسم کے خط میں وہ کسی سے شکایت کر سکتا ہے، کسی کو کوئی خبر دے سکتا ہے، کسی سے کسی مسئلہ پر گفتگو کر سکتا ہے، غرضیکہ ایسے سیکڑوں موضوعات ہیں جو ذاتی خط کا حصہ بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذاتی خط کا کوئی طے شدہ ڈھانچہ یا فارمیٹ نہیں ہوتا۔ وہ کسی بھی طریقے سے لکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف کاروباری یا دفتری خط ہوتے ہیں۔ ان میں کاروبار یا دفتر سے متعلق باتوں کا ہی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک طے شدہ فارمیٹ ہوتا ہے اور اسی فارمیٹ پر مکتوب نگار اپنا مدعا کم سے کم الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

خط کا بنیادی وصف اس کا اختصار ہوتا ہے۔ اس کی طوالت کو فنی نقطۂ نظر سے عیب سمجھا جاتا ہے۔ مکتوب نگاری اپنے ادبی حسن کے لحاظ سے ایک نہایت ہی نازک فن ہے جہاں غیر ضروری تکلف اور بناوٹ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ خط میں جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہو وہ بے ساختہ اور برجستہ ہونا چاہیے۔

جواب 2: پریم چند کے خطوط سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسالہ ''زمانہ'' کا ایک شمارہ خواجہ حیدر علی آتش نمبر کے طور پر نکالا گیا تھا۔ اسی رسالہ میں آتش کے منتخب اشعار بھی شامل کئے گئے تھے جس پر پریم چند نے سخت تنقید کی اور کہا کہ ایسے اشعار کی موجودہ عہد میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مذکورہ شمارے پر تنقیدی رائے دیتے ہوئے پریم چند نے جو خط لکھا ہے اس سے پریم چند کے ادبی نظریات اور ان کی تنقیدی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے اپنے خطوط میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اخبارات و رسائل کی ترقی و تنزلی پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ یہاں دونوں زبانوں کی صحافت پر موازنہ بھی ملتا ہے۔ پریم چند اپنے خطوط میں دونوں زبانوں کے رسائل و جرائد کی تعداد پر خوشی کا اظہار بھی کرتے ہیں اور ان کی خستہ حالی پر افسوس بھی ظاہر کرتے ہیں۔

پریم چند کے ادبی خزانے میں کئی قسم کے خطوط موجود ہیں جن کے ذریعہ ان کی حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی ذاتی زندگی، گھریلو معاملات و مسائل، کنبہ، افراد خانہ کے متعلق بہت ساری باتیں ان کے خطوط کی مدد سے منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کی والدہ سوتیلی تھیں جن کا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ ان کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ازدواجی زندگی سے پریم چند خوش نہیں تھے کیونکہ گھر میں آپسی جھگڑے بہت ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت اذیت میں رہتے تھے۔ سوتیلی ماں سے بھی ان کی بیوی کی ان بن ہوتی رہتی تھی۔ پریم چند اس شادی کو نبھانا نہیں چاہتے تھے لیکن مجبوراً انھیں نباہ کرنا پڑ رہا تھا۔

جواب 5: ء میں پریم چند بنارس سے شائع ہونے والے ہندی زبان کے ماہنامے ''مریادا'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہاں پبلشنگ کے کاروبار سے دلچسپی پیدا ہوئی تو انھوں نے خود اس کاروبار کو شروع کیا۔ وہ ایک ایسا پریس قائم کرنا چاہتے تھے جہاں سے اعلیٰ و معیاری کتابیں شائع ہوں۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے بنارس میں 1923ء میں 'سرسوتی پریس' قائم کیا۔ یہ پریس شراکت داری سے قائم ہوا تھا لیکن پریس میں مسلسل نقصان ہونے کی وجہ سے ان کے شراکت دار نے اپنا پیسہ واپس لے لیا۔ اس کے بعد بھی انھوں نے یہ پریس مستقل مزاجی کے ساتھ چلایا اور نقصان کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

1929ء میں پریم چند ''مادھوری'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ ایک مشہور رسالہ تھا۔ اس کے ذریعہ ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ 1930ء میں پریم چند نے اپنا رسالہ ''ہنس'' جاری کیا۔ اس رسالے کے جاری ہونے کے بعد وہ ''مادھوری'' سے الگ ہوگئے اور اپنی ساری توجہ ''ہنس'' کی ادارت و اشاعت پر مرکوز کر دیں۔ پریم چند کی محنت اور توجہ کی بنا پر بہت جلد ہی یہ رسالہ ہندی کا مشہور اور معیاری رسالہ بن گیا۔ ''ہنس'' کے ذریعہ پریم چند ایک بہترین مدیر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ''ہنس'' کے بعد انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار ''جاگرن'' جاری کیا۔ اس کو جاری کرنے میں پریم چند کو بہت زیادہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے مستقل مزاجی سے اسے جاری رکھا۔ چونکہ ان کا مقصد صالح ادب کو فروغ دینا تھا اس لئے ان رسالوں اور اخبار کے ذریعہ بھی انھوں نے سماج اور ادب کی اصلاح کا کام لیا۔ انھوں نے مضامین اور اداریوں کے ذریعہ بھی سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کو ہی اولیت دی۔ اسی کے ساتھ عوام کے دلوں میں جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کی لو بھی جلائی۔

15.10 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی

مذموم	جس کی مذمت کی جائے	تنظیم	منظّم کرنا، نظام
دہن	زبان	روزنامہ	روز نکلنے والا اخبار
سبزہ	ہرا بھرا	مخرب	خراب کرنے والا
انکشاف	ظاہر ہونا	حیاسوز	بے حیا
مشاہدہ	عینی تجربہ	بعید	فاصلے پر ہونا
فہم	عقل	ثقالت	بھاری پن
مزاحمت	روکنے کا عمل	منطقی	مدلل، دلیل کے ساتھ
مضمر	چھپا ہوا	ثقیل	بھاری، بوجھل
مکتب فکر	متفق رائے رکھنے والے افراد کا مجموعہ		

15.11 کتب برائے مطالعہ

1۔ مدن گوپال، پریم چند کے خطوط، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1968ء

2۔ ڈاکٹر شاداب تبسم، اردو مکتوب نگاری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2012ء

3۔ ڈاکٹر ریشماں تبسم، بہار میں اردو مکتوب نگاری، 2013ء

4۔ پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، 2017ء

5۔ جعفر رضا، پریم چند کہانی کار رہنما، شبستان، الہ آباد 1969ء

6۔ اصغر علی انجینئر، پریم چند حیات اور فن، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، دہلی، 1981ء

7۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی، اداریہ نویسی اور میرے اداریے، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2016ء

اکائی:16 دیگرافسانہ نگاروں پر پریم چند کے اثرات

16.1 اغراض ومقاصد
16.2 تمہید
16.3 عہد پریم چند: سماجی، سیاسی، معاشی وادبی تناظر میں
16.4 پریم چند کی افسانہ نگاری
16.5 دیگرافسانہ نگاروں پر پریم چند کے اثرات
16.6 آپ نے کیا سیکھا
16.7 اپنا امتحان خود لیجئے
16.8 سوالات کے جواب
16.9 فرہنگ
16.10 کتب برائے مطالعہ

16.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم عہد پریم چند کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی حالات سے واقف ہوں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کے فن افسانہ نگاری کے بارے میں جانیں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کے افسانوں کے موضوعات کے متعلق جانیں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے فن پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔
اس اکائی میں ہم پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگاروں پر پریم چند کے اثرات کا مشاہدہ کریں گے۔

16.2 تمہید

پریم چند کی شخصیت اردو ادب کی تاریخ میں اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اردو افسانے کی باقاعدہ بنیاد ڈالی اور بنیادگزار افسانہ نگاروں میں ہونے کے باوجود ان کا فن اعلی درجہ پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے فن افسانہ نگاری کو عروج پر پہنچایا۔ عہد پریم چند کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کی عکاسی ان کی تخلیقات میں صاف نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں، ناولوں، مضامین اور خطوط میں ہندوستان کا مکمل عکس نظر آتا ہے۔ سماجی مسائل ہوں، معاشی تنگدستی ہو، سیاسی نشیب وفراز ہو یا صحافتی میدان کی بدعنوانیاں ہوں ان سبھی کے متعلق انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں حقیقت پیش نظر رہتی ہے۔ ان کی تحریروں اور خیالات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سماج کے ہر شعبے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ سماج کے گوشے گوشے پر ان کی پینی نظر تھی۔ ان کے تخلیقات کا

مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر انھوں نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ ناول اور افسانوں میں تو سماجی و معاشی پس منظر زیادہ نظر آتا ہے لیکن مضامین اور خطوط میں تعلیم و تربیت، صحافت، جغرافیہ، سرکاری پالیسی، مذہبی توہم پرستی، فرقہ واریت وغیرہ موضوعات پر خامہ فرسائی ملتی ہے۔ پریم چند اپنے عہد کے بڑے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ چونکہ افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں وہ سب سے اہم مصنف ہیں اس لئے ان کی تخلیقات کا اثر متاخرین کے یہاں بھی موجود ہے۔

16.3 عہد پریم چند: سماجی، سیاسی، معاشی و ادبی تناظر میں

انیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی تک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت انتشار کا دور رہا۔ اس عہد میں جو سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا۔ اس سلسلہ میں ایک کڑی کے طور پر پریم چند کا نام بھی جڑتا ہے۔ اس عہد کے ادبی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے 1857 کی جنگ آزادی نے ہندوستانی حالات پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کے بعد سے مسلسل آزادی کے لئے جدوجہد شروع ہوگئی۔ دنیا میں پہلی جنگ عظیم 1914 سے 1918 کے درمیان ہوئی۔ جس نے انسانی نسل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ 1917 میں ہونے والے انقلاب روس نے پوری دنیا کے مزدوروں اور کسانوں کو اپنے حق کے لئے آواز اٹھانے کی ہمت پیدا کی۔ اس کے بعد اس سماجی تحریک کے زیر اثر 1936 میں ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز ہوا جس نے سماج کے کمزور طبقے کے حق کے لئے آواز اٹھائی اور 'ادب برائے ادب' کے بجائے 'ادب برائے زندگی' کا نعرہ بلند کیا۔ 1880 میں پریم چند کی پیدائش ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جہاں چاروں طرف افراتفری کا ماحول ہے۔ پریم چند نے اسی زمانے میں آنکھیں کھولیں اور نامساعد حالات دیکھے۔ ان تمام حالات کا اثر ان کے ذہن پر پڑا۔ 1857 کی ناکام بغاوت نے ایک طرف جہاں ملک کی آزادی کے لئے کی جانے والی جدوجہد کو کمزور کر دیا وہیں دوسری جانب ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات میں بھی کشیدگی پیدا ہوگئی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو اس بغاوت کا ملزم ٹھہرایا اور ان کے ساتھ مظالم کی انتہا کر دی۔ ایسے حالات میں بہت سارے ہندوؤں نے بھی انگریزوں کی حمایت کی اور اس طرح ہندو مسلم فساد بھی پیدا ہوا۔ پریم چند نے بچپن سے ایسے ہی حالات کا سامنا کیا۔ ان کے ذہنی نشو نما میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی مسائل کے ساتھ ہی عالمی سطح پر پیدا ہونے والے حالات کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔ وہ ان سبھی چیزوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے عہد میں ہونے والی زیادتیاں اور مظالم کے وہ سخت مخالف تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے ''ترقی پسند ادبی تحریک'' کے مقاصد کے تحت پریم چند نے اپنی تخلیقات تحریر کی۔ چونکہ مذکورہ تحریک سماج کے کمزور طبقے کے حقوق کے لئے آواز اٹھایا اور ان کے لئے انصاف کا مطالبہ کیا، لہٰذا پریم چند نے بھی اس تحریک میں شامل ہو کر سماجی اصلاح کا کام کیا۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا دور دراصل ہندوستان میں قومی بیداری کا عہد کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان کے افسانوں میں سارے حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ پریم چند کے بعد اردو افسانے پر جس چیز نے اثر ڈالا وہ افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' ہے۔ اس مجموعے میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانے شامل تھے۔ ان افسانوں سے متاثر ہو کر اردو ادب کے دیگر افسانہ نگاروں نے بھی سیاسی، سماجی اور گھریلو زندگی کے مسائل، شہری زندگی کی افراتفری اور انسانی نفسیات کی گتھیوں پر لکھنا شروع کیا۔ چونکہ انگریزوں کا اثر پورے ہندوستان پر بہت زیادہ تھا لہٰذا انگریزی ادب سے متاثر ہو کر افسانے میں بہت سارے نئے تجربات بھی کئے گئے۔

16.4 پریم چند کی افسانہ نگاری

اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں پریم چند کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ ابتدائی دور کے افسانہ نگار ہونے کے

باوجود بعد کے تمام افسانہ نگاروں سے نہ تو فن اور نہ ہی موضوع کے اعتبار سے کسی طور پیچھے نظر آتے ہیں۔حقیقت پسند افسانہ نگاری میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔افسانوں کے ساتھ ناولوں میں بھی انھوں نے یہی رجحان اپنایا اور اردو ادب کو حقیقت پسندی کی راہ پر لانے کی کامیاب کوشش کی۔ پریم چند کی افسانہ نگاری میں بتدریج ارتقاء نظر آتا ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' سے لے کر آخری دور کے مجموعوں ''واردات'' اور ''زادراہ'' میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ان کے افسانوی دور کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور 1909 سے لے کر 1920 کے عرصے پر محیط ہے۔دوسرا دور 1930 سے 1932 کے درمیان کا وقفہ ہے۔تیسرا دور 1933 سے 1936 تک کا ہے جو ان کی زندگی کے آخری تین سال کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلے دور کے افسانوں میں رومانی تصورات زیادہ نظر آتے ہیں۔دوسرے دور کے افسانوں میں معاشرتی برائیاں اور ان کی اصلاح کی جانب توجہ کی گئی ہے ساتھ ہی سیاسی موضوعات پر بھی افسانے میں ملتے ہیں۔آخری دور کے افسانوں میں پریم چند کے یہاں حقیقت پسندی کی جانب بہت توجہ زیادہ ملتی ہے۔اس دور میں موضوع اور فن پر ان کی گہری دسترس نظر آتی ہے۔ یہاں فنی عظمت اور موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔

پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' کے نام سے شائع ہوا۔اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' میں انھوں نے آزادیٔ وطن کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ہندوستانی عوام کو جذبۂ آزادی کی جانب راغب کیا ہے۔دوسرا افسانہ ''شیخ مخمور'' بھی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔تیسرا افسانہ ''یہی میرا وطن ہے'' ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو آٹھ سال سے امریکہ میں رہ رہا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس کی آخری سانسیں ہندوستان کی زمین پر ہی پوری ہوں۔اس کے بعد افسانہ ''عشق دنیا و حب وطن'' میں پریم چند نے اٹلی کے ایک شخص کی اپنے وطن سے محبت میں سرشاری کو پیش کیا ہے۔جس نے اپنے ملک کے قیام کے لئے مسلسل جد جہد کی۔قوم کی کردار سازی کا جذبہ بھی پریم چند کے یہاں دکھائی دیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے انھوں نے ان کی نظریں معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کی جانب بھی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک اخلاقی پستی، طبقاتی کشمکش، ذاتی مفادات اور جذبۂ ایثار کا فقدان رہے گا تب تک کسی بھی ملک کو آزادی کا حصول نہیں ہوسکتا۔اس طرح کے افسانوں میں ''مریادا کی قربان گاہ''، ''رانی سارندھا''، ''وکرمادتیہ کا تیغہ''، ''راجہ مہردول'' اور ''سرپرغرور'' وغیرہ اہم ہیں۔''رانی سارندھا'' اپنی عزت کے لئے جان قربان کرنے والوں کی کہانی ہے۔دیگر افسانوں میں مرکزی کرداروں کے ذریعہ پریم چند نے قوم میں عدل وانصاف اور شجاعت دکھا کر نوجوانوں کے لئے مثالیں پیش کی ہیں۔ان مثالی کرداروں کے ذریعہ پریم چند نے قوم میں اخلاقی پستی کو دور کرنے اعلیٰ سماجی اقدار کو فروغ دینے کا کام کیا ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں بتدریج ترقی دیکھنے کو ملتی ہے۔رفتہ رفتہ انھوں نے مثالیت اور رومانیت سے احتراز کرنا شروع کر دیا اور حقیقت پسندی کی جانب راغب ہوئے۔اس ضمن نے انھوں نے سب سے زیادہ جس موضوع پر لکھا ہے وہ دیہی زندگی کے مسائل ہیں۔انھوں نے ہندوستان کے دیہی سماج کی عکاسی کرنے میں کوئی پہلو اچھوتا نہیں چھوڑا ہے۔دیہی سماج کی رسوم، تعلیم کی کمی، کسانوں کا استحصال، غربت وغیرہ کا ذکر ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔''عیدگاہ''، ''روشنی''، ''پوس کی رات'' اور ''کفن'' جیسے افسانے اس کی مثال ہیں۔ پریم چند کے عہد میں ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام عروج پر تھا۔ملک کی زیادہ تر آبادی دیہات میں قیام کرتی تھی اور ان کے ساتھ زمینداروں نے خوب ظلم کیا۔وہ معاشی طور پر اتنے کمزور تھے کہ ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔اس سلسلے میں افسانہ ''سواسیر گیہوں''، ''خون سفید''، ''گھاس والی''، ''آخر کار''، ''نجات'' وغیرہ میں سماجی طور سے پسماندہ لوگوں کی داستان بیان کی گئی ہے جن کے ساتھ کسی نہ کسی صورت ظلم ہو رہا ہے۔ زمینداروں، مہاجنوں، مذہبی ٹھیکیداروں کے مظالم کے انتہا ان کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے جس کے مطالعے سے انسان کے روئیں

کھڑے ہوجاتے ہیں۔پسماندہ طبقے کے علاوہ خواتین کی سماجی حالت پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں ایسے ہزاروں مسائل ہیں جوصرف عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔مثلاً ہندو بیواؤں کو خادماؤں کی طرح رکھا جاتا ہے اوران سے برا سلوک کیا جاتا تھا۔ بیوہ ہوتے ہیں اچھا کھانا، آرام سے سونا، اچھے کپڑے یہ سب کچھ ان سے چھین لیا جاتا تھا۔ دوسری شادی کا تصور نہ ہونے کی وجہ سے بیواؤں کا کوئی سہارا نہیں ہوتا تھا۔ بیواؤں کے علاوہ کچھ کچھ سہاگنوں کے ساتھ بھی بدسلوکی کی جاتی تھی۔غرضیکہ عورتوں کی حالت پر نظر ڈالی جائے تو بہت ساری ناانصافیاں ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔خواتین کے حالات پر بھی پریم چند نے قلم اٹھایا۔افسانہ ''ابھاگن''، ''کسم''، ''بدنصیب ماں'' اور ''بازیافت'' وغیرہ اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

16.5 دیگر افسانہ نگاروں پر پریم چند کے اثرات

بیسویں صدی کا نصف اول مختصر انداز میں مختلف تحریکوں کی تاریخ ہے جس سے ہمیں ملک کے معاشی، سیاسی، تعلیمی اور سماجی حالات وکیفیات کا پتہ چلتا ہے۔اس دور میں مختصر افسانہ نگاری کے واضح میلانات سامنے آتے ہیں۔اس میں دو قسم کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ایک رومانیت وتخیل پرستی کا، جس کے امام سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری تھے۔ دوسرا حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کا جس کے نقیب پریم چند تھے۔

پریم چند جس وقت افسانہ لکھ رہے تھے وہ زمانہ دراصل ہندوستان میں قومی بیداری کا دور تھا۔اس لئے ان کے افسانوں میں ساری مختلف حالات وکیفیات، اس عہد کی تحریکوں اور رجحانات کے مقاصد نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے بعد اردو افسانے کو سب سے زیادہ متاثر کرنے میں افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' کا ہاتھ رہا ہے۔اس مجموعے میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانے شامل تھے۔''انگارے'' کے بعد اردو افسانے میں بیسوی صدی کے پیچیدہ مسائل اور شہری زندگی کی تمام نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی جگہ دی جانے لگی۔ چونکہ ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط قائم تھا لہٰذا مغربی ادب سے متاثر ہوکر افسانے کی تکنیک میں بہت سے نئے تجربات بھی کئے گئے ۔کچھ افسانہ نگار فرائڈ سے متاثر نظر آتے ہیں جنھوں نے جنسی مسائل کو اپنے فن پاروں کا محور بنایا۔

پریم چند کے افسانوں میں عام آدمی کے درد وغم، رہن سہن، سماجی تعلقات، معاشی کشمکش، مذہبی اور سماجی رسم ورواج کی پابندی تک واقعات اور حقائق کے پس پردہ قاری کی رسائی ہوئی۔اس کے علاوہ سماجی فلاح وبہبود کے ساتھ، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے پیرائے میں عوام کے ذہن تک رسائی حاصل کرکے بہت مقبول ہوئے۔ان کے افسانوں کا محور دیہات میں قیام پذیر لوگوں کی سیدھی سادی زندگی، ان کی سچائی، ایمانداری، بے ایمانی سے پہنچنے والے نقصانات، غربت کی مار، کاشتکاری میں خسارہ، زمینداروں کا ظلم، پولیس اور دوسرے سرکاری عملے کا عتاب اور کبھی قحط کا سامنا سبھی کچھ ہے۔اس کے علاوہ ہندو سماج کے رسم ورواج، عادات واطوار، عقائد اور سماج کے اصلاحی نظریے یہ سب ان کے افسانوں میں عام طور پر موجود ہیں۔ پریم چند کے اثرات سے اردو میں اصلاحی افسانوں کی جو روایت پروان چڑھ رہی تھی اس سے سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ان فن کاروں نے اصلاحی نقطۂ نظر کو ادب میں وسعت دی اور افسانے میں حقیقت نگاری کو پیش پیش رکھا۔ان کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی، منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، حیات اللہ انصاری، دیویندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشک، احمد علی اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نے پریم چند کی روش اختیار کی اور ادب میں حقیقت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز کلکتہ سے کیا۔کلکتہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار ''اداکار'' میں ۱۹۳۱ء کے شمارہ میں ''سحر نغمہ'' کے عنوان سے افسانہ لکھا، اس کے بعد افسانہ نگاری کا سلسلہ چلتا اور افسانے مجموعوں مین تبدیل ہوتے رہے۔ان کے افسانوں کے تین مجموعے ہیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''الاؤ'' ہے جس میں دس افسانے شامل ہیں۔دوسرا مجموعہ ''نئے پرانے'' ہے جس میں تیرہ افسانے ہیں اور تیسرا مجموعہ ''چار چہرے'' ہے جس میں چار افسانے ہیں۔ان کے افسانوں میں ''آدھی کہانی''، ''گرو آیا''، ''دماغ کی فتح''، ''سوغات''، ''ایک سوال'' اور ''وہ آئیں گے'' ابتدائی دور کے افسانے ہیں۔''نئے پرانے''، ''یہاں سے وہاں تک''، ''ایک سفر''، ''عمل اور در''، ''غیر آسودہ''، ''خدا کی دین'' وغیرہ ان کی تحریر میں دور متوسط کے افسانے ہیں۔ان میں تیر ونشتر ملتے ہیں۔یہی وہ دور ہے جس نے انھیں بام عروج پر پہنچایا۔اس دور کے بعد کے افسانے ''غیرت''، ''کاغذ کی ناؤ''، ''دل کا کانٹا''، ''اسٹیشن پر''، ''کمزوری''، ''کل وہ مر گیا''، ''عجائب خانہ'' اور ''گیت ناچ اور موت'' وغیرہ افسانوں ان کے فن کی معراج ہیں۔یہ افسانے قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتے ہیں اور غور وفکر پر مجبور کر دیتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی نے بہار کے دیہاتوں میں بس رہی بے چین و بے بس زندگی کو پیش کیا۔وہاں کے کسانوں کی دور وغم سے پُر زندگی، سیلاب اور زلزلے کی تباہی اور معاشی استحصال، ان کے ابتدائی افسانوں کا محور ہیں۔ان کے افسانوں میں یہ بات صاف طور پر نظر آتی ہے کہ وہ منشی پریم چند کے افسانوں سے متاثر ہوئے ہیں۔انھیں کی طرح سہیل نے بھی دیہات اور شہر دونوں کے روز مرہ کے واقعات کو افسانوں کا موضوع بنایا۔کسانوں، مزدوروں اور متوسط و پست طبقے کی نمائندگی بھی اپنے افسانوں میں کی۔ان کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ انھوں نے فطرت یا حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔سہیل عظیم آبادی کے افسانے اپنے موضوع اور پیشکش دونوں اعتبار سے سادہ ہیں۔اس سادگی میں ایسی پرکاری اور رنگینی ہے کہ فطری حسن کا مزہ آتا ہے۔افسانہ ''چوکیدار'' سہیل صاحب کا لازوال افسانہ ہے۔اس میں گاؤں کے ایک غریب شخص رام لال کی کہانی ہے۔رام لال غریبی وافلاس اور معصومیت وانسانیت کا پتلا ہے ٹھیک اس کے برعکس افسانے کا دوسرا کردار ڈپٹی مجسٹریٹ صاحب سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار ہیں۔اس افسانے کے مطالعہ کے بعد یقینی طور پر زمیندار وسرمایہ دار طبقہ سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔افسانہ ''دوستی'' میں دیہات کی زندگی، یہاں کی معاشرت اور بلند اخلاق کی مکمل عکاسی موجود ہے۔افسانہ ''الاؤ'' میں بھی دیہی زندگی، وہاں کے مقامی لوگ اور غریب کسانوں پر ظلم وستم کی تصویریں صاف نظر آتی ہیں۔

سدرشن 1896ء میں سیالکوٹ، پنجاب میں پیدا ہوئے۔ان کے افسانے شہر سے دیہات تک کا سفر طے کرتے ہیں۔سماجی زندگی کی عکاسی ان کے یہاں بہت زیادہ ملتی ہے۔ان کردار زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔انھوں نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ان کی پہلی کہانی ''ہار جیت'' 1920ء میں شائع ہوئی۔ان کے دس افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ان مجموعوں میں ''کنج عافیت''، ''قدرت کے کھیل''، ''پارس''، ''چٹکیاں''، ''سولہ سنگھار''، ''آزمائش''، ''چندن''، ''سدا بہار''، ''تہذیب کے تازیانے'' اور ''بے گناہ مجرم'' شامل ہیں۔ان کا انتقال 1967ء میں دہلی میں ہوا۔

سدرشن کے افسانوں میں دیہی زندگی کے ساتھ ہی شہری زندگی کی بھی تصویر کشی ملتی ہے۔ان کے یہاں اونچے طبقے اور نچلے طبقے کا موازنہ دیکھنے کو ملتا ہے۔انھوں نے دیہی زندگی کے معاشرتی پہلو کو اپنا موضوع خاص بنایا۔ان کا مقصد دیہات کی معاشرتی زندگی کی مصوری کرنا ہے۔انھوں نے پریم چند کی تقلید بھی کی ہے۔اور اس میں نئے تجربات بھی کئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پریم چند سے منفرد نظر آتے ہیں۔افسانے ''مزدور''، ''مصور'' اور ''صدائے جگر خراش'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔افسانہ ''مزدور'' میں ایک ایسے غریب مزدور کی کہانی ہے

جو کاٹن کپڑے کی مِل میں کام کرتا ہے اور اسے گیارہ روپے چار آنے ماہوار تنخواہ ملتی ہے لیکن اس کا خاندان چار افراد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے وہ ضروریاتِ زندگی کو پورا نہیں کر پاتا۔ افسانہ ''مصور'' میں تو گجری نام کے کردار کو کروا چوتھ کا ورت کھولنے کے لئے کھانے کا ایک دانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ غریبی کا یہ المیہ حیات انسانی کے سامنے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

اعظم کریوی کے افسانوں کا محور بھی دیہات ہے۔ ان کے افسانوں میں سیاست بھی موجود ہے اور دیہات کے رومانی ماحول اور وہاں کے لوگوں کی معصوم اور سادہ رومانی فطرت بھی۔ اعظم کریوی کے افسانوں میں طرز معاشرت، پنچایتوں اور بازاروں میں گفتگو کے مناظر، باہمی تعلقات اور زمینداروں اور رعایا کے درمیان عدم مساوات، حکام اور ان کے عام لوگوں کا رعایا سے برابرتاؤ وغیرہ موضوعات ملتے ہیں۔ انھوں نے دیہات میں موجود فرسودہ رسم و رواج کی طرف نہ صرف توجہ دلائی ہے بلکہ ان کے خلاف آواز بھی اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

حیات اللہ انصاری کے افسانوں پر بھی پریم چند کے اثرات موجود ہیں۔ وہ کسی مخصوص ماحول میں خود کو محدود نہیں رکھتے۔ انھوں نے افسانے کو فکری نقطۂ نظر عطا کیا ہے۔ ان کے افسانوں پر سیاسی نظریات، رویوں اور گاندھی جی کے فلسفے کا اثر پایا جاتا ہے۔ حیات اللہ انصاری ترقی پسند تحریک کے اہم افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پریم چند کے بعد ان کی روایت کی کافی حد تک توسیع حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' کے کچھ افسانے ''انگارے'' کے افسانوں سے متاثر نظر آتے ہیں جن میں بے خوف حقیقت نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''آخری کوشش'' شاہکار افسانہ ہے۔ جس میں گہری معنویت، ٹھہراؤ اور شعور کی بالیدگی ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں فکر کا عنصر غالب ہے لیکن اس کے باوجود اس ان کے یہاں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ دراصل ان کے افسانے گہرے تجربے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے نفسیاتی مشاہدہ اور عمیق نگاہی نے ان کے افسانوں کا معیار بلند رکھا ہے۔

اُپندر ناتھ اشک پریم چند سے بہت متاثر ہوئے۔ مجموعہ ''ڈاچی'' کے افسانوں سے انھوں نے سیاسی موضوعات کی ابتدا کی اور اس کے بعد افسانوں میں انھوں نے نچلے، متوسط طبقے کی معاشرتی زندگی اور صنفی عدم مساوات کی بہت خوبصورت عکاسی کی ہے۔ عورتوں کی بے بسی اور ان کی سماجی نفسیات کا گہرا مطالعہ ہمیں ان کے افسانوں ''کونپل''، ''قفس''، ''چٹان'' اور ''چیتن کی ماں'' میں ملتا ہے۔ مزدور طبقے کے مصائب اور طبقاتی کشمکش پر لکھے ہوئے افسانوں میں ان کا خلوص اور درد نظر آتا ہے۔ وہ کہانی میں پلاٹ اور واقعات کی ترتیب کو بہت اہمیت دیتے ہیں نیز زندگی کے حقائق اور ان کی تفصیلات پر زور دیتے ہیں۔ اشک نے بھی اردو افسانہ نگاری کے مختلف ادوار کو دیکھا ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں کا کینوس وسیع ہے۔ جس میں دیہات اور شہری زندگی کے موضوعات اور مسائل شامل ہیں۔ وہ کسی تحریک یا نظریہ کے پابند نہیں۔ اشک کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر گہرائی سے توجہ صرف کرتے ہیں اور اس کی جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ بہت گہرائی سے کیا ہے۔

اختر اورینوی بھی ترقی پسند افسانہ نگاروں میں اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے زندگی کے پیچیدہ مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور نچلے طبقے کی معاشی مشکلات، جھگڑے اور مقدمے بازی، خاندانی کشاکش، زمیندار اور کاشتکار، قلی اور نان بائی رکشہ کھینچنے والے اور بھٹی جھونکنے والے سبھی کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانے ''اندھی نگری''، ''جینے کا سہارا''، ''بیل گاڑی'' اور ''بوڑھی ماما'' انھیں موضوعات کے کا احاطہ کرتے ہیں۔ ''یہ دنیا'' اور ''پس منظر'' جیسے افسانوں میں انھوں نے سماج کی تلخ حقیقتوں کو ہلکے پھلکے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کا مجموعہ ''کلیاں اور کانٹے'' فنی اعتبار سے بہت گہری معنویت رکھتا ہے۔ افسانہ ''کلیاں اور کانٹے'' میں بہت سے کرداروں کا نفسیاتی مشاہدہ پیش کیا گیا ہے جس کی وجہ سے زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ افسانہ اردو کے قابل قدر چند بہترین

افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں بھی پریم چند کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ان کے افسانے ''تین عورتیں'' اور ''معمار'' انسانی زندگی میں انقلابی تبدیلی کی عمدہ مثالیں ہیں۔سماج کے متوسط طبقے کی مشکلات، غریبوں کے مسائل، معاشی زبوں حالی، ظلم وزیادتیوں کی کہانیاں ان کے افسانوں کے مخصوص موضوعات ہیں۔ان کے یہاں سیاسی موضوعات سے زیادہ پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے کرداروں کے ذہنوں میں گہرائی تک نہیں اترتے۔ان کے افسانوں میں ''زعفران کے پھول''، ''ٹڈی''، ''بارہ گھنٹے'' اور ''سردار جی'' اردو کے اہم افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ان کے فن پاروں میں مارکسیت بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے جن میں تحریک آزادی کی بھی آواز سنائی دیتی ہے۔غیر ملکی حکومت سے دشمنی، سماجی اور اقتصادی مساوات، انسانیت کا واضح تصور اور ہندوستانی عوام کے بیچ آپسی اتفاق ان کے نمایاں موضوعات رہے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے متوسط طبقے کی عام گھریلو زندگی کی الجھنوں، پریشانیوں اور آرزوؤں کا عکس پیش کیا ہے۔انسان کی نفسیاتی کمزوریاں افسانے ''زین العابدین''، ''لاجونتی''، ''کوکھ جلی'' اور ''گرہن'' میں ملتی ہے جن میں سماجی تضاد کی حقیقت نگاری موجود ہے۔بیدی کے افسانے زندگی کے تلخ حقائق پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ان میں بیزاری کا احساس نہیں ہوتا۔مثال کے طور پر ''گرم کوٹ''، ''دس منٹ بارش میں''، اور ''پھول'' جیسے افسانوں میں انسانی ہمدردی، محبت اور انسیت کا احساس ملتا ہے۔

ان کے علاوہ اختر انصاری، احمد علی، منٹو، عصمت، دیویندر ستیارتھی جیسے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی حقیقت پسندی کا عنصر غالب ہے۔ان افسانہ نگاروں کو پریم چند کے فن کی توسیع کہا جاسکتا ہے۔

16.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں ہم عہد پریم چند کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے واقف ہوئے۔

اس اکائی میں ہم نے پریم چند کے فن افسانہ نگاری کے بارے جانا۔

اس اکائی میں ہم نے پریم چند کے افسانوں کے موضوعات کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

اس اکائی میں ہم نے پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے فن پر تفصیلی گفتگو کی۔

اس اکائی میں ہم نے پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگاروں پر پریم چند کے اثرات کا مشاہدہ کیا۔

16.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی مطالعہ پیش کیجئے۔

2۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کی فنی خصوصیات بتائیے۔

3۔عہد پریم چند کے تناظر میں پریم چند کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیجئے۔

4۔کن افسانہ نگاروں پر پریم چند کے اثرات ملتے ہیں؟ مثالوں کے ساتھ وضاحت کیجئے۔

5۔ پریم چند کے متاخرین کے فن پر ان کے اثرات کی وضاحت کیجئے۔

16.8 سوالات کے جواب

جواب 1: وضوعاتی اعتبار سے منشی پریم چند کے افسانوں کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ جب ان پر داستانوں کا اثر تھا۔۲۔ جب وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے۔۳۔ جب انھوں نے انسانی نفسیات کا مطالعہ طبقاتی جبر کے حوالے سے کیا۔ پریم چند کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ پریم چند کے ہاں ہمیں دونوں قسم کے افسانے ملتے ہیں۔ایک طرف سماج کی سچی اور کھری تصویر میں جبکہ دوسری طرف تخیل کی رنگ آمیزی بھی۔

ان کی رومانیت پر وطن پرستی کا رنگ غالب ہے جس کا اظہار ان کی ابتدائی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ پریم چند محبت کا تصور رومانوی اثرات کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق کا اظہار کرنے سے کتراتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تصور محبت سماجی روایت سے منسلک ہے۔جس میں محبت کے کئی رنگ موجود ہیں۔جس میں حب الوطنی، کچلے ہوئے طبقات سے ہمدردی، مادی حقائق کی اہمیت کو تسلیم کرنا وغیرہ۔ وہ ماضی کے تسلسل میں حال کی پہچان کرنا چاہتے ہیں۔ان کے یہاں انقلاب اور رومان کا ایک ایسا امتزاج ہے جس کی بنیاد مثالیت، انسان دوستی اور معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ سابی رویوں پر بھی ہے۔

پریم چند کے کردار اکثر معاشرے کے ستائے ہوئے عام لوگ ہیں۔انھوں نے مظلوم لوگوں خصوصاً دیہاتوں میں جاگیرداروں اور مہاجنوں کے ظلم کے مارے ہوئے لوگوں کی کہانی بیان کی۔ان کے اندر آزادی کی تڑپ اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا اور ایک نئی دنیا تعمیر کی اور طبقات سے آزاد معاشرے کا وجود ان کا بنیادی نظریہ تھا۔وہ مثالیت اور حقیقت کے امتزاج سے اپنی افسانوی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں۔

جواب 2: فنی عظمت: پریم چند کے افسانوں میں نظریات کی پختگی اور ترویج کا دور بھی ہے- ان کے افسانوں کے موضوعات سیاسی زندگی سے متعلق ہیں لیکن فن اور معیار کے اعتبار سے پہلے کے مقابلے میں بہت بلند ہیں۔''سوز وطن'' کے افسانوں ک بعد پریم چند کے قلم سے حج اکبر، بوڑھی کاکی، دو بیل، نئی بیوی اور زادِراہ جیسے افسانے تخلیق ہوئے اور پھر ان کا فن بتدریج ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ''کفن'' جیسا افسانہ لکھ کر انھوں نے دنیائے ادب میں اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔''کفن'' کی کہانی دو ایسے انسانوں کی کہانی ہے جو بے حیائی اور ڈھٹائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ ننگے بھوکے اپنی کاہلی وسستی کی وجہ سے پورے گاؤں میں بدنام ہیں۔ بدھیا کے مرنے کے بعد اس کا شوہر مادھو اور اس کا سسر گھیسو اس کے کفن دفن کے لیے زمیندار سے پیسے مانگ کر لاتے ہیں اور پھر یہ سوچ کر کہ ''کفن تو لاش کے ساتھ جل جاتا ہے'' وہ پیسے شراب وکباب میں اڑا دیتے ہیں۔

اسلوب:۔آخری دور کے افسانوں میں پریم چند ایک عظیم افسانہ نگار دکھائی دیتے ہیں-اس دور کے افسانے مقامی ہونے کے باوجود آفاقی کہلانے کے مستحق قرار دیئے جاسکتے ہیں کیونکہ اب ان کے افسانوں میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہوگئی تھیں جو اچھے اور معیاری افسانوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں۔ان کی زبان بھی صاف ہوگئی تھی اور اندازِ بیان میں بھی دلکشی آ گئی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت جملے استعمال کرنے لگے تھے۔ سادگی وپرکاری، متانت وسنجیدگی ان کی تحریر کے جوہر تھے۔منظر کشی میں بھی انہیں کمال حاصل ہوگیا۔

تنوع:۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پریم چند نے اپنے افسانوں میں زندگی کے ہر دو پہلوؤں المیہ وطربیہ کو سمو دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ہر طبقے کے لوگ موجود ہیں۔ وہ روہیلوں، بندیلوں اور راجپوتوں کی جنگ جویانہ صفات اور جرات مندانہ اقدار کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ہندو مہاجنوں، ساہوکاروں، سیٹھوں اور زمینداروں کے ظلم وتشدد اور گھناؤنے کرداروں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں اور غریب کسانوں، مفلس کاشتکاروں اور نیچی ذات کے چماروں کی بے بسی اور بے کسی کی المناک داستانیں رقم کرتے ہیں۔ان کے یہاں رانی سارندھا جیسی جاں باز اور آن پر مٹنے والی رانیاں بھی ہیں اور کام چور وکاہل گھیسو اور مادھو جیسے المیہ کردار بھی ملتے ہیں۔

جواب 5: پریم چند کے افسانوں میں عام آدمی کے درد وغم، رہن سہن، سماجی تعلقات، معاشی کشمکش، مذہبی اور سماجی رسم ورواج کی پابندی تک واقعات اور حقائق کے پس پردہ قاری کی رسائی ہوئی۔اس کے علاوہ سماجی فلاح و بہبود کے ساتھ، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے پیرائے میں عوام کے ذہن تک رسائی حاصل کر کے بہت مقبول ہوئے۔ان کے افسانوں کا محور دیہات میں قیام پذیر لوگوں کی سیدھی سادی زندگی، ان کی سچائی، ایمانداری، بے ایمانی سے پہنچنے والے نقصانات، غربت کی مار، کاشتکاری میں خسارہ، زمینداروں کا ظلم، پولیس اور دوسرے سرکاری عملے کا عتاب اور کبھی قحط کا سامنا سبھی کچھ ہے۔اس کے علاوہ ہندو سماج کے رسم ورواج، عادات واطوار، عقائد اور سماج کے اصلاحی نظریے یہ سب ان کے افسانوں میں عام طور پر موجود ہیں۔پریم چند کے اثرات سے اردو میں اصلاحی افسانوں کی جو روایت پروان چڑھ رہی تھی اس سے سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ان فن کاروں نے اصلاحی نقطۂ نظر کو ادب میں وسعت دی اور افسانے میں حقیقت نگاری کو پیش پیش رکھا۔ان کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی، منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، حیات اللہ انصاری، دیویندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشک، احمد علی اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نے پریم چند کی روش اختیار کی اور ادب میں حقیقت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

16.9 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
خامہ فرسائی	تحریر کرنا، لکھنا	متاخرین	بعد میں آنے والے لوگ
محور	مرکز	مشاہدہ	عینی تجربہ
کاشتکار	کسان	کشاکش	الجھن
اقتصادی	مال سے منسوب	مساوات	برابری
معمار	عمارت بنانے والا	افراتفری	ہلچل
تنگدستی	غریبی	بتدریج	رفتہ رفتہ
فقدان	کمی، خاتمہ	ایثار	قربانی
عمیق	گہرا	فرسودہ	پرانا

16.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کے نمائندہ افسانے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1986ء

2۔ رادھا کرشن، پریم چند کے مختصر افسانے، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، نئی دہلی، 1985ء

3۔ اصغر علی انجینئر، پریم چند حیات اور فن، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، دہلی، 1981ء

4۔ پرکاش چندر گپتا، پریم چند، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1992ء

5۔ ڈاکٹر جعفر رضا، پریم چند کہانی کار رہنما، لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، 1969ء

6۔ پروفیسر علی احمد فاطمی، پریم چند نئے تناظر میں، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 2006ء

7۔ پریم چند، باکمالوں کے درشن، لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، 1932ء
8۔ سید محمد عصیم، پریم چند کا فنی وفکری مطالعہ، ترکمان گیٹ، دہلی، 1984ء
9۔ پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، 2017ء
10۔ منشی پریم چند، واردات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2012ء
11۔ عظیم الشان صدیقی، افسانہ نگار پریم چند: تنقیدی وسماجی محاکمہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2006ء